ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ

سعید احمد اکبرآبادی

ندوۃ المصنفین کی دینی اور اجتماعی کتابیں

اسلام کا اقتصادی نظام

وقت کی ایک اہم انقلاب انگیز کتاب جس میں اسلام کے معاشی نظام کا جامع نقشہ پیش کیا گیا ہے، چوتھا ایڈیشن۔ قیمت ؏، مجلد ؏

اسلام کا نظامِ مساجد

نظام مساجد کے تمام گوشوں پر دلپذیر بحث اور اس کی منفعتوں اور برکتوں کی تفصیل۔

قیمت ؏ مجلد ؏

اسلام میں غلامی کی حقیقت

مسئلہ غلامی کی تحقیق پر ندوۃ المصنفین کی معرکۃ الآرا کتاب جس میں انفرادی اور اجتماعی غلامی کے ایک ایک پہلو پر اسلام کا نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے، قیمت ؏، مجلد ؏

قرآن اور تعمیرِ سیرت

ایک عظیم الشان اصلاحی کتاب

قرآن مجید کی تعلیم و تربیت کا انسانی سیرت کی تعمیر میں کیا دخل ہے اور اس تعلیم کے ذریعہ سے اس سیرت و کردار کا کس طرح ظہور ہوتا ہے یہ مبترک کتاب خاص اسی موضوع پر لکھی گئی ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ مسلمان عام طور پر احساس کمتری کے اندھیروں میں پھنسے ہوئے ہیں یہ گراں مایہ تالیف ان کے روحانی رشتے کو مضبوط کرنے میں چراغِ راہ کا کام دے گی۔

قیمت ؏، مجلد ؏

ارشاداتِ نبوی کا لاثانی ذخیرہ

اردو زبان میں

ترجمان السنہ:۔ ہماری زبان میں حدیثوں کی ایسی جامع اور مستند کتاب آج تک وجود میں نہیں آئی تھی اس میں عربی متن مع اعراب بھی ہے اور صاف و سلیس ترجمہ بھی ساتھ ہی محققانہ تشریحی نوٹ بھی ہیں۔ ترتیب میں کتاب التوحید کو پہلے رکھا گیا ہے اور پھر اسی مناسبت سے پوری کتاب کی ترتیب قائم کی گئی ہے پہلی جلد کے شروع میں کئی سو صفحات کا ایک مقدمہ ہے

جلد اول قیمت ؏ مجلد ؏

جلد دوم قیمت ؏ مجلد ؏

فہم قرآن قرآن مجید کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں کلامِ ربانی کا قطعی منشا معلوم کرنے کے لئے آنحضرتؐ کے ارشادات و اقوال کا معلوم کرنا کیوں ضروری ہے اس کتاب کا اصل موضوع یہی ہے۔ ایک بہترین تبلیغی اور اصلاحی کتاب ہے ؏

وحی الٰہی مسئلہ وحی کے تمام گوشوں پر دلپذیر بحث، وحی کی حقیقت اور اس کی صداقت سمجھنے کے لئے لاجواب کتاب۔

قیمت ؏ مجلد ؏

مینجر ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

برہان

جلد نمبر ۳۲ شمارہ نمبر ۱

جنوری ۱۹۵۴ء مطابق جمادی الاوّل ۱۳۷۳ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

افسوس ہے پچھلے دنوں ہماری گذشتہ قومی زندگی کا ایک اور ستون گر گیا یعنی مسٹر عبداللہ یوسف علی نے لندن میں وفات پائی۔ مرحوم انگریزی زبان کے نامور انشاپرداز۔ مشہور ماہر تعلیم اور متعدد بلند پایہ کتابوں کے نامور مصنف تھے۔ انڈین سول سروس سے الگ ہونے کے بعد وہ دو مرتبہ اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل ہوئے اور یہیں ان کے دل و دماغ میں یکایک ایک عجیب مذہبی اور دینی انقلاب ہوا۔ جس کے باعث انہوں نے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔ ترجمہ کی زبان کس قدر اعلیٰ اور بلند پایہ ہے اس کی داد وہی دیں گے جن کو انگریزی زبان و ادب کا ذوق ہے اور جو مختلف اسالیبِ ادا کی باریکیوں سے واقف ہیں۔ ترجمہ کے علاوہ جگہ جگہ تفسیری نوٹ بھی بڑے فاضلانہ اور عالمانہ ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ چونکہ مرحوم نے ترجمہ کے وقت حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کے اردو ترجمہ قرآن کو خاص طور پر پیش نظر رکھا تھا اس بنا پر اب تک انگریزی میں جتنے بھی تراجم شائع ہو چکے ہیں صحتِ عقائد کے لحاظ سے صرف مرحوم کا ہی ایک ترجمہ ان سب میں ایسا ہے جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ مرحوم کو در حقیقت قرآن مجید کے ساتھ عشق سا ہو گیا تھا اور اسی کا اثر تھا کہ وہ اسی زمانہ میں حرمین شریفین کی زیارت اور حج بیت اللہ کی سعادت و شرف سے بہرہ یاب ہوئے۔ واپسی پر جب کبھی وہ سر پہ عقال اور بدن پر جبہ و عبا کے ساتھ نظر آتے تھے تو بڑے بھلے لگتے تھے۔ اسلامیہ کالج کے طلبا کو نماز کی اور دیگر شعائرِ اسلامی کی پابندی و احترام کی بڑی تاکید کرتے رہتے تھے۔ جمعہ کی نماز کالج کی مسجد میں کبھی کبھی خود بھی پڑھاتے تھے۔ ورنہ نماز سے پہلے یا نماز کے بعد وعظ تو اکثر ہی کہتے تھے۔ عادات و اخلاق کے لحاظ سے بڑے خلیق و ملنسار۔ مگر حد درجہ با حمیت و خود دار اور ہمدرد و غم گسار تھے۔ ضابطہ پسندی اور اصول پروری ان کی فطرت تھی۔ حق تعالیٰ مغفرت و بخشش کی نعمتوں سے نوازے اور ان کے مراتب بلند کرے۔

گزشتہ ماہ دسمبر کی ۲۶، ۲۷ تاریخ کو مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں ایک اہم علمی اجتماع ندوۃ العلماء لکھنؤ میں منعقد ہوا جو شرکاء کی تعداد کے اعتبار سے اگرچہ آج کل کے ہنگامی جلسوں کی طرح نہ تھا تاہم اس حیثیت سے وہ بڑا اہم اجتماع تھا کہ نامور علماء فضلا اور مشاہیر کے علاوہ متعدد بلند پایہ اسلامی اداروں کے نمائندوں نے اس میں شرکت کی اور مقالات یا تقاریر کے ذریعہ ہندوپاک کے قافلہ سالار علم وفضل کو اس کے سفر آخرت اختیار کر جانے پر عقیدت وارادت کا خراج پیش کیا۔ ندوۃ المصنفین کی طرف سے مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی ناظم ادارہ نے شرکت کی اور "سید صاحب کی سیرت کے بعض گوشے اور میرے تاثرات" کے زیر عنوان ۴۵۔ ہم منٹ تقریر بھی کی۔ موصوف نے بعض احباب کے اصرار پر اس تقریر کو قلمبند کر دیا ہے آئندہ اشاعت میں اسے قارئین "برہان" کی نذر کیا جاسکے گا۔

لیکن صرف اس ایک اجتماع سے مولانا کا حق ادا نہیں ہوتا، ضرورت ہے کہ مولانا کی ایک مستقل یادگار قایم کی جائے یہ یادگار کس قسم کی ہو اور اسے کیوں کر قایم کیا جائے یہ مشورہ کے بعد طے ہو سکتا ہے۔

"برہان" کے لئے یہ بڑی خوشی اور فخر کی بات ہے کہ گذشتہ چند اشاعتوں میں شادی کے موقع پر لڑکے کے لئے لڑکی کے والدین سے ایک معینہ رقم کے طلب کرنے کی رسم بد کے خلاف جو کچھ لکھا گیا تھا اس کا بعض حلقوں میں خاطر خواہ اثر ہوا ہے چنانچہ اخبارات سے معلوم ہوا ہے کہ ضلع مونگیر بہار کے ایک مقام میں خاص اس رسم بد کو ختم کرنے کے لئے مسلمانوں نے ایک انجمن قایم کی ہے اور چونکہ اس رسم کو اس نواح کی زبان میں تلک کہتے ہیں اس لئے اس انجمن کا نام انجمن تلک شکن رکھا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اسی طرح کی انجمنیں اور دوسرے مقامات پر بھی جہاں اس رسم کا وجود پایا جاتا ہے قایم کی جائیں اور سرگرمی وجوش کے ساتھ اس کے کام کو شروع کیا جائے۔

اس رسم کو ختم کرنے کے لئے ایک بل ہمارے ملک کی پارلیمنٹ میں بھی پیش ہو چکا ہے۔

اس موقع پر متعدد مرد و عورت ممبروں نے اپنی تقریروں میں جو خیالات ظاہر کئے اور اس رسم کی جو قباحتیں گنائیں وہ سب وہی ہیں جو "برہان" میں بیان کی جا چکی ہیں۔ ہندوؤں میں مارواڑیوں کا طبقہ سب سے زیادہ متمول اور خوش حال طبقہ ہے۔ لیکن گذشتہ دسمبر کے آخری ہفتہ میں آل انڈیا مارواڑی ایسوسی ایشن کا بڑا شاندار جلسہ کلکتہ میں ہوا تو اس میں یہی تلک اور جہیز کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ اور آخر متعدد پُرجوش تقریروں کے بعد اس رسم کی سخت مذمت اور اس کے قطعی انسداد کی ایک تجویز متفقہ طور پر منظور کی گئی۔

برہان کے گذشتہ دو نمبروں میں "ہمارا مسئلہ تعلیم" کے زیر عنوان جو خیالات ظاہر کئے گئے تھے اس کے بعد دہلی میں ڈاکٹر رادھا کرشن، کٹک میں سر فضل علی۔ کلکتہ میں ڈاکٹر کاٹجو نے یونیورسٹی کنووکیشن کے موقع پر اور خواجہ غلام السیدین نے آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے اٹھائیسویں سالانہ جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے کلکتہ میں جو تقریریں کی ہیں ان کو ملاحظہ فرمائیے تو معلوم ہوتا ہے

"چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری"

لیکن وہ بھی متفرق اور جزئی طریقہ پر یعنی کسی نے کوئی جز لے لیا۔ اور کسی نے کوئی لیکن بحیثیت مجموعی جو جامعیت گہرائی اور دقتِ نظر آپ کو برہان کے مضمون میں ملے گی وہ مذکورۂ بالا کسی تقریر میں کہیں نظر نہ آئے گی والحمدللہ علیٰ ذالک

کس لئے؟

(۱۰)

(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی)

کس لئے؟ کے مندرجہ بالا عنوان کے تحت اب تک جو کچھ بھی عرض کیا گیا ہے اگرچہ وہی کافی طویل ہو چکا ہے لیکن سچی بات یہی ہے کہ "اسلام کا عملی نظام" جس پر بحث مقصود ہے۔ اس کا موقعہ اس وقت تک اس لئے نہ آسکا۔ کہ بیسیوں غلط فہمیوں کا ازالہ اصل مدعا پیش کرنے سے پہلے ناگزیر اور ضروری تھا۔ خصوصاً خدا کی ایک زمین، اور خاک کے اس ایک تودے کو، مختلف اغراض و مقاصد کے زیر اثر لوگ تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے جو بانٹتے چلے آئے ہیں، اور معمولی معمولی امتیازی وجوہ کو اہم بنا بنا کر گھوڑوں، گدھوں، کوّوں اور چیلوں کی نسل میں نہیں بلکہ آدم و حوا کے بچوں کے درمیان اختلافات کی ناقابلِ عبور خلیجیں جو حائل کر دی گئی ہیں کبھی چہروں کے رنگ روپ کو سامنے رکھ کر گوروں، کالوں، پیلوں کے درمیان لوگ بانٹے گئے یا مافی الضمیر سے آگاہ کرنے کے لئے بیان کی جو نعمت بنی آدم کو بخشی گئی ہے اور مختلف اسباب و مؤثرات کے تحت بیانی قوت کے اظہار کے لئے مختلف الفاظ و محاورات جو لوگوں میں چل پڑے، یعنی زبانوں کے اختلاف کو بنیاد بنا کر ایک ہی نسل کے افراد کو مختلف ٹولیوں میں تقسیم کرنے کی کوشش جو کی گئی ہے، یا آباء و اجداد کے نسبی شجروں کو سامنے رکھ کر مختلف خاندانوں کی طرف منسوب کر کر کے باور کرایا گیا کہ زید کے خاندانی سلسلے سے تعلق رکھنے والے عمرو کے خانوادے میں پیدا ہونے والوں سے جدا اور قطعاً جدا ہیں۔ الغرض وطن، رنگ، زبان، نسل وغیرہ کے اختلافات سے اختلافات کے جو طلسم بنی نوع انسانی کے گھرانوں میں کھڑے کر دیے گئے ہیں اور کیسے طلسم؟ کہ ان کے سحر سے مسحور ہو کر یہی نہیں کہ باہم اپنے آپ کو لوگ ایک دوسرے سے الگ اور جدا سمجھنے لگے۔ بلکہ بغض اور عداوت کی آگ بھی ان ہی بنیادوں پر بھڑکائی گئی اور کیسی آگ؟ کہ بجھانے کی ہر کوشش اس سلسلہ میں صرف یہی نہیں کہ ناکام نہیں ہو رہی ہے بلکہ اس آگ کو اور زیادہ تیز کر کے بھڑکاتی ہی چلی آئی ہے۔ پہلے بھی یہی ہوتا رہا ہے اور آج بھی یہی ہو رہا ہے۔ کچھ سمجھ

میں نہیں آتا کہ آخر دنیا ان سطحی قصوں کے چکانے میں کب کامیاب ہوگی۔ کامیاب ہوگی بھی یا نہیں۔

سطحی اس لئے کہہ رہا ہوں کہ بغض و عداوت جنگ و جدال لڑائی جھگڑوں میں عموماً یہی دیکھا جاتا ہے کہ قصد و اختیار کو اس میں کتنا دخل ہے بے جانے کسی کے ہاتھ سے آپ کو لگ جاتی ہے تو آپ کے دل میں یہی فیصلہ ہوتا ہے، کہ جس سے آپ کو چوٹ لگی ہے وہ قصور وار نہیں ہے اور خود وہ بھی جس کے ہاتھ سے آپ کو اذیت پہنچی، یہی سمجھتا ہے کہ میں مجرم نہیں ہوں۔

لیکن قوموں اور امتوں کی تقسیم و تجزی کی یہ ساری بنیادیں، جن کا میں نے ذکر کیا، سوچئے تو سہی کہ ان کی نوعیت کیا ہے؟ چہروں کے کالے، گورے، پیلے ہونے میں، کیا ان غریبوں کے قصد اور اختیار کو کچھ بھی دخل ہے جن کی وجہ سے ایک دوسرے سے وہ جدا کئے گئے ہیں۔

یا نسلوں کا اختلاف یعنی بجائے زید کے جو عمرو کے خاندان میں پیدا ہوئے ہیں کیا ان کی یہ پیدائش اختیاری ہے، اسی طرح زمین کے مختلف حصوں میں جو لوگ آباد ہو گئے اور ان کے توالد و تناسل کا سلسلہ ان ہی علاقوں میں شروع ہوا اس میں ان پیدا ہونے والوں کا بھلا کیا قصور اور سچ تو یہ ہے کہ مٹی کا یہ سمٹا ہوا ڈھیر ہم جسے زمین کہتے ہیں، ایک گول مٹول واحد بسیط کرہ ہے۔ اس کے جن حصوں کو ہم نے مختلف ناموں سے موسوم کر رکھا ہے، کسی حصہ کو ایشیا کسی کو یورپ کسی کو افریقہ یا امریکہ جو ہم کہتے ہیں تو بجز فرضی حدود کے آپ ہی سوچئے، ان ناموں کی بنیاد کیا کسی حقیقت اور واقعہ پر قائم ہے؟ ہر تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر پہاڑ دریا، ندیاں، جنگل زمین کے اس کرے پر پائے جاتے ہیں یہ یا اسی قسم کی چیزوں میں سے کسی کے متعلق یہ فرض کر لینا کہ وہاں سے دوسرا ملک شروع ہو جاتا ہے، ذہن کی ایک فرضی اور اختراعی کارروائی کے سوا اور بھی کچھ ہے۔

اس سے زیادہ احمق کون ہوگا جو جغرافیائی اطلسوں کے نشانات کو زمین کی سطح پر تلاش کرے گا۔

مگر یہی ایک فرضی بات جس نے ایک ملک کے لوگوں کو دوسرے ملک کے باشندوں سے جدا کر رکھا ہے اس کا نتیجہ کیا ہے؟

بین الاقوامی کشیدگیوں کے زہر کا کتنا بڑا ذخیرہ صرف اسی ایک ذہنی مفروضہ میں پوشیدہ ہے، لڑنے والے گویا اس پر لڑ رہے ہیں کہ تیرا مکان فلاں ندی کے شمالی ساحل پر چونکہ واقع ہے اس لئے جنوبی ساحل میں

رہنے والے ان سے راضی نہیں ہو سکتے۔ میں تو حیران ہو جاتا ہوں جب بود و باش کے علاقوں کی بنیاد پر دیکھتا ہوں کہ آگ لگانے والے لوگوں کو اکسا رہے ہیں۔ آخر یہ قصہ ذرا سوچئے تو سہی کسی نقطہ پر ختم بھی ہو سکتا ہے مسکن و مکان کی ان تقسیموں کا حال تو یہ ہے، کہ ایک ایک ملک مختلف صوبوں پر، اور ہر صوبہ مختلف اضلاع پر، ہر ضلع مختلف پرگنوں پر، ہر پرگنہ مختلف دیہاتوں اور قصبوں پر، ہر دیہات اور قصبہ، مختلف ٹولوں، اور محلوں پر بٹا ہوا ہے، جب لڑائی کی بنیاد مکانی اور سکونتی اختلاف ہی پر قائم کر دی گئی ہے تو ملکوں والی جنگ کی آگ اگر محلوں اور ٹولوں کو بھی اپنے احاطہ میں گھیر لے، بلکہ ہر محلہ اور ہر ٹولہ میں رہنے والے ظاہر ہے کہ الگ الگ مکانوں اور گھروں میں رہتے ہیں، بلکہ ایک ہی گھر کے رہنے والے گھر کے مختلف حصوں ہی میں سوتے اٹھتے بیٹھتے ہیں، لڑنے والے چاہیں گے تو اس لڑائی کو کھینچ کر خوابگاہوں، اور مدفنوں کے اختلاف تک لا کر بھی پہنچا سکتے ہیں مکانی اختلاف کے یہ نتائج بالکل فطرتی اور منطقی نتائج ہیں۔

اور وطنی اختلاف ہی کا یہ حال نہیں ہے، زبانوں کا اختلاف بھی اگر غور کیا جائے تو فرضی اصطلاحات، کے اختلاف کے سوا اس کی تہ میں بھی آپ کو کوئی واقعہ نظر نہ آئے گا یانی ایک سیال، صاف، شفاف رقیق بہنے والے مادہ کا نام ہے، یقیناً فرض کرنے والوں ہی نے اس کی تعبیر کے لئے پانی جل، اب، ماء، واٹر وغیرہ الفاظ فرض کر لئے ہیں، پھر زبانوں کی بنیاد پر لڑنے والے فرضی اصطلاحوں پر نہیں لڑ رہے ہیں، تو خود ان کو سوچنا چاہئے کہ اس کے سوا اور کیا کر رہے ہیں؟

پھر ایک ہی زبان اور بولی میں لب و لہجہ کی وجہ سے بھی عموماً اختلافات رونما ہوتے ہیں اور دیکھا جاتا ہے کہ باہم ایک دوسرے کا مضحکہ ان اختلافات کی وجہ سے بھی اڑاتے ہیں غور کرنے کی بات ہے کہ آخر یہ جنگ بھی بڑھتے ہوئے کہاں تک پہنچ سکتی ہے؟

چہروں کے رنگ و روغن کے اختلافات پر غور کیجئے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ دو حقیقی بھائی بھی شکل و صورت میں ایک دوسرے سے عموماً مختلف ہوتے ہیں۔ نسلوں میں بھی میں پوچھتا ہوں کہ ایک ہی دادا کی اولاد بھی ایک دوسرے سے اسی مقدمہ کو پیش کر کے کہ دادا ہم سب کے ایک سہی، لیکن جو ہمارا باپ ہے، چونکہ وہی تمہارا باپ نہیں ہے، اس لئے ہم دونوں دو مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والے ہیں، تو نسلی اختلاف کے ماننے والوں

کے نزدیک یہ دعوی مستحقِ توجہ کیوں نہیں؟ آخر اس راہ میں حد بندی کی منطقی شکل کیا ہے، یعنی کہاں سے اباو اجداد کے اختلاف کے قصہ میں کتنی پشتوں تک نسلی اختلاف کا اعتبار کیا جائے گا۔ اور کہاں سے سمجھا جائے گا کہ لوگ ایک ہی نسل کے ہیں۔

بہر حال وطن اور زبان کا اختلاف جس کی بنیاد خود تراشیدہ وہمی حدود یا مفروضہ اصطلاحات پر قایم ہے، یا رنگ و نسل کا اختلاف جس میں ان بے چاروں کے مقصد اور ارادہ کو کسی قسم کا کوئی دخل نہیں ہوتا، جن سے اختلاف کیا جاتا ہے، ان اختلافات میں قطع نظر اس پہلو کے کہ ان کو بنیاد بنا کر انسانیت کی تقسیم کسی خاص نقطہ پر پہنچ کر ختم نہیں ہوجاتی، بلکہ تقسیم کے بعد تقسیم، اور بٹوارے کے بعد بٹوارے کے خطرات مسلسل سر اٹھانے لگتے ہیں، سب سے بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ ان اختلافات کو ابھارنے کے بعد انسانیت کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو کوئی متحد کرنا چاہے بھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس اختلاف کے بعد اتحاد کی راہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی۔ آخر میں پوچھتا ہوں کہ وطن کی بنیاد پر چین کے باشندے مثلاً جاپان والوں سے جب جدا ہو چکے ہیں تو پھر ان کے ملانے کی شکل یہی تو ہو سکتی ہے کہ یا چین کو جاپان بنا دیا جائے یا جاپان چین میں مدغم ہو جائے لیکن دونوں ملکوں کی زمینوں کے تداخل اور باہمی انجذاب کی صورت ہی کیا ہو سکتی ہے، اسی طرح کالوں کو گوروں سے ملانے کے لئے کوئی چہرے کے رنگ اور جلد کو کیا بدل سکتا ہے، یہی حال نسل کا ہے جو مثلاً زید کی نسل میں پیدا ہو چکے ہیں، کیا صورت ہے کہ ان کو عمرو کی نسل میں شریک کر دیا جائے؟ زیادہ سے زیادہ عقلی طور پر کچھ تبدل و تغیر کے قبول کرنے کا امکان اگر ہے تو وہ زبانوں اور بولیوں کا مسئلہ ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ مختلف زبانوں اور بولیوں کو مٹا کر یہ زور و جبر کسی ایک ہی زبان یا بولی کے بولنے پر لوگوں کو مجبور کریں۔ عقل تو اس گنجائش کو پاتی ہے لیکن عملاً یہ ممکن بھی ہے یا نہیں۔ تجربہ ہی آپ کو اس کا جواب دے گا۔ اور سچ پوچھئے تو سارے اختلافات جو بنی آدم میں پیدا کئے گئے ہیں۔ واقع میں ان کی ابتدا کسی اندرونی اختلاف ہی سے ہوئی، پہلے دلوں میں کہئے، یا فکری و ذہنی رجحانات میں فرق پیدا ہوا، پھر خاص فکر و نظر رکھنے والوں نے عوام کو اپنے ارد گرد جمع کرنے کے لئے، کہیں تو نسل کا، کہیں وطن کا، کہیں رنگ کا، کہیں زبان کے شاخسانے نکالے۔ ان قصوں کو اہمیت دی گئی۔ تا آنکہ انسانوں کی ایک ٹکڑی دوسری ٹکڑیوں سے اپنے آپ کو ان ہی وجوہ سے الگ سمجھنے لگی، اور کیسی علیحدگی؟ گویا وہی نسبت پیدا ہو گئی، جو جانوروں، پرندوں، درندوں سے انسانی نسل رکھتی ہے، بلکہ قومی عداوتوں اور رقابتوں کے ان قصوں نے اس سے بھی زیادہ ہولناک قالب اختیار

کر لیا، جس کا تماشا تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے دنیا کرتی چلی آرہی ہے اور آج تک ان ہی موثرات کے زیر اثر آدم کی اولاد زندگی گذار رہی ہے۔

بے شمار اور ان گنت ٹولیاں ان تقسیموں کی وجہ سے بنی ہی ہوئی تھیں، پھر ان ہی کے ساتھ فکری و ذہنی اختلافات کے مسائل بھی پیدا ہوئے، جن میں ایک طویل افسانہ تاریخ میں "مذہب" اور "دین" کے اختلافات کی بنیاد پر بھی مرتب ہوا،

ان ہی باتوں کا نتیجہ ہے، کہ "انسانی زندگی کے عملی نظام" کے متعلق یہ غلط فہمی پھیل گئی، کہ ان کا نہ کوئی احاطہ ہی کر سکتا ہے اور نہ کوئی اپنی گرفت میں آئین و دستور کے ان قصوں کو لا سکتا ہے جو اب تک بنی آدم میں نافذ اور جاری ہو چکے ہیں۔

اور یہ واقعہ ہے کہ قرآن کی روشنی اگر میرے سامنے نہ ہوتی تو "اسلامی نظام زندگی" کو موضوع بنا کر میں نے جو قلم اٹھایا ہے یہ مسئلہ میرے لئے کافی دشوار ہو جاتا، گویا میرا علمی فرض تھا کہ دنیا جہان کے ان سارے "عملی نظام ناموں" کی پہلے ایک فہرست بناتا، جو مختلف اقوام و امم میں اب تک پائے گئے ہیں، یا اس وقت پائے جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد ان کے ہر ہر باب اور ہر باب کے ہر دفعہ سے "اسلام کے پیش کردہ عملی نظام" کے قوانین و مسائل سے مقابلہ کرتا،

مگر جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، قرآن کا یہ خدائی اعلان

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً	واقعہ یہ ہے کہ تمہارا یہ گروہ (انسانوں کا) ایک ہی
وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ	گروہ ہے اور میں ہوں تمہارا آقا، تو تم مجھی کو اپنا بنا لو

اس نے انسانیت کی ساری بیرونی و اندرونی تقسیموں کو ختم کر دیا۔ اختلافات کی بنیاد جن چیزوں پر قائم تھی، بجائے اختلاف کے ان کے استعمال کے دوسرے طریقوں کی طرف اسی کتاب میں توجہ دلائی گئی ہے، مثلاً نسلی و قبائلی اختلافات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ

جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا	اقوام و قبائل ہم نے (اختلاف کے لئے نہیں) بلکہ
(الحجرات)	باہم ایک دوسرے کے تعارف کے لئے بنایا،

جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ نسبی شجروں کو دیکھ کر یہ جانا جا سکتا ہے کہ مختلف خاندان کہاں پر جا کر ملتے ہیں، اس طریقہ سے اس میں ایک قبیلہ کا رشتہ دوسرے قبیلہ سے معلوم ہوتا ہے، جو تعارف اور باہمی شناسائی کا ذریعہ بن سکتا ہے،

اسی طرح زبانوں اور رنگ روپ کے اختلافات کا ذکر کر کے ارشاد ہوا ہے

وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ ۚ — تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگ روپ کا اختلاف

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالِمِينَ (الروم) — اس میں نشانیاں ہیں سارے جہانوں کے لئے۔

اور کوئی شبہ نہیں کہ بولیوں اور زبانوں کا اختلاف جس کی ابتدا، درحقیقت لب و لہجہ کے اختلاف سے ہوئی ہے بڑھتے ہوئے وہی اختلاف زبانوں کے اختلاف تک پہونچ جاتا ہے یہ ایسی صورت حال ہے جو آدمی کو حیرت میں ڈالتی ہے تکلم یعنی بولنے کے سارے آلات زبان ہونٹھ تالو حلق اور ان کے رگ پٹھے سب ہی میں مشترک ہوتے ہیں جو کچھ ایک آدمی کے منہ میں ہوتا ہے وہی دوسر کے منہ میں، مگر با ایں ہمہ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ دو ماں جائی بھائیوں کی آواز میں فرق ہوتا ہے اور کافی فرق ہوتا ہے، اور یہی فرق وسیع ہو کر بولیوں کے اختلاف تک ترقی کر کے پہونچ گیا ہے، وحدت میں کثرت کا یہ تماشا جیسے حیرت انگیز ہے، یہی حال چہروں کے رنگ روپ کا بھی ہے اس باب میں دو بھائیوں میں بھی کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے اور یہی تفاوت ہے جس نے بالآخر گوری، کالی، پیلی قوموں کے قصے کو پیدا کر دیا ہے، الغرض اختلافات کی ان دونوں شکلوں (یعنی زبان اور رنگ) دونوں ہی کی کثرت میں کسی قاہرہ ارادہ و اختیار کی وحدت کی یافت ان کے استعمال کا صحیح قرآنی طریقہ ہے،

قرآن کے ان ہی اشاروں کی وہ تفصیلات ہیں جن کا تذکرہ مختلف طریقہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔ خصوصاً حجۃ الوداع کے آخری وداعی خطبہ میں جن مہمات کا تذکرہ فرمایا گیا تھا ان ہی میں ایک مسئلہ یہ بھی تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

یا ایھا الناس الا ان ربکم واحد — لوگو! تمہارا مالک پروردگار ایک ہے اور تمہارا باپ بھی

الا ان اباکم واحد لا فضل لعربی — ایک ہی تھا، کسی قسم کی کوئی برتری عرب کے باشندے

علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاسود علی الاحمر ولا لاحمر علی اسود (در منثور جلد ۹ بحوالہ بیہقی)

کو ان لوگوں پر نہیں ہے جو عجم (یعنی غیر عربی علاقوں) کے باشندے ہیں اور نہ عجم والوں کو عرب والوں پر نہ کسی کالے کو سرخ رنگ والوں پر اور نہ سرخ رنگ والوں کو کالے رنگ والے پر۔

دوسری روایت میں اسی سلسلہ کے یہ الفاظ بھی پائے جاتے ہیں کہ

الناس کلھم بنو آدم و آدم من تراب لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی ابیض ولا لابیض علی الاحمر

آدمی سب کے سب آدم ہی کی اولاد ہیں کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر اور کسی سرخ رنگ والے کو گورے پر، اور گورے کو سرخ رنگ والوں پر کسی قسم کی کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔

خلاصہ یہی ہے، تقسیم کی بیرونی بنیادوں رنگ، نسل، زبان و وطن کے قصوں کو بھی ختم کر دیا گیا اور فکری و ذہنی اختلافات کی جو صورتیں مذاہب و ادیان میں پائی جاتی تھیں قرآنی اطلاع

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ

اللہ کے حضور میں الدین صرف الاسلام ہے

کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ کسی خاص قرن یا دور کی حد تک قرآن کے اس اطلاقی بیان کو محدود کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے بلکہ صاف اور کھلا ہوا مطلب اس کا یہی ہے کہ اول سے آخر تک ایک ہی دین خدا کے حضور سے بنی آدم کو عطا کیا گیا، اور وہ زندگی کا "اسلامی نظام" ہے اس طریقہ سے مذاہب و ادیان کے اختلافات بھی وحدت کا قالب اختیار کر لیتے ہیں مذاہب اور ادیان کے دائرے سے ہٹنے کے بعد خود ساختہ پروگراموں کے متعلق بتا چکا ہوں کہ دیکھنے میں بظاہر وہ جتنے زیادہ بھی نظر آتے ہوں لیکن تجزیہ و تحلیل کے بعد سب کے سب مادیت یا روحانیت ہی کے نیچے درج ہو جاتے ہیں قرآن کے حوالہ سے گذر چکا کہ الاسلام کے مقابلہ میں عملی زندگی کے ان دونوں طریقوں کے متعلق یہ اعلان اس کتاب میں کیا گیا ہے کہ خدا کی طرف سے ان کا مطالبہ کبھی کسی زمانہ میں کسی قوم سے نہیں کیا گیا، بلکہ لوگوں نے یہ دونوں طریقے خود گھڑ لئے ہیں۔ اور جیسا کہ یہ تفصیل اس پر بحث ہو چکی ہے کہ عملی زندگی کے یہ دونوں طریقے یعنی روحانیت اور مادیت درحقیقت اسلامیت ہی کی ناقص ادھوری بگڑی ہوئی شکلوں کی تعبیر ہے، جو عیوب اور نقائص

ان دونوں خود ساختہ طریقوں میں پائے جاتے ہیں ان سے پاک کر کے دونوں کو ملا کر دیکھئے، تو مادیت اور روحانیت کے اجتماعی تالیب ہی کا نام

"اسلامیت"

یا "الاسلام" ہے، انسانی فطرت میں جو جبلی تقاضے پائے جاتے ہیں، ان میں ہر ایک کی آسودگی کا سامان زندگی کے اسلامی نظام میں پایا جاتا ہے۔

الغرض قرآن کی روشنی میں اگر مطالعہ کیا جائے تو نظر آئے گا کہ بنی آدم کے اختلاف و افتراق کی ایک ایک راہ کو بند کر کے ایک سیدھا سادہ راستہ اس نے پیش کر دیا ہے کہ ساری انسانیت جب کبھی انصاف سے کام لینے پر آمادہ ہو جائے گی اور اجتماعی ضمیر کے تقاضوں کو لوگ دباتے اور جھٹلاتے نہ رہیں گے بلکہ کھلے دماغ اور منشرح سینوں کے ساتھ ان کی پکار پر کان لگائیں گے تو وہ پائیں گے کہ

"ایک ہی نقطہ پر آدم کے بچوں کا سمٹ کر متحد ہو جانے"

کا خوش گوار خواب، صرف خواب نہیں بلکہ بآسانی اس خواب کو واقعہ بنایا جا سکتا ہے، آخر "مادیت" ہو یا "روحانیت و رہبانیت" "اسلامیت" سے ان دونوں مسلکوں کا اختلاف صرف ایڈیالوجی کا اور فکری و ذہنی رجحانوں ہی کا تو اختلاف ہے۔

اس اختلاف کی حیثیت رنگ و نسل وغیرہ اختلافات کی قطعاً نہیں ہے، جن کو "اتحاد" سے بدلنے کا ارادہ بھی کیا جائے، تو یہ ارادہ پورا نہیں ہو سکتا، میں نے پہلے بھی کہا ہے اور آپ خود بھی سوچئے کیا جن کے چہروں کا فطری رنگ سیاہ ہے ان پر گورے رنگ کے پیدا کرنے کی کیا صورت ہے؟

اور یہی حال نسلوں وطنوں کے اختلاف کا بھی ہے، بلکہ زبانوں کے اختلاف میں جیسا کہ آپ مجھ ہی سے سن چکے، عقلاً کچھ گنجائش نظر بھی آتی ہو، لیکن ساری دنیا ایک ہی زبان بولنے لگے عملاً یہ مسئلہ یقیناً آسان نہیں ہے۔

اس کے برخلاف افکار و خیالات، ذہنی تاثرات کی حالت یہ ہے کہ آئے دن وہ بدلتے رہتے ہیں خصوصاً کسی ناقص خیال اور ادھوری بات کی تکمیل، یعنی مادیت اور روحانیت کو نقائص و عیوب سے پاک کر کے دونوں کا رشتہ ایک دوسرے سے جوڑ کر "اسلامیت" کے نظریہ کو قبول کر لینا انسانی فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔

(باقی آئندہ)

تحلیل نفسی کا تاریخی پس منظر

از
(جناب معز علی بیگ صاحب ایم۔ اے لکچرر شعبۂ فلسفہ و نفسیات)
(مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ)

تحلیل نفسی اور اُس سے متعلق نظریات عصر جدید کا وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جس نے نہ صرف نفسیات بلکہ تعلیم، ادب اور اجتماعیات کے مختلف گوشوں پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ ڈاکٹر سگمنڈ فرائڈ (SIGMUND FREUD) کی یہ تحقیق جو اس کے تمام نظریات کا سنگِ بنیاد ہے اپنی پشت پر ایک طویل تاریخ رکھتی ہے جس کی روشنی میں اس کو اور اس کے مقصد کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے اس دریافت کا سہرا اگرچہ تمام فرائڈ ہی کے سر ہے اور جیسا کہ پروفیسر وڈورتھ (WOOD WORTH) نے کہا ہے کہ "تحلیل نفسی کا طریقہ اور اس سے حاصل شدہ نتائج بالکل فرائڈ ہی کے لئے مخصوص ہیں" تاہم اس میں کچھ اور ماہرین نفسیات کا بھی بالواسطہ دخل ہے۔ یہاں پر یہ کہنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ کانٹ (KANT) کو جرمنی کا ایک بلند پایہ فلسفی بنانے میں جس طرح انگلستان کے شہرۂ آفاق مفکر ڈیوڈ ہیوم (DAVID HUME) کا ہاتھ ہے اسی طرح فرائڈ کو ایک امتیازی مقام تک پہنچانے میں فرانس کے ڈاکٹروں کی معاونت شامل ہے۔

تحلیل نفسی کا طریقہ دراصل مسمرازم (MESMERISM) اور ہپناطیقیت (HYPNOTISM)[1] کی ایک بہت ترقی یافتہ شکل ہے چنانچہ پہلے ہم انہی دونوں طریقوں اور ان کی تاریخ پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے کیوں کہ ان کا استعمال فرائڈ سے پہلے فرانس کے ڈاکٹر برابر کر رہے تھے اور ان کے کارنامو

[1] یہ دونوں اصطلاحیں دراصل اس مصنوعی بے ہوشی یا غفلت کے لئے استعمال کی جاتی ہیں جو ایک خاص نفسیاتی عمل سے کسی انسان پر بھی طاری کی جا سکتی ہے بشرطیکہ اس عمل کے تمام لوازم کا اہتمام کیا جائے اس عمل کو نفسیاتی اصطلاح میں "ایماء" (SUGGESTION) کہتے ہیں اس لئے اکثر ہپناطیقیت کے علاوہ "ہپناطیقی ایماء" کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے۔

کی شہرت تمام یورپ میں پھیل چکی تھی۔

مسمریزم

اینٹن فرنیز مسمر (ANTON FRANZ MESMER) (۱۷۳۴ء تا ۱۸۱۵ء) نے جو آسٹریا کا ایک مشہور طبیب تھا ۱۷۷۸ء میں حیوانی مقناطیسیت (ANIMAL MAGNETISM) کا نظریہ پیش کیا جو بعد میں مسمریزم کے نام سے مشہور ہوا اس نظریہ کی رو سے اس نے ثابت کرنا چاہا کہ حیوانی مقناطیسی اثر (جس کی تفصیل آگے آئے گی) سے ایسے امراض مثلاً فالج اور تشنج وغیرہ کا علاج کیا جا سکتا ہے، لیکن مسمر کی یہ بات کوئی نئی چیز نہ تھی بلکہ جیسا کہ پیرے جانے (PIERRE JANET) نے اپنی کتاب اصول نفسی علم العلاج (PRINCIPLS of PSYCHOTHERAPY) میں اشارہ کیا ہے، اس قسم کے فوق الفطری اور ساحرانہ علاج دنیا میں قبل از مسیح جاری تھے اسی بات کو اس نے اپنی دوسری کتاب نفسیاتی علاج (PSYCHOLOGICAL HEALING) میں ذرا تفصیل سے لکھا ہے چنانچہ اس کا تذکرہ یہاں خالی از افادیت نہ ہوگا وہ لکھتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ سے پہلے یونان، روم اور مصر میں اکثر مذہبی طبیب اس قسم کی کرامات دکھاتے تھے کہ امراض دوا کے بجائے فوق الفطری طریقوں سے بھی ٹھیک ہو سکتے ہیں جن کو "معجزات" یا سحر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، ایسکولیپیس کا مندر (TEMPLE OF AESCULAPIUS) جو کہ ایپی ڈورس میں واقع ہے اس سلسلہ میں مشہور ہے یہاں پر ایک بہت بڑا بت نصب تھا اور ہزارہا مریض علاج کے واسطے آیا کرتے تھے۔ بت کے چاروں طرف اور مندر کے دوسرے حصوں میں مجاور عابد اور اطبا موجود رہتے تھے، یہ اطبا مرض کی تشخیص کیا کرتے تھے اور مجاوروں میں سے بعض کا کام تو یہ ہوتا تھا کہ مریض کو بت کے قریب لے جا کر اس سے صحت کے واسطے سفارش کریں اور بعض کا کام یہ تھا کہ جو علاج بھی وہ بت تجویز کرے اسے مریض کو سمجھا کر زیر علاج کر لیں، گویا وہ بت اور مریض کے درمیان ترجمان کا کام انجام دیتے تھے۔ مندر میں داخل ہوتے وقت دہلیز پر قیمتی نذرانے رکھے جاتے تھے اور پھر مریض ایک فوارے کے شفاف پانی سے غسل لیتے تھے جو وہاں خاص طور پر لگایا گیا تھا۔ مندر میں کم از کم ایک رات قیام کرنا ضروری ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک نابینا

سپاہی ویلیریس ایپر (VALIRIUSAPER) نامی آیا جس کو رسومات ادا کرکے بتایا گیا کہ وہ اپنی آنکھوں پر سفید مرغ کا خون شہد میں حل کرکے طلا کرے چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور اس کی بینائی واپس آگئی، اس روایت کے غلط یا صحیح ہونے سے ہم کو سروکار نہیں یہاں صرف ساحرانہ طریقہ ہائے علاج کو پیش کرنا مقصود ہے۔ غرضکہ قبل از مسیح ایسی طب کا عام رواج تھا اور طبی ارتقار کی تاریخ میں ان واقعات کو اہمیت حاصل ہے۔

عہد عیسوی کے قرون وسطیٰ میں بھی اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں ایلی جیس (ELIGIUS) سینٹ ملاچی (ST. MALACHI) اور برنارڈ آف کلارو (BERNARD OF CLAIRVAUX) ان مشہور مذہبی معالجین میں ہیں جن کے "معجزات" اور کرشمے ایک مصنف گیر نامی نے اپنی کتاب میں لکھے ہیں۔ ان کا دستور یہ تھا کہ یہ حضرات مسیح اور سینٹ ڈینس کا واسطہ دے کر مریض کے لئے دعا کرتے تھے اور پھر مریض سے کہا جاتا تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ کے نام پر کھڑا ہو جائے۔ ان الفاظ کو سنتے ہی مریض تازہ دم ہو کر کھڑا ہو جاتا تھا اور اپنے آپ کو تندرست پاتا تھا۔ اسی طرح انگلستان اور فرانس کے بادشاہوں میں یہ دستور رائج تھا کہ وہ گردن وغیرہ میں جو گلٹیاں نکل آتی ہیں انھیں صرف چھو کر اچھا کیا کرتے تھے اور اس بیماری کو "شاہی بلا" کہتے تھے لیکن لوئی ششدہم (LOUIS XVI) کے زمانے سے یہ رسم ختم ہو گئی۔ چارلس دہم نے (CHARLES X) اسے دوبارہ زندہ کرنا چاہا لیکن ناکام رہا کیوں کہ جیسا کہ ایک فرانسیسی مصنف لینڈوزی کا بیان ہے ان تمام باتوں پر سے اعتقاد اٹھ چلا تھا لیکن "معجزات" پھر بھی اٹھارویں صدی کے آخر تک رائج رہے۔ اسی طرح جادو کے ذریعہ سے بھی علاج ہوتے رہے جیمس گراہم (JAMES GRAHAM) کا نام اس سلسلہ میں بہت مشہور ہے جو "بجلی کے تخت" اور "آسمانی چارپائی" کے ذریعہ سے بانجھ پن کا علاج کرتا تھا۔ جس پر صرف ایک رات لیٹنے کی قیمت پچاس پونڈ ہوتی تھی۔ غرض کہ یورپ میں یہ ساحرانہ کرشمے اور دیگر غیر فطری طریقہ ہائے علاج عام طور پر استعمال کئے جاتے تھے۔ چنانچہ مسمر نے ان ہی سے متاثر ہو کر اپنا ایک نظریہ قائم کیا لیکن اس حیوانی مقناطیسیت کا بانی تنہا صرف مسمر ہی نہیں تھا بلکہ یہ خیال سولھویں صدی کے ایک طبیب پیراسلسس (PARACELSUS) نے پیش کیا تھا اور مسمر نے اسے آگے بڑھایا۔ پیراسلسس کا یہ دعویٰ تھا کہ ستاروں میں ایک قوت موجود ہے جس کی مدد سے انسانی امراض کا علاج بغیر ادویہ کے استعمال کرائے کامیابی سے کیا جا سکتا ہے بس اسی خیال پر

مسمر نے اپنا نظریہ قایم کیا۔ ژلنے کا بیان ہے کہ مسمر کہتا تھا کہ سارے عالم میں ایک غیر مرئی سیال مادہ جاری ہے جو تمام اجسام میں سرایت کئے ہوئے ہے اور ستارے اس سیال مادے کے ذریعہ سے اپنا اثر ڈالتے رہتے ہیں اور جب اس مادے کی متوازن تقسیم میں فتور پیدا ہو جاتا تو امراض رونما ہونے لگتے ہیں اور اس کا علاج یہ ہے کہ اس توازن کو دوبارہ مقناطیسی قوت سے قایم کر دیا جائے جو ہر جسم سے غیر مرئی طور پر مسلسل نکلتی رہتی ہے۔ مسمر نے ہر چند کوشش کی کہ اس نظریئے کو سائنس کے میدان میں لے آئے لیکن یہ بحث اس قدر مبہم اور غیر معقول تھی کہ ڈاکٹروں نے اسے قطعاً نا قابلِ اعتنا سمجھا بلکہ یہاں تک ہوا کہ بعض نے مسمر کو نیم حکیم قرار دے کر اس پر یہ الزام بھی عاید کر دیا وہ مسمرازم سے اخلاق عامہ کو بگاڑ رہا ہے کیونکہ بعض لوگوں پر اس کا اثر بہت برا پڑا۔ پروفیسر ولیم میکڈوگل (WILLIAM MCDOGALL) لکھتے ہیں کہ مسمر کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ ایک عجیب و غریب بھاپ یا رطوبت کو معمول (SUBJECT) کے جسم میں داخل کر کے اس پر غفلت طاری کرتا ہے اور پھر علاج کرتا ہے اور اسی رطوبت کو اس نے حیوانی مقناطیسیت کا نام دیا تھا۔ اور یہی جسم سے خارج ہونے والی مقناطیسی قوت مریض کے سیال مادہ کا توازن درست کر دیتی ہے معمول پر غفلت طاری کرنے کے لئے مسمر کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر انگوٹھوں تک لاتا تھا اور دو تین مرتبہ اس عمل کو دہراتا تھا۔ اس کے علاوہ جہاں کہیں درد یا کوئی اور تکلیف ہوتی تھی اس عضو کو اپنی ہتھیلی یا انگلی سے چھوتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور بھی عجیب و غریب طریقہ تھا جسے مسمر بڑے اعتقاد کے ساتھ استعمال کرتا تھا۔ ایک گہرے بڑے برتن میں بہت سی مقناطیسی کیلیں جمع تھیں اور برتن کے ہر طرف لمبی دھات کی سلاخیں جڑی ہوئی تھیں جن کا رخ باہر کو تھا، مریض اس برتن کے چاروں طرف بیٹھ جاتے تھے اور تصور یہ رہتا تھا کہ مقناطیسی اثرات کیلوں سے نکل کر سلاخوں سے گزرتا ہوا مریضوں تک پہنچ رہا ہے اور اس سے سیال مادے کا توازن درست ہو رہا ہے اس کے بعد فی الواقع بہت سے امراض بالخصوص ذہنی اچھے ہو جاتے تھے۔ یہ باتیں چوں کہ حیرت انگیز تھیں اس لئے باوجود عدم توجہی کے اس کی تحقیق کے لئے ایک شاہی کمیٹی مقرر ہوئی جس میں بنجمن فرنکلن (BENJAMIN FRANKLIN) اور مشہور ماہر علم الکیمیا لاوزیر (LAVOISIER) بھی شامل تھے یہ لوگ تحقیق و جستجو کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ مریض کو کسی مقناطیسی

اثر و تحریک سے فائدہ نہیں ہوتا بلکہ خود اسی کی قوت متخیلہ مرض کو دفع کر دیتی ہے۔ ژانے کے مطابق یہ کمیٹی ۱۷۸۴ء میں مقرر ہوئی اور اس نتیجہ پر پہنچی کہ مریض کے اوپر ایک طاقت کار فرما نظر آتی ہے جو عامل کے تصرف میں ہوتی ہے ہمیں اس سے تو بحث نہیں کہ ان میں سے کون سا بیان زیادہ صحیح ہے البتہ اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ مسمرازم پر عام اطباء کو چھوڑ کر خواص کی نظر ضرور پڑ رہی تھی۔ اور یہ بات بریم ویل (BRAMWELL) کی کتاب "تاریخ و طریقہ ہائے ہپناطیقیت" سے بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ چند قابل ڈاکٹروں نے اس فن کو سمجھنے میں اپنی پوری توجہ صرف کی۔ جن کا ذکر ذرا تفصیل سے کرنا مناسب ہوگا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلا نام جان ایلیٹسن (JOHN ELLIOTSON) کا آتا ہے جو ساؤتھ ورک (SOUTHWARK) کے ایک عطار کا لڑکا تھا۔ ۱۸۳۱ء میں جب کہ ایلیٹسن یونیورسٹی کالج میں طب کا پروفیسر مقرر ہوا تو اس نے مسمرازم پر تجربات شروع کیے لیکن ۱۸۳۸ء میں اسے سخت تاکید کی گئی کہ وہ آئندہ ہرگز ایسا نہ کرے کیونکہ علاوہ اور باتوں کے لوگوں نے اسے مخرب اخلاق بھی سمجھ رکھا تھا۔ اس لئے یونیورسٹی کے قانونی دفعات میں بھی اسے ممنوع قرار دیا گیا۔ ایلیٹسن نے قانون کا اتباع تو کیا لیکن مسمرازم کا شوق اسے تادم مرگ لگا رہا اور بعد میں اس نے ایک رسالہ زوئسٹ (ZOIST) نکالا جس نے مسمرازم کی شہرت پھیلانے میں کافی مدد دی۔ تاہم اس فن کو علمی دنیا میں وقار حاصل نہ ہو سکا۔

ایلیٹسن کے بعد اس فن کو ترقی دینے میں اہم ترین نام مانچسٹر کے ایک مشہور جراح جیمس بریڈ (JAMESBRAID) کا آتا ہے بریم ویل نے اس کے متعلق اپنی تاریخ میں بہت تحقیق و وضاحت کے ساتھ لکھا ہے، وہ لکھتا ہے کہ بریڈ نے سب سے پہلے ۱۳ نومبر ۱۸۴۱ء میں ایک مسمری جماعت میں جا کر اس کرشمہ کو دیکھا اور اس سے کافی متاثر ہوا، اور پھر چھ روز بعد ایک مرتبہ اور گیا جب کہ مسمرازم کا عمل مریضوں پر ہو رہا تھا، اسی دوران میں ایک مریض نے جس پر غفلت طاری کی گئی تھی باوجود تمام کوششوں کے آنکھ نہیں کھولی بریڈ اس چیز کو تاڑ گیا اور فوراً اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ غفلت محض خارجی اثر کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کا سبب کچھ داخلی کیفیات بھی ہیں جو مریض میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں اس نے پہلا لکچر ۲۷ دسمبر ۱۸۴۱ء میں مجمع عام کے سامنے دیا۔ اور ایک نئی اصطلاح ہپناطیقیت یا ہپناٹزم ایجاد کی۔ بریڈ ہی وہ پہلا شخص ہے

جس نے سائنٹیفک انداز پر اس فن کو ترقی دینے کی پوری پوری کوشش کی۔ لیکن ژانے لکھتا ہے کہ برم ذہن نے بریڈ کو غیر معمولی طور پر سراہا ہے اور جن واقعات کا مشاہدہ بریڈ کی طرف منسوب کیا ہے اس کا ذکر پوی سیگر (PUYSE' GUR) الگزینڈر برٹرینڈ (ALEXANDER BERTRAND) اور دیلوزی (DELEUZE) وغیرہ نے بھی کیا ہے۔[1]

ژانے کی یہ بات اس وجہ سے قابل قبول نہیں ہے کہ یہ قطعاً بے محل ہے، اگر بالفرض ان لوگوں نے مشاہدہ کیا بھی تو بریڈ کے کارنامے سے اس کا کیا تعلق؟ یہ بات بہرحال تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ "ہپناٹزم" بریڈ کی ایجاد ہے پروفیسر مرفی (MURPHY) اس سے اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بریڈ نے بالآخر اس نظریئے کی صحت کو منوالیا جس کی تعبیر کچھ عرصہ پہلے اس طرح کی جاتی تھی کہ مسمرازم تمام تر دجل و فریب پر مبنی ہے ولیم میکڈوگل کا بیان ہے برٹرینڈ اور بریڈ نے صاف طور پر یہ ثابت کیا کہ ان اثرات کی توجیہہ زیادہ تر نفسیات سے ہونا چاہیئے نہ کہ کسی عجیب و غریب خلیاتی رطوبت سے۔ غرضکہ بریڈ کی اس دریافت نے مزید تحقیق کی راہ کو ہموار کر دیا اور اس طرف توجہ کا رخ از سر نو پلٹا لیکن تعجب کی بات ہے کہ ۱۸۶۰ء میں بریڈ کی موت کے بعد انگلستان میں یہ فن بھی عملی حیثیت سے ختم ہو گیا، البتہ ۱۸۸۱ء میں جا کر ایک تحقیقی سوسائٹی مقرر ہوئی جو اس پر کام کرتی رہی جس کے ممبران ولیم جیمس (WILLIAM JAMES) ہنری سجوک (HENRY SIDGWICK) اور جے جے ٹامسن (J. J. THOMPSON) وغیرہ تھے اس نئی دریافت یعنی ہپناٹزم اور ایحاذ کے مقابلے میں مسمرازم تقریباً ماند پڑ چکا تھا اور ژانے کے بموجب ۱۸۸۵ء تک یا اس کے بعد یہ

---

[1] ژانے نے ہپناٹیقی ایحاذ کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے برٹرینڈ کے بارے میں لکھا ہے جو نظریہ ایحاذ (SUGGESTION) کا بانی ہے۔ برٹرینڈ مسمرازم میں غایت درجہ دلچسپی رکھتا تھا اور اس کا یہ خیال تھا غفلت کی کیفیت خود انسان کے خیال اور اس کی توجہ اور نیز اس کی خواہش کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس پر کوئی فوق الفطری طاقت کارفرما نہیں ہوتی ہے چنانچہ یہ چیز ایک عرصہ تک موضوع بحث رہی۔

کم و بیش اسی قسم کی ایک بحث مسمرازم شروع ہوتے ہی سیالیوں (FLUIDISTS) اور حیوانیوں (ANIMISTS) کے درمیان چھڑی تھی، اول الذکر کا یہ کہنا تھا، کہ بیہوشی غیر مرئی سیال مادہ کا نتیجہ ہے جو عامل کے جسم سے نکلتا ہے۔ ثانی الذکر فرقے نے اس کی پرزور تردید کی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ بے ہوشی ذہنی تغیرات کا نتیجہ ہے۔

دونوں نظریات بھی مردہ ہو چکے تھے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جس طرح آج کل ایک نظریہ مثلاً "ایٹمی طاقت آتا فاناً" میں عالمگیر شہرت اختیار کر لیتا ہے اس طرح یہ نہ کر سکے بلکہ انفرادی طور پر کہیں کہیں لوگ ان پر کام کرتے رہے

انگلستان کے بعد ہپناٹزم کو فرانس کے اطباء نے سنبھالا جن میں اول ڈاکٹر لیبالٹ (LIBREAU) کا نام آتا ہے۔ لیبالٹ نے ۱۸۶۰ء سے اس پر باقاعدہ تحقیق شروع کی اور نانسی (NANCY) میں اپنا اسکول قائم کیا۔ اور برن ہائم (BERNHEIM) کی معاونت میں اس سلسلے میں اقدام کیا۔ میکڈوگل نے لکھا ہے کہ نانسی اسکول کے سرگروہ لیبالٹ اور برن ہائم نے بریڈ کے اس نظریئے کو انتہا تک پہنچایا، اور انہوں نے دعویٰ کیا کہ ہپناٹزم "ایعاذ" کے سوا کچھ نہیں ہے، بریم ویل نے لیبالٹ کے شفاخانے کو اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ۱۸۸۹ء کے موسم گرما میں وہاں پہنچا اور اس کے شفاخانے کو خلاف توقع پایا یعنی انگلستان کے شفاخانوں کے برعکس اس کا کمرہ پر ہیبت نہیں تھا بلکہ معمولی شفاخانوں کی طرح تھا، اور مریض آپس میں بڑے اطمینان سے بات چیت کرتے تھے اور ڈاکٹر سے بھی بے تکلفی سے گفتگو کرتے تھے اور حالت ہپناطیقی کو رونما کرنے میں کچھ دیر نہ لگتی تھی۔ لیبالٹ نے میری خاطر سے کچھ تجربے بھی دکھائے، سارا کام دس منٹ میں انجام پاتا تھا اور غفلت سے بیدار ہو کر مریض اکثر یا تو ٹہلنے لگتا تھا یا اپنے کسی دوست سے باتوں میں لگ جاتا تھا۔ ڈاکٹر لیبالٹ مرض کو بآسانی رفع کر دیتا تھا۔ لیبالٹ کے شفاخانے کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہاں خوف اور ہیبت سے کام نہیں لیا جاتا تھا۔ چنانچہ بریم ویل ایک واقعہ بیان کرتا ہے کہ جس وقت ایک مریض کا علاج کیا جا رہا تھا دو کم عمر لڑکیاں کمرے میں داخل ہوئیں اور لیبالٹ نے اپنی توجہ مریض پر سے ہٹا کر ان کو بے ہوش کر دیا اور ادھر سے بے فکر ہو گیا، تقریباً بیس منٹ کے بعد ایک کی آنکھ کھلی تو اس نے دوسری کو بھی جگایا اور دونوں ہنستی کھیلتی باہر چلی گئیں، یعنی یہ بچوں سے ایک قسم کا مذاق تھا۔ بریم ویل کو یہ چیز بہت پسند آئی۔ لیبالٹ غرباء سے بھی بہت محبت کرتا تھا ان کا علاج مفت کیا کرتا تھا۔ لیبالٹ نے اپنی تمام عمر اس فن پر صرف کی مگر جس طرح اس کے کام کی قدر ہونا چاہئے تھی نہ ہوئی۔

اوپر کہا جا چکا ہے کہ ۱۸۸۵ء تک ایعاذ و ہپناٹزم تقریباً معدوم ہو چکے تھے، اس کے بعد کم و بیش پانچ برس تک یہ فن جھوٹے اور نام نہاد اطباء کا تختۂ مشق بنا رہا۔ اور بعض مقامات پر اس کے مظاہرے بھی ہوتے

لیکن سائنس داں اس کو تسلیم کرنے میں جھجکتے ہی رہے۔

اس طویل مدت کے بعد پھر سالپیتریری (SALPÊTRIERE) اسکول پیرس میں اس کا احیا ہوا اور اس کا سہرا چارلس رشے (CHARLES RICHIT) کے سر رہا دراں حالیکہ اوروں نے بھی اس کی کوشش کی لیکن ناکام رہے ان میں سے یہ نام قابل ذکر ہیں۔ کرشر (KIRCHER) (۱۸۷۶ء) زرمک ہویل (EZER) (MAK HEIBEL) (۱۸۷۶ء) پرئیر (FREYER) (۱۸۷۸ء) اور بیرڈ (BEARD) (۱۸۸۱ء)۔

رشے وہ پہلا شخص ہے جس نے تعصب اور غلط فہمی کے پردے کو چاک کر کے از سر نو ہپناٹزم کو ایک وقار عطا کیا۔ رشے نے سائنس دانوں کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ اگر ہپناٹزم محض ایک دجل و فریب اور ناجائز فوائد کے حصول کا ایک ذریعہ ہے تو آخر یہ عمل ہزارہا ہزار انسانوں پر کس طرح کارگر ہوتا ہے! کیا ان سب نے مل کر کوئی ایسی صلاح کر رکھی ہے کہ وہ دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکیں گے دراں حالیکہ ان کو اس میں کوئی غیر معمولی فائدہ نہیں پہنچتا۔ مزید یہ کہ سارے معالج جو اس طریقہ کو استعمال کرتے چلے آئے ہیں کیا اتنے جعلی مریض فراہم کر سکتے تھے؟ اس کے ساتھ ساتھ رشے نے "مشی فی النوم" اور دوسری کیفیات پر جو لوگوں پر طاری کی جاتی تھیں نفسیاتی نقطۂ نظر سے روشنی ڈال کر یہ ثابت کیا کہ ان سب کے لئے نفسیاتی وجوہ بھی موجود ہیں جو ناقابلِ انکار ہیں غرضکہ اس طرح رشے اپنی انتھک کوششوں اور قوی استدلالات سے ہپناٹزم کو آگے بڑھانے میں کامیاب رہا۔

ژانے کے مطابق پیرس اسکول کا بانی یہی ہے۔

شارکو اور پیرس اسکول

شارکو (CHARCOT) ان اساتذہ میں سے ہے جو فرائڈ اور ایڈلر وغیرہ کی صف میں ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ اور رشے کی شخصیت اس کے سامنے ماند پڑ چکی ہے، سالپیتریری اسکول میں اعصابی امراض پر عرصے سے شارکو تحقیق میں مصروف تھا لیکن اس نے اس مسئلہ کو عضویاتی نقطۂ نظر سے دیکھا تھا۔ جس وقت ہپناٹزم نے دوبارہ شہرت حاصل کی تو اس کی نظر بھی اس پر پڑے بغیر نہ رہ سکی کیوں کہ اعصابی امراض سے اس کا بلا واسطہ تعلق تھا۔ شارکو نے بجائے نفسیاتی بحثوں میں الجھنے کے اس مسئلہ کو سرے سے ایک نئے انداز پر اٹھایا۔ اس نے دعویٰ

گویا کہ ذہن کی فاسد کیفیات (ABMORMALSTATESof MIND) اسی وقت ٹھیک طور پر بھی جا سکتی ہیں جب کہ ان علامات (SYMPTOMS) پر غور کیا جائے تو مشاہدے میں آتی ہیں۔ اور جو قطعاً جعلی طور پر پیدا نہیں کی جا سکتیں بلکہ از خود پیدا ہوتی ہیں۔ یہ اس بات کا بھی ثبوت ہیں کہ ذہن میں فی الواقع کوئی تغیر رونما ہوا ہے اور اس میں مصنوعی باتوں کو کوئی دخل نہیں ہے۔ ہپناطیقی کیفیت طاری کرنے کے بعد شارکو نے یہ دکھایا کہ بعض پٹھوں کو چھونے سے فالج پیدا ہو سکتا ہے۔ اور ان ہی کو مختلف طریقہ پر حرکت دینے سے تشنج پیدا ہوتا ہے۔ شارکو کے شاگرد تین مریض عورتوں پر جو اس کے شفاخانے میں تھیں اس قسم کے تجربات کرتے رہتے تھے۔ اور یہ مجمع عام میں بھی دکھائے جاتے تھے یہاں دراصل شارکو کو علم التصنوع (ANATOMY) کے مطالعہ نے پوری مدد دی۔ ان شواہد نے شارکو کی کافی ہمت افزائی کی اور اسے یہ معلوم ہو گیا کہ سابق کی طرح اس کے کارناموں کو کوئی مکر و فریب سے تعبیر نہیں کر سکتا ان تجربوں کے بعد اگلا قدم اس نے یہ اٹھایا کہ ان تمام کیفیات کی تقسیم کی جو ہپناطیقی حالت کے بعد پٹھوں کو مختلف حرکتیں دینے سے پیدا ہوتی ہیں چنانچہ ان کی تین بڑی قسمیں سامنے آئیں (۱) غفلت و بے ہوشی (LETARGY) ۲۔ سکتہ (CATALEPSY) ۳۔ مشی فی النوم (SOMNAMBULISM)

معمول کی آنکھوں کو ہپناٹزم سے بند کرنے کے بعد پہلی کیفیت طاری کی جاتی تھی۔ اس کے بعد اگر اس کی آنکھیں فوراً کھول دی جاتی تھیں تو معاً دوسری کیفیت شروع ہوتی تھی جس میں اس کے اعضا کو اس حالت میں بھی رکھنا ممکن ہوتا تھا جو مصنوعی طور پر ناممکن ہے۔ اس کے بعد سر کے درمیانی حصے (VERTEX) کو رگڑ دینے سے تیسری حالت شروع ہو جاتی تھی۔ یہاں یہ واضح رہے کہ یہ تمام حالتیں صرف پٹھوں کو مختلف طریقہ سے حرکت دینے سے پیدا ہوتی تھیں نہ کہ معمول کو اس کا حکم دے کر جیسا کہ مسمری جماعت اور دیگر لوگوں کا طریقہ تھا ان تینوں کو شارکو نے ہپناطیقیت کبریٰ (MAJOR HYPNOTISM) کا نام دیا۔ اس کے علاوہ ہپناطیقیت صغریٰ (MINOR HYPNOTISM) کی اصطلاح ان کیفیات کے لئے مخصوص کی گئی جن کا تعلق بلاواسطہ طور پر نفسیات سے تھا۔ مندرجہ بالا تمام کیفیات خالص عضویاتی قوانین کے تحت رونما ہوتی تھیں لیکن یہ واضح رہے ان کا تعلق صرف ان عورتوں سے تھا جو ہسٹریا کے

مرض میں مبتلا رہتی تھیں ہر کس وناکس میں یہ نہیں پیدا کی جاسکتی تھیں۔ ان تجربات کی بنا پر شارکو نے اپنا ایک نظریہ قایم کیا جسے انس نے ۱۳ فروری ۱۸۸۲ء میں سائنس اکادمی کے سامنے پیش کیا باوجودیکہ اس سے قبل تین مرتبہ حیوانی مقناطیسیت وغیرہ کو اکادمی نے رد کردیا تھا لیکن اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ اس میں شارکو کی شخصیت کو پورا پورا دخل تھا۔ شارکو نے اپنے مقالے میں اس بات کا پورا لحاظ رکھا کہ کوئی بات اس طرح پیش نہ کی جائے کہ لوگوں کو حیرت ہو یا اس کا مشاہدات سے تعلق نہ ہو کیوں کہ یہ بات سائنس کے منافی ہے۔

شارکو کو اس میں بہرحال کامیابی ہوئی اور اس کی کامیابی نے اس سدِ راہ کو ہٹا دیا جو فن ترقی میں مسلسل حائل ہو رہا تھا۔ اور اب اس کو ایک مضبوط سائنٹیفک بنیاد مل گئی۔ ژانے لکھتا ہے کہ اس کے بعد اس موضوع پر بڑی بڑی تصانیف اور مقالات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور سارے یورپ میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ مصنفین میں ویزلولی (VIZIOLI) لادام (LADAME) بیبنسکی (BABINSKE) اور لومبروسو (LOMBROSO) وغیرہ مشہور ہیں۔ ۱۸۸۶ء میں ان حضرات کی تصانیف نکل رہی تھیں کہ ایک دوسرے اسکول کا منشور شائع ہوا جو سالپیٹری اسکول کا حریف ثابت ہوا۔ یہ وہی نانسی (NANCY) اسکول ہے جس کا ذکر ہم شروع میں کر آئے ہیں۔

نانسی اسکول

ایک سو دس صفحات کے اس منشور کا مصنف پروفیسر برن ہائم تھا جو لیبالٹ کے معاون کی حیثیت سے ایک عرصے سے تحقیق میں مصروف تھا۔ برن ہائم اپنی کتاب کی مقبولیت کے لئے رشئے اور شارکو کا رہینِ منت ہے۔ جس کا خود بھی اس نے اعتراف کیا ہے۔ کیونکہ اگر یہ پہلے سے زمین ہموار نہ کر چکے ہوتے تو شاید اس کی طرف کوئی متوجہ نہ ہوتا۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ۱۸۸۰ء تک یہ فن کافی تنزل کر چکا تھا اس لئے برن ہائم کا کامیاب ہونا اور بھی مشکل تھا لیکن یہ اتفاقی امر تھا کہ جہاں اس کا زوال ہوا ٹھیک وہیں سے اس کا دوبارہ عروج بھی ہوا۔ برن ہائم طریقۂ القاء کو استعمال کرتا تھا جس سے وہ معمول میں سکتہ (CATALEPSY) وغیرہ جیسی کیفیات پیدا کر دیتا تھا۔ القاء دو قسم کا ہو سکتا ہے۔ ایجابی اور سلبی۔ مثلاً اگر معمول سے کہا جائے کہ وہ ہاتھ نہیں ہلا سکتا تو پھر ہاتھ میں جنبش

اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ ایجابی طور پر اس کا بدل کر دیا جائے۔ برن ہائم الیعاذ کے لئے ان الفاظ کو استعمال کرتا تھا۔ "میری طرف بغور دیکھو" "اب تم سونے والے ہو، تمہاری آنکھیں خمار آلود ہیں، تکان محسوس ہو رہی ہے، آنکھوں سے پانی نکلنے لگا۔ دھند طاری ہو گیا۔ تو وہ پلکیں جھپکنے لگیں۔ اب تم اپنی آنکھیں نہیں کھول سکتے، تم اب کچھ نہیں کر سکتے وغیرہ۔ اس کے بعد تحکمانہ لہجے میں کہتا تھا "سو جاؤ"

ہپناٹزم کے دوران میں ایک بار برن ہائم نے مریض سے کہا کہ وہ بیدار ہونے پر اسپتال میں جب داخل ہوگا تو اسے ہر چارپائی پر کتے لیٹے نظر آئیں گے۔ چنانچہ واقعی ایسا ہوا کہ معمول خود کو کتوں کے شفاخانے میں پاکر متحیر ہو گیا۔ برن ہائم کہتا ہے کہ یہ سب معمولی باتیں ہیں جو بآسانی سمجھ میں آسکتی ہیں۔ ہم فطری طور پر بعض محض فرضی خیال کے تحت بہت سی حرکات کر بیٹھتے ہیں۔ مثلاً چہرے کو گانا سنتے وقت ایک خاص انداز سے بنانا اسی طرح ہاتھوں کو حرکت دینا۔ یہی باتیں بعض حالات میں حد درجہ بڑھ جاتی ہیں اور خیال اس قدر غالب آجاتا ہے کہ فی الفور حرکت شروع ہو جاتی ہے۔ جب ہم الیعاذ سے قوت متخیلہ کو بڑھا دیتے ہیں تو غیر معمولی باتیں رونما ہونے لگتی ہیں۔ اور ضروری نہیں کہ یہ صرف مریضوں تک محدود ہو بلکہ تندرستی کی حالت میں یہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ ہپناٹزم اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ الیعاذ کی قوت سے غفلت طاری کر دی جائے۔ برن ہائم کی ان سادہ اور غیر پیچیدہ باتوں سے اس کے معاونین نے پورا فائدہ اٹھا کر ہپناٹزم کو کافی ترقی دی۔

برن ہائم اور اس کے شاگردوں نے اپنی کاوشوں کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے اس بات کی بھی کوشش کی کہ الیعاذ سے عضویاتی تغیرات (PHYSIOLOGICALCHANGES) رونما کئے جائیں تاکہ اس بات کا قطعی امکان نہ رہے کہ ان پر فریب کا الزام عاید ہو۔ ۱۸۴۶ء میں شارب گمن نے یہ کہا تھا کہ الیعاذ سے یہاں تک ممکن ہے کہ جسم پر چھالے پڑ جائیں۔ برن ہائم اس کو خوب سمجھتا تھا۔ چنانچہ اسی بات کو اس نے اٹھایا، اور تجربہ شروع کر دیا۔ کافی محنت و کاوش کے بعد یہ دیکھا گیا کہ جسم پر چھالے نمودار ہونے لگے۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی طرح بھی جعلی حرکت نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس کے بعد اس قسم کے تجربات۔ میبل۔ بورو اور سیگارڈ وغیرہ نے کئے اسی کے ساتھ ساتھ یہ معلوم کرنے کی کوشش بھی کی گئی کہ آیا الیعاذ سے جرائم کرانا ممکن ہے یا نہیں۔

"الیعاذ مجرمانہ" (CRIMINAL SUGGESTION) کا مسئلہ ۱۸۶۷ء سے چلا آ رہا تھا اور اس پر علی الترتیب

۱۸۵۰ء، ۱۸۶۶ء، ۱۸۸۵ء اور ۱۸۸۶ء میں جوزف پیرے، ڈیورنیڈ، بیلنگر، میکاریو اور شارکین نے طویل بحثیں کی تھیں۔
آخری کتاب اس پر ۱۸۶۰ء میں شائع ہوئی ۱۸۸۶ء میں برن ہائم نے ازسرِ نو اس مسئلے کو اٹھایا وہ لکھتا ہے۔ "یہ
معلوم کرنے کے لئے کہ ایحاذ میں کس حد تک قوت ہے میں نے معمول کے لئے ایک چھوٹا سا ڈرامہ کیا۔ اس کو
ایک فرضی آدمی دکھایا جو دروازے پر کھڑا ہے اور یہ کہا کہ اس نے تمہاری بے عزتی کی ہے۔ اس کے بعد میں
نے اس کے ہاتھ میں کاغذ کا چاقو دیا یہ بتاتے ہوئے کہ یہ خنجر ہے اور تم اس سے اسے مار دو۔ معمول نے تیزی
سے جست کی اور دروازے میں خنجر بھونک دیا اور پھر ساکت و جامد کھڑا ہو گیا۔ وہ وحشیانہ انداز سے دیکھ رہا
تھا اور بری طرح کانپ رہا تھا۔" اسی طرح لیگیو نے جو برن ہائم کا شاگرد تھا متعدد تجربات کئے اور یہ معلوم
کر لیا کہ یہ سب کچھ ایحاذ کے ذریعہ ممکن ہے۔ "ایحاذ مجرمانہ" کو بڑھتے ہوئے دیکھ کر لوگوں نے اعتراضات
کئے اور یہ خطرہ لاحق ہو گیا اس طرح جس سے جو جرم چاہیں صادر کرا سکتے ہیں۔ اور امن عامہ میں خلل پڑ سکتا ہے
"Revue Philosophique" کی رپورٹ (۱۸۹۲ء پہلی جلد صفحہ ۲۵۶) نے بتایا کہ اس
وقت پیرس میں دس ہزار سے زیادہ اشخاص ایسے موجود تھے جن کو کسی قسم کے جرم پر بھی ابھارا جا سکتا تھا
چنانچہ اس کے لئے قانونی تحفظ کی اپیل کی گئی۔ رپورٹ نے اس بات پر بھی متنبہ کیا کہ ہر مجرم پر مقدمہ چلاتے
وقت یہ دیکھ لیا جائے کہ وہ حالت ہپناطیقی میں تو نہیں تھا برن ہائم کے ان تجربات نے لوگوں میں غیر معمولی
دلچسپی پیدا کر دی اور بہت سے لوگ اس کے اردگرد جمع ہو گئے لیکن برن ہائم کو یہ صرف تجربہ کی حد تک کرنا تھا
اس نے آگے چل کر باقاعدہ امراض پر اس کا تجربہ شروع کر دیا اور یہ معلوم ہوا کہ ہسٹیریا، بعض امراض شکم،
مشی فی النوم، وغیرہ اس سے بآسانی رفع کئے جا سکتے ہیں اس کامیابی سے نہ صرف یورپ کے ممالک میں
نانسی اسکول کی شہرت عام ہو گئی بلکہ باہر امریکہ وغیرہ تک اس کا چرچا ہونے لگا۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ نانسی اسکول اپنے حریف شارکو کو برداشت نہیں کر سکتا تھا چنانچہ دونوں
میں شدید کشمکش شروع ہو گئی جو بالآخر شارکو کی شکست پر منتج ہوئی چونکہ برن ہائم یہ ثابت کرنے میں کامیاب
ہو گیا کہ ہپناطیقیت کبریٰ فطری نہیں ہے بلکہ مشق کا نتیجہ ہے۔ ژانے کہتا ہے کہ میں بھی بالآخر اسی نتیجہ پر پہنچا
کہ شارکو غلطی پر ہے کیوں کہ یہ دیکھا گیا کہ جب اس کے تجربات کو دہرایا تو وہ حالتیں اکثر رونما نہ ہو سکیں جن کو

شارکو نے بیان کیا تھا۔ اور دکھایا بھی تھا۔ لیکن کیا اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست ہوگا کہ شارکو نے عوام کو دھوکا دیا؟ آخر یہ مشق کون کراتا تھا؟ کیا یہ سب کچھ بھی فریب تھا؟ ژانے اس کو واضح کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ شارکو نے خود کبھی کسی مریض پر جسکو مجمع عام میں لایا جاتا تھا ہپناطیقی کیفیت طاری نہیں کی بلکہ یہ اس کے تلامذہ کرتے تھے جو پہلے سے مریض کو ان حرکات کی مشق کرا چکتے تھے جن کو مجمع میں دکھانا ہوتا تھا۔ تو کیا پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ شارکو کے شاگرد خود اپنے استاد کو اور عوام کو دھوکا دینا چاہتے تھے ژانے نے بڑی کد و کاوش سے تحقیق کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ مریض عورتیں جن میں ہپناطیقیت کبریٰ کی علامتیں رونما ہوتی تھیں شارکو کے زیرِ علاج ہونے سے قبل۔ ان تمام حالتوں سے بسبب بیماری گذر چکی تھیں اور یہ ہسٹیریا کے مریضوں کی خصوصیات ہیں۔ شارکو کے شاگرد صرف ان کو دہرانے تھے۔ ان خصوصیات کا علم پہلے بھی بہت سے لوگوں کو ہو چکا تھا۔ شارکو جس وقت سائنس اکادمی میں اپنا مقالہ پیش کر رہا تھا تو وہ خوب جانتا تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے سرے سے وہ نئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ صرف پچھلی باتوں کو سائنٹیفک دلائل بہم پہنچائے جا رہے ہیں۔ غرضکہ برن ہائم نے اس طرح شارکو کے مکتبِ فکر کو ایک سخت دھکا پہنچایا جس سے وہ کبھی عہدہ برآنہ ہو سکا۔

۱۸۹۳ء میں شارکو کی وفات کے بعد توقع تو یہ تھی کہ برن ہائم کے اسکول کو مزید وسعت حاصل ہوگی لیکن ہوا اس کے برعکس۔ اس کے بعد نانسی اسکول کا زوال شروع ہوگیا۔ ۱۸۹۲ء سے لیکر ۱۹۰۶ء تک بے شمار کتابیں اور مضامین اس فن پر جرمنی، فرانس، روس، امریکہ اور انگلستان سے نکلتے رہے لیکن ۱۹۰۹ء میں یہ رفتار سست پڑ گئی۔ اور لطف یہ ہے کہ خود برن ہائم کی دلچسپی ادھر سے بہت کم ہوگئی۔ ژانے ہپناطیقیت کے زوال کے دو بڑے اسباب بیان کرتا ہے۔ ایک تو شارکو کی یہ غلطی کہ اس نے ہپناٹزم کی توجیہات بجائے نفسیات کے عضویات سے کیں۔ دوسرے وہ کشمکش جو دونوں اسکولوں میں رونما ہوئی اور مدت تک جاری رہی۔ پھر یہ کہ جو حد سے زیادہ جوش و خروش اس فن کے لئے ظاہر کیا گیا اسکا ردِ عمل بھی ہوا۔ لیکن یہ پہلو ہمارے نزدیک تمام تر سلبی ہیں۔ ایجابی حیثیت سے اس کا سبب یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر سگمنڈ فرائڈ نے تحلیل نفسی کے طریقہ سے دنیا کو روشناس کرا دیا جو ہپناٹزم سے زیادہ قابلِ قبول تھا۔ کیونکہ اس میں کوئی غیر سائنٹفک عنصر شامل نہیں ہے۔ ذیل میں ہم اس کی تفصیل

پیش کرتے ہیں۔

تحلیل نفسی

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ فروری ۱۸۸۲ء میں شارکو نے اکاڈمی میں اپنا مقالہ پیش کیا ۱۸۸۴ء میں نانسی اسکول کا منشور شائع ہوا ان تمام واقعات نے فرانس کے اسکولوں کی شہرت عالمگیر کر دی ۱۸۸۵ء میں فرائڈ اپنی بعض اعلیٰ تحقیقات کی وجہ سے وائنا (VIE NNA) میں اعصابی امراض پر مدرس مقرر ہوا اور یہاں اس نے ایک سربرآوردہ شخص ڈاکٹر برڈکسے سے سند لیکر وظیفہ حاصل کیا اور اسی سال پیرس روانہ ہو گیا۔ پیرس میں یہ فوراً سپالپیٹیری اسکول میں طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوا اور شارکو سے اچھے روابط قائم کر لئے۔ اور اس سے وعدہ کر لیا کہ اس کے لکچرز کا ترجمہ جرمن میں کریگا۔ فرائڈ کہتا ہے کہ شارکو کے ساتھ رہ کر سب سے زیادہ جس چیز نے مجھے متاثر کیا وہ اس کی ہسٹیریا پر تحقیقات ہیں جو میرے چشم دید واقعات ہیں۔ ان ہسٹیریا کے مریضوں کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ پیرس میں رہ کر فرائڈ کو شارکو سے مشوروں کا کافی موقعہ ملا، جن میں بعض حد درجہ مفید ثابت ہوئے۔ ۱۸۸۶ء میں فرائڈ وائنا واپس آیا۔ یہاں اس نے اپنے فرانس کے تجربات کو دہرایا لیکن اس کی کوئی قدر نہ کی گئی۔ سب سے پہلا اعتراض تو یہی تھا کہ مردوں میں ہسٹیریا پیدا ہونا ممکن ہی نہیں یہ صرف نسوانی مرض ہے فرائڈ کے بیشتر مریض مرد تھے ڈاکٹر جوزف بریوئر (JOSEPH BREUER) نے بتایا کہ لفظ (HYSTERON) کے معنی رحم (UTERUS) ہیں اور ظاہر کہ اس کا تعلق صرف عورتوں سے ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وائنا کی طبی مجلس سے فرائڈ کے اختلافات بڑھتے گئے اور آخر کار اس کو اسے خیرباد کہنا پڑا تقریباً پورے سال اسے کہیں لکچر دینے کا موقعہ نہ ملا اور اب اسے ذریعۂ معاش کے لئے صرف اپنے شفاخانے پر اکتفا کرنا پڑا جو اس نے نجی طور پر قایم کر لیا تھا۔ فرائڈ اپنے یہاں علاج کے صرف دو طریقے استعمال کرتا تھا۔ ایک بجلی کے ذریعہ جسے (ELECTROTHERAPY) کہتے ہیں اور دوسرا ہپناٹزم جس میں ثانی الذکر زیادہ موثر ثابت ہوا، اس میں دقت یہ پیش آتی تھی کہ ہر شخص پر کیفیت ہپناطیقی طاری نہیں ہوتی تھی۔ دوسرے یہ کہ بعض افراد میں گہری نیند یا غفلت نہیں پیدا ہوتی تھی۔ لیکن ان سب دقتوں کے باوجود بھی اس طریقہ کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ اسی دوران میں فرائڈ نے نانسی اسکول کا شہرہ سنا اور

یہ طے کر لیا کہ وہ مزید تربیت حاصل کر کے اپنے طریق کار کے نقص کو دور کرے گا۔ چنانچہ ۱۸۸۹ء میں وہ نانسی روانہ ہو گیا اور وہاں جا کر برن ہائم کے عجیب و غریب کارنامے دیکھے۔ نانسی ہی کے دوران قیام میں فرائڈ کے ذہن پر اس خیال نے تسلط کر لیا تھا کہ ذہن میں بعض قوتیں شعوری سطح سے نیچے بھی ہیں جو برابر اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔ اور شعور پر اس کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ نانسی جاتے وقت فرائڈ اپنے ساتھ ایک مریضہ کو بھی لے گیا تھا جو عرصے سے ہسٹریا میں مبتلا تھی اور بار بار علاج کرنے کے بعد بھی بیماری عود کر آتی تھی اسے اس نے برن ہائم کے سامنے پیش کیا لیکن وہ اس علاج سے قاصر رہا۔ اس واقعہ سے اور ویسے بھی ایک عرصے تک وہاں رہ کر فرائڈ کو ہپناٹزم کے حدود کا اندازہ ہو گیا اور نانسی سے واپس آ کر اس نے دوبارہ اپنا سابق کام شروع کر دیا۔

واپس آنے پر فرائڈ نے ڈاکٹر جوزف بروئر سے جو وائنا کا مشہور ڈاکٹر تھا تعاون حاصل کر لیا۔ بروئر اس زمانے میں ایک نوجوان لڑکی کا علاج کر رہا تھا۔ یہ لڑکی فالج تشنج اور انتشار ذہنی جیسے امراض میں مبتلا تھی اور اسے یہ تمام امراض اپنے والد کی تیمارداری میں جب کہ وہ بیمار تھا شروع ہوئے تھے۔ دوران علاج میں بروئر نے اتفاق سے یہ معلوم کر لیا کہ اگر ہپناٹی حالت میں لڑکی سے کہا جائے کہ تم اپنے خیالات کا خواہ وہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں آزادانہ اظہار کرو تو بعد میں اس سے اسے کافی سکون ہو جاتا تھا۔ اس کی بنا پر بروئر نے ایحاء کو تقریباً ترک کر کے اسے اپنا لیا۔ اور یہ واقعی بالکل نئی چیز ثابت ہوئی اس طریقہ کو بار بار استعمال کرنے سے یہ دیکھا گیا کہ مریضہ رو بصحت ہوتی چلی گئی۔ اور تمام محو شدہ خیالات باآسانی ذہن میں آنے لگے۔ اور بالآخر یہ سلسلہ خیالات کہیں تک پہنچا جب کہ وہ لڑکی اپنے باپ کی تیمارداری میں مصروف تھی اور اسے یہ امراض شروع ہوئے تھے۔ بروئر اس نتیجے پر پہنچا کہ دوران تیمارداری میں اسے اپنی کسی تیز خواہش کو ضبط کرنا پڑا اور اس وجہ سے علامتیں رونما ہو گئیں۔ کیونکہ اس وقت اس کا ذہن متضاد خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کچھ عرصے بعد یہ لڑکی بالکل ٹھیک ہو گئی اور بروئر کو اپنے اس نئے طریقہ میں کامیابی ہوئی۔ فرائڈ کو یہ طریقہ بہت پسند آیا اور اس نے اپنے مریضوں پر اس کا اطلاق شروع کر دیا۔ ۱۸۹۳ء میں دونوں نے مل کر ایک مضمون بعنوان "On the Psychical Mechanism of

(Hysterical Phenomena) شائع کرایا اور اس کے بعد ایک کتاب "Speel Studien über Hysterie" شائع ہوئی جس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ انسانی زندگی میں جذبات واحساسات کو اہم ترین مقام حاصل ہے اور دوسرے یہ کہ ذہن کے متعلق گفتگو کرتے وقت شعور اور لاشعور کی تقسیم ضروری ہے لیکن یہ نظریات بہر حال نامکمل تھے اور اس وجہ سے ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔

بروئر نے اپنے طریقہ کا نام "اسہال" (CATHARSIS) رکھا تھا اور یہ ہپناطیقیت اور ایما ذہ سے ایک اگلا قدم تھا۔ اس کے بعد اگلا قدم پھر فرائڈ نے رکھا جس کے بارے میں خود اسی کی یہ رائے ہے کہ ابھی میرے طریقے میں اضافے کے بہت امکانات باقی ہیں اور کافی گنجائش ہے یہ اگلا قدم کیسے اٹھایا گیا اسے فرائڈ نے اپنی سوانح حیات میں تفصیل سے بیان کیا ہے، جس کا ذکر ابھی آتا ہے کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد بروئر نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس کا سبب کچھ تو فرائڈ اور اس کے باہمی اختلافات تھے اور ایک اور اہم وجہ بھی تھی جسے ہم آگے بیان کریں گے۔ لیکن بروئر نے اسہال کا طریقہ معلوم کر کے فرائڈ کو آگے بڑھنے کا موقعہ بہم پہنچایا۔ یہ کچھ کام اسی قسم کا تھا جو لامارک (LAMARCK) وغیرہ ڈاردن (DARWIN) کے لئے کر گئے تھے۔ فرائڈ نے اس پر تحلیل نفسی کا اضافہ کر کے نفسیات اور دیگر شعبوں میں ایک عالم گیر انقلاب برپا کر دیا۔ وہ لکھتا ہے کہ مجھے اپنے سرعت سے بڑھتے ہوئے تجربات نے یہ بتایا کہ امراض کا سبب محض دبے ہوئے جذبات ہی نہیں ہیں بلکہ ان کی اصل نوعیت جنسی بھی ہے یعنی امراض کے پیچھے کچھ جنسی اسباب کام کر رہے ہیں۔ لیکن میں اس پر فی الحال کوئی فیصلہ کرنے کو تیار نہیں تھا۔

"سنہ ۱۹۱۴ء میں جب کہ میں تحلیل نفسی کی تاریخ مرتب کر رہا تھا میرے ذہن میں شارکو اور بروئر وغیرہ کے اشارات گھوم رہے تھے جو انھوں نے جنسیات کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے کئے تھے اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر ہیولوک ایلس (HAVELOCK ELLIS) کے مضامین سے میرے اس خیال کو اور بھی تقویت پہنچی اور میں نے اس مسئلہ کو اپنے مطالعہ کا محور بنا لیا"۔۔۔۔ گہرے مطالعہ

اور قریبی مشاہدے نے فرائڈ کو بتایا کہ مرضِ ضعفِ عصبی (NEURESTHENIA) کے پیچھے مرتا جنسی اسباب کثرتِ جلق، سرعتِ انزال، یا خواہشِ جنسی کو حد سے زیادہ دبائے رکھنا وغیرہ کام کرتے ہیں۔ اس سبب سے اس کو امراضِ ذہنی میں جنسی اسباب کی اہمیت کا سچا یقین ہو گیا اور اب اس نے اس پر برابر مضامین لکھنا شروع کئے، لیکن ان کا بجز ایک محدود حلقہ کے کہیں خیر مقدم نہیں ہوا۔ علاجِ ہپناطیقیت کی محدودیت اور اس تحقیق نے فرائڈ کو اس بات پر ابھارا کہ وہ اب کوئی ایسا طریقہ علاج دریافت کرے جو اول الذکر سے زیادہ موثر ثابت ہو۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کو ایک اور دقت پیش آئی اور یہ وہی تھی جس نے بروئر کو اس پیشے سے علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

بروئر جس نوجوان مریضہ کا علاج کر رہا تھا اس نے صحت مند ہونے کے بعد اپنے معالج سے اظہارِ عشق شروع کر دیا۔ جو برابر شدت اختیار کرتا گیا بروئر کے لئے یہ چیز سخت پریشان کن تھی اور بجائے اس کے کہ وہ اس کی تحقیق کرے وہ سرے سے اپنے پیشے ہی کو چھوڑ بیٹھا۔ فرائڈ نے اس واقعہ کو گہری نظر سے دیکھ لیا تھا اور کسی طرح بھی اس کو بے معنی نہیں سمجھا تھا۔ جس وقت خود فرائڈ کے ساتھ یہ ہوا تو وہ کمال دانش مندی سے اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ یہ عشق تمام تر مصنوعی ہے اور کسی پہلے فراموش کردہ عشق کا احیاء ہے جو (CATHARSIS) کے سبب سے شعوری سطح پر آکر اپنا اظہار کر رہا اور اب تک لاشعور کی تاریکیوں میں پنہاں تھا فرائڈ نے اس کا نام "منتقل شدہ محبت" (TRANSFERRED LOVE) رکھا یہ تحلیل نفسی میں ایک اہم ترین چیز ہے۔ اس دقت نے مزید اسے کوئی نیا طریقہ دریافت کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے علاوہ اگر کوئی اور ممکن صورت ہو سکتی تھی تو وہ یہی تھی کہ بجائے غفلت کے عالم بے داری میں "اسہال" کو عمل میں لایا جائے۔ اس خیال کے آتے ہی اس کا ذہن ایک ایسے واقعہ کی طرف پلٹا جو نانسی کے دوران قیام میں اس نے دیکھا تھا یہی وہ واقعہ ہے جس سے مدد لے کر فرائڈ نے فیصلہ کن قدم اٹھایا اور بالآخر وہ طریقہ معلوم کر لیا جسے ہم تحلیل نفسی کے نام سے جانتے ہیں ـــــ وہ واقعہ یہ تھا کہ برن ہائم کے بعض مریض ہپناطیقی کیفیت کے ختم ہونے کے بعد وہ تمام باتیں بھول جاتے تھے جو اس عالم میں وہ بیان کیا کرتے تھے۔ لیکن برن ہائم اس بات پر مصر تھا کہ یہ ساری باتیں

ان کے حافظہ میں موجود ہیں اور اس کا ان کو قطعاً شعور نہیں ہے لیکن اگر عالم بیداری میں پیہم اس بات پر زور دیا جائے کہ وہ ان کو بیان کریں اور نیز یہ کہ وہ سب باتیں دہرائی بھی جائیں تو ممکن ہے مریض کو یاد آجائیں اور وہ ان کو بیان کرنے لگے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ برن ہائم اس اہم ترین نقطہ کو نظر انداز کر گیا ورنہ اگر وہ اس بات پر تجربات شروع کر دیتا تو ممکن تھا تحلیل نفسی کا بانی بجائے فرائڈ کے برن ہائم ہوتا اور آسٹریا کے بجائے فرانس کو یہ سعادت نصیب ہوتی۔ مزید یہ کہ برن ہائم عرصے سے ہپناٹیقیت کا استعمال کر رہا تھا اور فرائڈ کی بہ نسبت وہ اس کے نشیب و فراز سے زیادہ واقف تھا اور لیبالٹ کے سارے تجربات اس کی آنکھوں کے سامنے تھے پھر بھی اس کی نظر اس پر نہ پڑ سکی۔ فرائڈ اس بات کو بھی اسی طرح سمجھ گیا جس طرح اس نے جنسی مسئلہ کو سمجھا تھا، یا بروئر کے معاملے میں جبلی اور مصنوعی عشق کو۔ اس خیال کے پیش نظر فرائڈ نے فوراً اپنا رخ بدل دیا اور برن ہائم کے اصول پر تجربات شروع کر دیئے یہ طریقہ "تحلیل نفسی" (PSYCHOANALYSIS) ہے۔ فرائڈ کا دستور یہ تھا کہ وہ مریض کو ایک نرم صوفے پر لٹا کر کہتا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے کر دے اور بالکل آرام سے لیٹے جائے۔ اس کے بعد جو کچھ خیال اس کے ذہن میں آئے وہ فوراً اسے زبان سے ادا کر دے، وہ خود اس طرح مریض کے پیچھے بیٹھ جاتا تھا کہ اس کی (مریض کی) نگاہ اس پر نہ پڑ سکے یہ تحلیل نفسی کی مخصوص تکنیک ہے۔ جسے فرائڈ برابر استعمال کرتا رہا۔ مریض کے ذہن سے نکلے ہوئے خیالات دراصل مرض کی تشخیص کا ذریعہ ہیں اس کے علاوہ وہ خواب جو مریض دیکھتا ہو ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اب غور یہ کرنا ہے کہ تحلیل نفسی کا اصل الاصول کیا ہے؟

سارے ذہنی امراض یعنی وہ جو نفسیاتی اسباب کی بنا پر رونما ہوتے ہیں ان دبی ہوئی خواہشات کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں جو لاشعور میں موجود رہتی ہیں اور کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ ان کی وجہ سے برابر ایک کشمکش جاری رہتی ہے جس سے انسان بالکل غافل ہوتا ہے کیونکہ وہ لاشعور میں واقع ہوتی ہے لیکن اس کے تباہ کن اثرات مستقل شعور پر پڑتے رہتے ہیں جس سے ذہنی صحت خراب رہتی ہے تحلیل نفسی سے چونکہ لاشعوری خیالات ابھر آتے ہیں اس لئے یہ کشمکش بھی شعوری سطح پر آجاتی ہے اور

انسان کو اس سے ختم کر دینے میں دقت نہیں ہوئی۔ اور اس طرح اس کے اثرات سے ذہن محفوظ ہو جاتا ہے۔ تحلیل نفسی کی اصطلاح در اصل ان تمام نظریات کے لئے استعمال ہوتی ہے جن کو فرائڈ نے طریقہ کو دریافت کر لینے کے بعد برابر پیش کرتا رہا۔ جن میں نظریہ لاشعور، جنس، خواب، اور نظریہ حیات و موت اہم ترین ہیں۔ لیکن ہم کو اس وقت انھیں پیش کرنا مقصود نہیں ہے۔

ان مختصر اشارات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تحلیل نفسی ہپناٹیقی ایجاد اور مسمرازم کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ اور کوئی اتفاقی چیز نہیں ہے۔ کیونکہ جس طرح نیوٹن کے لئے کوپرنیکس، کیپلر اور گلیلیو نے زمین ہموار کی اسی طرح فرائڈ کے لئے لیبالٹ، شارکو اور برن ہائم نے کی، فرائڈ نے بیشتر باتیں فرانس کے اسکولوں سے حاصل کیں اور ان پر اپنا ایک مخصوص نظام فکر تعمیر کیا۔ جو اوروں سے بالکل مختلف تھا۔ اور یہی اس کا اصل کارنامہ ہے اور نہ اگر وہ ہپناٹزم کے فرسودہ طریقہ پر قناعت کر لیتا تو غالباً جدید نفسیات نا سدہ اسی مقام پر ہوتی جس پر وہ مسمر کے زمانے میں تھی کیوں کہ پیرس اور نانسی کے اسکول جو اس کی ترقی کا باعث تھے آپس کی کشمکش سے ختم ہو چکے تھے اور ہپناٹزم کی بھی کوئی وقعت باقی نہ رہی تھی۔

تمدنی۔ ثقافتی۔ جغرافیائی۔ مذہبی اسباب جنھوں نے ہندی اسلامی فن تعمیر کے ارتقا میں حصہ لیا

از

(جناب ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی)

"یہ مختصر سا مقالہ دراصل ایک مستقل امتحانی سوال کا جواب بصورت کلاس لیکچر ہے۔ اور اسے بعض طلباء نے فوراً ضبط بھی کر لیا تھا اسے مفید سمجھ کر یہاں اسے اسی حالت میں پیش کیا جاتا ہے اگرچہ اس میں بعض جگہ تقدیم وتاخیر کی شکایت ضرور ہوگی مگر اس کی افادیت کو مدِ نظر رکھنا چاہیئے۔"

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اسلامی فنِ تعمیر اپنی روح کے لحاظ سے ایک حیرت انگیز عالم گیر وحدت کا حامل ہے اور اس کی چند امتیازی خصوصیات بلا لحاظ جغرافیائی و سیاسی اختلافات کے تمام اسلامی عمارات میں موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چین۔ ترکی۔ مصر۔ عراق۔ شام۔ ایران۔ افغانستان۔ ہندستان اور پاکستان کی اسلامی عمارات میں بعض چیزیں قدرِ مشترک کے طور پر پائی جاتی ہیں۔ جن کی بنا پر ہم صاف طور پر غیر اسلامی اور اسلامی عمارات میں امتیاز کرتے ہیں۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلامی فنِ تعمیر دنیا کے ہر حصہ میں ایک ہی ہے۔ اور مُسلم فن کاروں نے فنِ تعمیر کا ایک مخصوص سانچہ تیار کر لیا تھا جس کے مطابق وہ ہر جگہ لگے بندھے اصول پر عمارات تعمیر کرتے رہے بلکہ اس کے برعکس مسلم فن کاروں نے ہر جگہ کے مقامی حالات اور مذہبی۔ تمدنی ثقافتی اور جغرافیائی خصوصیات کے پیشِ نظر عمارات تعمیر کیں۔ مسلمانوں (بالخصوص عربوں) کو اس چیز میں کمال حاصل تھا کہ وہ اسباب دخل کے ساتھ بہت جلد مطابقت و ہم آہنگی پیدا کر لیتے تھے ان کی طبیعت میں ایسی جدت اور اپج تھی اور ان کی تخلیقی قوتیں اس قدر بیدار تھیں کہ وہ مختلف حالات و کوائف میں فوراً ایک

نئے تمدن۔ نئی تہذیب اور نئی ثقافت کی داغ بیل ڈال دیتے تھے جو وہاں کے مقامی اور مخصوص حالات سے پوری پوری مطابقت اور کامل سازگاری رکھتی تھی۔ یہی سبب ہے کہ سپین۔ ترکی۔ مصر۔ عراق شام۔ ایران۔ افغانستان۔ ہندستان اور پاکستان کی عمارات میں چند اصولوں کے اتحاد کے باوجود ظاہری اختلاف اور تنوع بھی موجود ہے۔ ہر جگہ کی عمارت اپنی مخصوص انفرادی و امتیازی خصوصیات رکھتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ کی اسلامی تعمیرات نے ایک نیا روپ لیا ہوا ہے اور وہی ہر جگہ ایک واحد طرز اسلامی میں جلوہ گر ہوا ہے۔ گویا عروسِ فنِ تعمیر اسلامی کی عشوہ طرازیاں۔ دلفریب ادائیں۔ دلربا ناز و ادا ہر جگہ اچھوتے اور نئے ہیں۔ جلووں کی بوقلمونی اور زرنگار رنگی طلسمات کا عالم پیدا کرتی ہے

اس لحاظ سے ہندی اسلامی فنِ تعمیر کا مطالعہ بالخصوص بے حد دلچسپ اور بصیرت افروز ہے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان اسباب و عوامل کا کھوج لگائیں جنہوں نے ہندی اسلامی فنِ تعمیر کے ارتقا میں مل جل کر حصہ لیا ہے زیرِ نظر مضمون میں ہم انھیں اسباب و عوامل سے بحث کریں گے۔

یوں تو ہندی اسلامی فنِ تعمیر کے ارتقا میں متعدد اسباب و عوارض نے مل جل کر حصہ لیا ہے لیکن ان میں حسبِ ذیل عوامل سب سے زیادہ اہم ہیں۔

(۱) تمدنی اسباب

(۲) ثقافتی اسباب

(۳) جغرافیائی اسباب

(۴) مذہبی اسباب

(۱) تمدّنی اسباب

مسلمان اس ملک میں فاتح کی حیثیت سے زیرِ قیادت محمد بن قاسم ۷۱۲ء کو داخل ہوئے وہ یہاں ایک مختلف دلپذیر و ارفع تمدن ہمراہ لائے تھے۔ لیکن ان کی نظر وسیع اور تعصبات سے بالاتر تھی انھوں نے فوراً دابل میں اپنے لئے ایک الگ محلہ وضع کر کے ایک مسجد بھی وہاں قائم کرلی تھی جو اس امر کی دلیل ہے کہ یہاں کی عمارات ان کی مرضی کے مطابق نہ تھیں۔ وہ بہت جلد یہاں کے

باشندوں سے گھل مل گئے۔ انہوں نے بہت جلد حاکم و محکوم کے امتیازات کو دور کر دیا انھوں نے ان کے رسم و رواج۔ رہن سہن۔ بود و باش کو نہایت قریب سے سمجھنے کی کوشش کی اور اس طرح ہند و سندھ سے اسلامی تمدن و ثقافت کے نفوذ کی آہستہ آہستہ ابتدا ہوئی جیسا کہ حاکم قومیں کیا کرتی ہیں۔ بے شمار لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہونے شروع ہوئے غرض کہ ایک حسین امتزاج بھی رونپذیر ہوا جسے بعض ہندی اسلامی تمدن کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی بدولت اس تمدن میں بے حد وسعت پیدا ہوتی گئی۔ مسلمان اس ملک میں بہت سی نئی چیزیں لے کر آئے تھے جن سے اس ملک کے باشندے ناآشنائے محض تھے۔ ان چیزوں کی بدولت یہاں کے فنِ تعمیر میں بالخصوص غیر معمولی وسعت پیدا ہوئی جس سے ہندو لوگ ناآشنائے محض تھے مثلاً

(۱) **حمام** ۔ اس ملک میں نہانے کے لئے حماموں کا قطعاً رواج نہ تھا۔ اس کے برعکس مسلمان بغداد۔ بصرہ۔ قاہرہ۔ قرطبہ اور دیگر اسلامی شہروں میں نہایت اعلیٰ سائنٹیفک اصولوں پر آرام دہ اور شاندار حمام بکثرت تعمیر کر چکے تھے۔ مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی یہاں بھی حماموں کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہو گیا اور رفتہ رفتہ اس نے اس قدر ترقی کی کہ ملک میں مختلف قسم کے لاتعداد حمام تعمیر ہو گئے۔ اس چیز نے ہندی اسلامی فن تعمیر کے فروغ و ارتقا میں بڑا حصہ لیا۔ عبد الرحیم خان خاناں ہندوؤں کے اس نعمت سے محروم ہونے پر تاسف کا اظہار کرتا ہے۔

(۲) **پردہ** ۔ اس ملک میں پردہ کا رواج نہ تھا لیکن مسلمانوں کے آنے کے بعد یہاں پردہ کا رواج ہو گیا۔ پہلے جو مکانات تعمیر کئے جاتے تھے ان میں پردہ کا لحاظ رکھنے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی مگر اب جو مکانات تعمیر ہونے شروع ہوئے ان میں پردہ کا خاص لحاظ و خیال رکھا گیا۔ اس طرح مکانات کی ساخت میں تبدیلیاں آئیں۔ اور اس طرز پر جو عمارات تعمیر ہوئیں انھوں نے ملک کے مجموعی فن تعمیر پر اپنا اثر کیا۔ اور اس طرح فن تعمیر ہندی اسلامی کے ارتقا میں بہت بڑا حصہ لیا۔

(۳) **صحن** ۔ پھر ہندو تنگ و تاریک صحن بنانے کے عادی تھے۔ ان کے مکانات کے کمرے بھی تاریک۔ غیر کشادہ اور گھٹواں ہوتے تھے۔ مسلمان جہاں زندگی کے ہر شعبے میں وسیع النظر اور

وسیع المشرب واقع ہوئے تھے ان کی عمارات بھی وسیع - فراخ - کھلی - ہوادار اور روشن ([illegible]) ہوتی تھیں اس چیز نے بھی یہاں کے فن تعمیر کے ارتقا پر اثر ڈالا - اور اب جو عمارات تعمیر ہوئیں ان میں وسیع دالان - فراخ کمرے - کشادہ صحن - روشنی اور ہوا کے لئے بہت سے دروازے اور کھڑکیاں تھیں ۔

(۴) **رفاہِ عامہ** - رفاہِ عامہ سے دلچسپی اسلامی تمدن کی ایک نمایاں خصوصیت ہے مسلمان سلاطین نے اس ملک میں بے شمار کنوئیں - سرائیں - تالاب - حوض - سڑکیں - بند پل - مدرسے کالج اور شہر تعمیر کرائے - بالخصوص فیروز شاہ تغلق اور شیر شاہ سوری نے تو اس سلسلہ میں بے مثال کارنامے انجام دئے - فیروز تغلق کے عہد میں بلدیت (Town Planning) نے بے حد فروغ حاصل کیا - اُس کے عہد میں بارہ ۱۲ سو نئے شہر تعمیر ہوئے - ان عمارات کی بدولت 'ہندی اسلامی فنِ تعمیر' نے بے حد ترقی کی -

(۲) ثقافتی اسباب

ثقافت یا کلچر ہمیشہ تصادم اور غلبہ کے بعد اپنے عمل کی ابتدا کرتی ہے - اسلامی ثقافت ہندوؤں کے تصادم اور ان پر غلبہ کے بعد یہاں معرضِ ظہور میں آئی - جب میدانِ جنگ سے فارغ ہو کر دونوں قومیں حاکم و محکوم کی حیثیت سے بزم آرائی کی طرف متوجہ ہوئیں تو ایک اسلامی ہندی ثقافت نے جنم لیا جس میں ہند و مقامی عنصر ضرور آیا - لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اسلامی ہندی ثقافت پر ہمیشہ زیادہ تر ایرانی ثقافت غالب رہی ہے - بلکہ آج بھی ہم جس ثقافت کو "اسلامی ثقافت" سے تعبیر کرتے ہیں - اس میں معتد بہ حصہ ایرانیوں ہی کا ہے - ابتدا میں اگرچہ عربوں کا اثر یہاں کی ثقافت پر غالب رہا جیسا کہ بلاذری بیان کرتا ہے کہ لوگ عربی بولتے تھے اور ان کے مطابق شہری زندگی گزارتے تھے لیکن عربی ممالک سے براہِ راست تعلقات فوراً اور جلد منقطع ہونے پر سلاطین غزنہ کے پے در پے حملوں کی وجہ سے ایران و توران کے اثرات بہت زیادہ ہو گئے اور اخیر تک برقرار رہے بلکہ وہی لوگ یہاں قابض ہو گئے اور وہی لوگ یہاں کھلے پھولے - بلکہ بعد میں ہمایوں کے زمانہ سے تو یہ اثر بہت ہی بڑھ گیا - اور زبان - ادب - تمدن - ثقافت - تصوف

حتیٰ کہ مذہب تک پر ایرانی اثر غالب آگیا۔ اس چیز کا اثر ہندی اسلامی فنِ تعمیر پر بھی پڑا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی عمارات مسجد قوت الاسلام۔ ڈھائی دن کا جھونپڑا۔ قطب مینار۔ علائی دروازہ وغیرہ میں عربی ایرانی اثر بہت غالب ہے۔ لیکن ہندی فن کاروں نے اس اثر کے سامنے ہتھیار نہیں ڈال دیے۔ بلکہ انھوں نے اپنی اس چابک دستی اور فن کاری کو جو دو ہزار ہا سال سے مندروں کی تعمیر میں صرف کر رہے تھے۔ نیز سنگ تراشی میں حیرت انگیز کمال اور پتھر میں نہایت نازک نفیس اور باریک کھدائی یا مینت کاری کی مہارت کو ان عمارات میں صرف کیا۔ چنانچہ ابتدائی اسلامی تعمیرات میں ہندی طرزِ تعمیر کے اثرات پہلو بہ پہلو ہندی اسلامی فنِ تعمیر کے ارتقا میں حصہ لیتے ہوئے نظر آتے ہیں کیونکہ ابتدا میں سامانِ عمارت کی تنگیاں ضرور تھیں مگر پھر بھی ان عمارات کے شاندار ایوان۔ عظیم الشان محرابیں پُراثر مینارانیاں۔ گھڑیا کمانیں جو خالص اسلامی اسلوب تھے اور ان کے ساتھ ساتھ نہایت نفیس سنگ تراشی بے حد نفیس و نازک کھدائی کا کام وغیرہ خوبیوں نے مل کر یہاں کے فنِ تعمیر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

(۲) ایرانی ثقافت کا اثر یہاں کی بعد کی عمارات پر نہایت نمایاں ہے۔ عمارات پر حسین و جمیل گل بوٹے۔ نفیس و نازک پودے اور بیلیں۔ گل دان۔ صراحیاں۔ گلاب دانیاں۔ پادڈر دانیاں۔ گلاس مشتر زے۔ نقاشی۔ گل کاری اور اس کے ساتھ ہی چمن بندی۔ خیاباں بندی۔ تمام ایرانی اثر کی غمازی کرتے ہیں۔ یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ جو علاقے ایران سے زیادہ قریب ہیں ان کی عمارات پر یہ اثر اور بھی زیادہ نمایاں ہے ملتان اور لاہور کی خشتی عمارات۔ ان میں رنگین کاشی کاری۔ ٹائل ورک۔ بکثرت پھول پتیاں اور نقش و نگار ایرانی ثقافت کے اثرات کو نمایاں کرتے ہیں۔

(۳) ایرانی اثرات کے ساتھ ہی ہندی ثقافت کے اثرات بھی پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔ اکبر کے عہد میں تو یہ اثرات اور بھی گہرے اور نمایاں ہوگئے ہیں۔ اس عہد کی عمارات میں رُفتی (Trabeated) اور کمانی (Arcuate) نظام کا امتزاج۔ دیوار گیریوں (Brackets) کا استعمال جو ہندی الاصل طرز پر عمارات کی تعمیر (بالخصوص فتح پور سیکری اور لاہور کے قلعہ کے محلات میں) علاوہ ازیں عہد اکبری کی اکثر عمارات میں ایک خاص نقش (Hamsa) پرندے کا استعمال۔ دیواری مصوری میں ہندی ماحول یہ تمام چیزیں

خالص ہندی اثر کو ظاہر کرتی ہیں۔

(۳) **ذوقِ جمالیات** ۔ جمالیاتی ذوق بھی اس ثقافت کی ایک نمایاں علامت تھی۔ یہاں کے سب مسلمان حکمران بالعموم اور مغل حکمران بالخصوص ذوقِ جمالیات کے حامل تھے۔ وہ قدرتی مناظر کے بھی بے حد شائق و دلدادہ تھے۔ اس کا اثر یہاں کی عمارات پر بھی پڑا۔ انھوں نے اکثر عمارات کے لئے نہایت حسین موزوں اور عمدہ محل وقوع منتخب کئے۔ شیر شاہ و دیگر بادشاہوں کے روضوں کی جھیل میں تعمیر۔ مانڈو کی اکثر عمارات میں بالخصوص ہنڈولہ محل۔ جہاز محل اور ہوا محل اپنے محل وقوع اور حسین قدرتی مناظر کے لحاظ سے دنیا کی تمام عمارات پر بازی لے گئی ہیں۔ اسی طرح دریائے جمنا کے کنارے لال قلعہ اور جامع مسجد دہلی کی تعمیر۔ دریائے راوی کے کنارے قلعہ لاہور۔ شاہی مسجد لاہور (پہلے دریائے راوی یہیں سے ہو کر گزرتا تھا) اور مقبرہ جہاں گیر کی تعمیر اور سب سے بڑھ کر تاج محل آگرہ کی دریائے جمنا کے کنارے پر تعمیر مغلوں کے اس ذوق کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ پھر عمارات کے ساتھ باغات کا بنانا بھی مغلوں کا ایک امتیازی وصف ہے اگرچہ اس کا رواج مغلوں سے قبل مسلمانوں میں ہو چکا تھا لیکن مغلوں نے اس کو بے حد ترقی دی۔ ہمایوں کا مقبرہ۔ جہاں گیر کا مقبرہ اور تاج محل آگرہ اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ علاوہ ازیں مغلوں نے اپنی عمارات میں حسین قدرتی مناظر اور سیر و شکار کے نظاروں کو ایسی خوبی کے ساتھ پیش کیا کہ آج بھی اُن کے ذوقِ جمالیات کی داد دینی پڑتی ہے۔

غرض کہ ان تمام چیزوں نے مل کر ثقافتی لحاظ سے بھی ہندی اسلامی فنِ تعمیر کے ارتقا میں جمالیات نے بہت بڑا حصہ لیا۔

(۳) جغرافیائی اسباب

جغرافیائی عوامل نے بھی ہندی اسلامی فنِ تعمیر کے ارتقا میں کچھ کم حصہ نہیں لیا۔ ملک کے مختلف حصوں میں مختلف جغرافیائی حالات و کوائف کے ماتحت مختلف قسم کے "دبستان ہائے فنِ تعمیر" ظہور میں آئے۔ جن میں سے مشہور یہ ہیں۔

(۱) پنجاب کا دبستانِ فنِ تعمیر۔ اس کے پھر دو حصے ہیں۔

(الف) دبستانِ ملتان

(ب) دبستانِ لاہور

(۲) سندھ کا دبستانِ فنِ تعمیر

(۳) دکن میں عمارات سلاطین بہمنی جو گلبرگہ ۔ دولت آباد ۔ بیدر میں بے شمار ہیں۔ ان کے بعد احمد نگر ۔ بیجاپور ۔ گولکنڈہ کا دبستانِ فنِ تعمیر

(۴) گجرات کا دبستانِ فنِ تعمیر

(۵) احمد آباد " " " "

(۶) مشرقی سلاطینِ بہار کا دبستانِ فنِ تعمیر

(۷) خاندیش کی عمارات جو عماد شاہی وغیرہ خاندانوں کی عمارات ہیں۔

(۸) مانڈو اور دہار کا دبستانِ فنِ تعمیر

(۹) کشمیر کا دبستانِ فنِ تعمیر

(۱۰) راجپوتانہ کا دبستانِ فنِ تعمیر

(۱۱) دہلی میں ابتدائی اسلامی۔ اس کے بعد عہد علائی اور تغلق و سادات و لودھی خاندانوں کی عمارات خاص امتیاز رکھتی ہیں۔

(۱۲) مغل جس میں اکبر کا خاص انداز آگرہ میں اکبر و جہانگیر اور سب سے بڑھ کر شاہجہاں کی عمارات ایک امتیاز رکھتی ہیں۔

(۱۳) بنگال کا دبستانِ فنِ تعمیر

ان متنوع و مختلف دبستان ہائے فنِ تعمیر نے ہندی اسلامی فنِ تعمیر کے ارتقا میں گراں قدر حصہ لیا مسٹر فرگسن نے ان کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں انتہا درجہ تنوع ۔ وسعت ۔ لچک اور نفاست پیدا کر دی۔ جس علاقہ میں جس قسم کی آب و ہوا تھی وہاں اسی کے مطابق عمارات تعمیر کی گئیں مثلاً بنگال میں بارش کی بے حد کثرت تھی۔ جس کے سامنے معمولی قسم کی چھتیں نہیں ٹھہر سکتی

تھیں۔ لہذا وہاں کی عمارات میں ہمیں ایک مخصوص قسم کی چھت نظر آتی ہے۔ جس کو اس قدر شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس کا نام ہی بنگالی چھت پڑ گیا ملک کے دوسرے حصوں میں بھی اس سے استفادہ کیا گیا۔ مثلاً قلعہ لاہور میں عمارت نولکھا اور بیگم پورہ (لاہور) میں محمد شاہی دور کی مسجد زکریا خاں" میں بنگالی چھت کا استعمال کیا گیا ہے علاوہ ازیں بنگال میں بارش کی کثرت کے باعث معمولی آثار کی عمارات نہیں ٹھہر سکتی تھیں۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں کی عمارات کے آثار نہایت بھاری بھرکم اور سنگین ہیں جس سے ان میں نزاکت مفقود ہے گور و پنڈوا کی تمام مساجد مثلاً آدینہ مسجد۔ سونا جامع مسجد وغیرہ میں دیواروں کے آثار بہت بھاری بھرکم اور پُر شکوہ ہیں۔ اسی طرح ملتان میں انتہائی شدید گرمی پڑتی ہے وہاں کی مٹی بہت کمزور ہے۔ لہذا سنگینی و استحکام حاصل کرنے نیز موسم کی شدت سے محفوظ رہنے کی خاطر وہاں بھی سنگین اور بھاری بھرکم عمارات تعمیر کی گئیں نیز وہاں کی عمارات کی زمین کی خرابی کی وجہ سے ڈھلواں (Slopes) دیواریں حضرت رکن عالم کے مقبرہ میں استعمال کی گئیں۔ نیز وہاں کی عمارات کی دیواریں نیچے کی طرف سے زیادہ موٹی ہیں اور اوپر کی طرف کم موٹی ہوتی جاتی ہیں۔ یہ طرز ملک کے دوسرے حصوں میں بھی مثلاً دہلی میں محمد تغلق کی عمارات میں نظر آتا ہے۔ اور اس طرح فن تعمیر کے ارتقا کا باعث ہوا اور یہ ڈھلوان دیواریں عہد تغلق تک محدود رہیں۔

بعض مقامات پر قدرتی طور پر نہایت عمدہ محل وقوع (Situation) میسر آیا۔ مثلاً مانڈو کی عمارات اپنے قدرتی ماحول اور دلکش مناظر کے لحاظ سے ملک کی تمام عمارات پر فوقیت لے گئیں ملک کے دوسرے حصوں مثلاً دہلی۔ آگرہ اور لاہور وغیرہ میں بھی یہ فضا اور ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ جس سے "ہندی اسلامی فن تعمیر" کے ارتقا میں بہت بڑی مدد ملی۔

پھر یہ کہ مختلف علاقوں میں مختلف قسم کا عماراتی مصالحہ (Building Material) ملتا تھا۔ اس لئے یہ ناگزیر تھا کہ اس بنا پر عمارات کے طرزِ تعمیر میں اختلاف و اختلاط ضرور ہوتا۔ اسی بنا پر ہم پنجاب اور راجپوتانہ کے طرزِ تعمیر اور عمارات میں زبردست اختلاف پاتے ہیں۔ پنجاب کے

میدانوں میں پتھر نایاب تھا۔ اس لئے وہاں خشتی طرزِ تعمیر مقبول ہوا۔ ملتان میں مقبرہ رکن عالم مقبرہ بہاء الحق اسی طرح لاہور میں مسجد وزیر خاں۔ قلعہ لاہور اس کی نمایاں مثالیں ہیں اس کے مقابلہ میں راجپوتانہ اور مرکز میں پتھر کافی اور بآسانی دستیاب ہوتا تھا جس کی شہادت فتح پور سیکری کا تمام ماحول ہے اور کئی کوسوں تک سرخ پتھر میسر آتا ہے اسی طرح مکرانہ سے سنگ مرمر مہیا کیا جاتا ہے اس لئے وہاں کی عمارت میں پتھر بکثرت استعمال کیا گیا۔ بالخصوص اکبر کے دور میں ان علاقوں میں نہایت کثرت سے سنگ سرخ کی عمارات تعمیر ہوئیں اور شاہ جہاں کے عہد میں سنگِ سفید کی فتح پور سیکری کی تمام عمارات اور محلات سنگ سرخ میں غرق ہیں۔ اسی طرح دہلی کی جامع مسجد۔ موتی مسجد لال قلعہ آگرہ میں تاج محل آگرہ اس طرز کی بہترین مثالیں ہیں۔ جس میں اس طرزِ تعمیر کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔

علاوہ ازیں جو مقامات مرکز سے زیادہ قریب تھے وہاں کے طرزِ تعمیر پر مرکز کا اتباع غالب ہے اور جو دور ہیں وہاں یہ اثر بہت کم ہے۔ اسی طرح شمالی ہند بالخصوص پنجاب اور ملتان چونکہ ایران سے نہایت قریب تھے اور ان میں جغرافیائی وحدت بھی موجود تھی۔ اس لئے ان علاقوں میں ایرانی طرزِ تعمیر بے حد مقبول ہوا۔ ملتان کی خشتی عمارات اور ان میں رنگین ٹائل ورک کا استعمال اس کی بین مثالیں ہیں۔ بلکہ یہ فن کاری تمام سندھ میں بھی رائج ہے۔ اسی طرح لاہور کی اکثر عمارات۔ خاص طور پر سب سے اعلیٰ اور ایرانی طرز کی بہترین عمارت مسجد وزیر خاں ہے۔ جو تمام تر خشتی طرز پر تعمیر ہوئی ہے اور نہایت کثرت سے اور بہترین کاشی کاری کی گئی ہے۔ رنگ و روغن کا ایک طوفان برپا ہے۔ اس کے علاوہ بہترین گل بوٹے۔ نہایت نفیس و نازک نقش و نگار نہ ختم ہونے والا صراحیوں۔ گلدانوں۔ پودوں۔ بیلوں اور پھولوں کا سلسلہ ایرانی اثر کی پوری پوری غمازی کرتا ہے۔

مذکورہ بالا جغرافیائی اسباب و عوامل کی بنا پر ہندی اسلامی فن تعمیر میں بے پناہ وسعت اور لامحدود تنوع پیدا ہو گیا۔ اور اس طرح اس فنِ تعمیر کی کامیابی و ترقی کا سکوپ بڑھتا چلا گیا اور مقامی آب و ہوا کو بھی ضرور مدِ نظر رکھا گیا۔

(۴) مذہبی اسباب

مذہبی عوامل نے ہندی اسلامی فن تعمیر کے ارتقا میں جو حصہ لیا ہے وہ دیگر تمام عوامل سے بڑھ کر ہے مسلمانوں کی عمارات میں بقول پرسی براؤن "مسجد کو جو حیثیت حاصل ہے وہ گویا مفتاح اعظم کی حیثیت حاصل رہی ہے" اور ہر مسلمان غریب سے لے کر بادشاہ تک مسجد کو بہترین عمارت بنانے کی کوشش وسعی کرتا رہا ہے مسجد کے متعلق قرآن حکیم کے ارشادات اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث نیز آپ کا طرز عمل تمام مسلمانوں کے لئے محرک ثابت ہوا بقول مولانا شبلی نعمانی

ہجرت کے بعد آپ نے پہلا کیا جو کام تعمیر سجدہ گاہ خدائے امام تھا

مسجد نبوی کی تعمیر میں آنحضرت نے بہ نفس نفیس حصہ لیا۔ خود گارا اٹھایا۔ خود پتھر کاٹے۔ آپ کا جسم اطہر گرد وغبار سے آلودہ ہو جاتا تھا۔ اس چیز نے مسلمانوں کے دلوں میں مسجد کی تعمیر کے لئے بے پناہ عشق پیدا کر دیا۔ مثلاً اندلس میں مسجد قرطبہ کی تعمیر میں مسلمان حکمرانوں نے پشت ہا پشت تک تعمیر کا سلسلہ جاری رکھا۔ لکھی خزانوں کے منہ کھول دئے۔ اسی طرح ولید بن عبد الملک نے جامع مسجد دمشق کی تعمیر کی مسجد نبوی کی تجدید۔ توسیع اور تزئین کرائی۔ بیت المقدس میں نہایت عظیم الشان مسجد بنوائی۔ علاوہ ازیں بیسیوں دیگر مساجد تعمیر کیں۔ اور ان میں جس دریا دلی سے روپیہ خرچ کیا وہ آج تک یادگار ہے۔ اسی طرح مصر۔ قیروان۔ شام۔ عراق۔ افغانستان۔ ایران۔ ترکی میں بھی نہایت بلند پایہ اور بے مثال مساجد تعمیر کیں۔

ہندستان میں مسلمانوں نے قدم جمتے ہی مساجد کی تعمیر شروع کر دی۔ ابتدائی مساجد مغربی سواحل ہند اور سندھ میں تعمیر ہوئیں۔ لیکن ان کی صحیح تاریخ دستیاب نہیں۔

مگر جنوبی ساحل پر اب بھی ملبار مقام بھٹکل میں قدیم ترین مسجد موجود ہے جس پر کتبہ ذیل ہے:۔

"اسمعیل۔ مالک ۱۰۹۔ بن دینار" تین سطور میں قائم ہے ملکہ کولم اور دیگر مقامات ملبار میں اب بھی مساجد مالک بن دینار کے نام سے مشہور ہیں۔ اور کھنبایت بندر میں قاضی واڑہ میں مسجد صدر اول یعنی اول صدی کی تعمیر شدہ اب بھی مشہور ہے اگرچہ موجودہ وہ نہیں ہے۔ اور نہ ان میں کوئی اصل حالت میں پورے طور پر موجود ہے۔ اسلامی ہند میں مساجد کی اصل تاریخ مسجد قوت الاسلام سے شروع

ہوتی ہے۔ جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے اس مسجد کی تعمیر کا مقصد کفار پر قوت و عظمتِ اسلام کا اظہار تھا اور یہ حقیقت ہے کہ اس مسجد کی عظیم الشان محرابیں۔ یادگاری نوعیت کی ہیں اور اسی کے ساتھ علائی دروازہ جس کی اعلیٰ گھڑ یا کمانیں۔ پُر شکوہ پیشانی۔ نہایت نفیس و نازک (پتھر میں کندہ) نقش و نگار وغیرہ خوبیاں اس عمارت کو دنیا کی تمام عمارات میں نہایت بلند مقام پر جگہ دیتی ہیں پھر اس کے ساتھ ہی دُنیا کا سب سے بلند اور عظیم الشان ماذنہ (قطب مینار) ہے اور جو خود ایک مستقل عمارت ہے تو اس کی عظمت و شوکت میں اور بھی چار چاند لگا دیئے ہیں۔

اس کے بعد ملک کے مختلف حصّوں میں مسلمان عظیم الشان مساجد اور عیدگاہیں تعمیر کرتے رہے اور ہر مابعد کی مسجد ہر ماقبل کی مسجد کے مقابلہ میں ہر لحاظ سے بڑھی ہوئی ہے۔ ہر مابعد کی مسجد میں محراب گنبد۔ کمانیں۔ مینار۔ ایوان۔ پیشانی غرضیکہ ہر چیز پہلے کے مقابلہ میں بے حد ترقی یافتہ ہے۔ اگر ہمارے سامنے اہم مساجد ہند۔ قوت الاسلام۔ اجمیر کی مسجد۔ عہد تغلق و لودھی کی مساجد۔ فتح پور سیکری کی جامع مسجد۔ جامع مسجد دہلی۔ اور پھر شاہی مسجد لاہور موجود ہوں تو یقیناً ایک ہی نظر میں یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ کیا بلحاظ ٹیکنیک۔ کیا بلحاظ نزاکت و نفاست فن کیا بلحاظ عظمت و شان اور کیا بلحاظ گنبد و محراب اور کیا بلحاظ تعمیری پختگی کے ہر بعد والی مسجد عموماً پہلی مسجد سے بڑھ کر ہے۔ گنبد کا جو ارتقاء ابتدائی مساجد سے شروع ہوتا ہے۔ شاہی مسجد لاہور میں اس کی معراج دیکھی جا سکتی ہے۔

غرضیکہ مساجد کی بدولت ہندی اسلامی فن تعمیر کو بے انتہا فروغ اور ارتقا حاصل ہوا یہاں تک ترقی کی کہ یہیں مساجد کے ہمراہ مدارس۔ کالج۔ یونیورسٹیاں قائم ہوئیں جس کی مثال بہترین غزنی کی مسجد محمود غزنوی دی جا سکتی ہے۔

(۲) **مقابر**۔ تعمیری عوامل میں مقابر کی تعمیر نے بھی نمایاں حصّہ لیا ہے اور یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ہندستان میں مقابر کی تعمیر نے وہ فروغ حاصل کیا جو دنیا بھر میں بے مثال ہے جبکہ مسلمانوں سے قبل قبور کا رواج ہی نہ تھا اور یہ نوع تعمیری ان کے آنے پر رائج ہوئی۔ عہد تغلق و لودھی کے مقبرے ان کے بعد نہایت حسین و جمیل شیر شاہ اور سلیم شاہ کے روضے۔ پھر اکبر کا مقبرہ۔ جہاں گیر

کامقبرہ۔ اور ان سب کے بعد ممتاز محل کا مقبرہ آگرہ میں جس کو دنیا "تاج" کے نام سے موسوم کرتی ہے صرف دنیا بھر کے مقابر ہی کا سرتاج نہیں بلکہ دنیا بھر کی تمام عمارات کا سرتاج ہے۔ یہ مقابر ایرانی اسلامی فنِ تعمیر کے ارتقاء کی ایسی منہ بولتی تصویر پیش کرتے ہیں جس کے سامنے دنیا کی دوسری عمارات ہیچ ہو کر رہ جاتی ہیں۔

اس ضمن میں امام باڑوں کا ذکر بھی غالباً بے محل نہ ہوگا۔ بالخصوص دکن میں جو عاشور خانے تعمیر ہوئے انھوں نے بھی فنِ تعمیر کے ارتقاء میں کافی حصہ لیا اور یہ بھی مذہبی بنا پر ہوئے اور اس سے قبل نہ تھے ان میں حیدرآباد کا بادشاہی عاشور خانہ قابلِ ذکر ہے یہ سالار جنگ کی ڈیوڑی کے قریب ہے اور اسے عبداللہ قطب شاہ نے ۱۰۰۰ھ میں بنوایا تھا اس طرح وہاں کی عمارت چار مینار بھی قابلِ ذکر ہے۔

اسی طرح خانقاہوں کی تعمیر نے بھی ہندی اسلامی فنِ تعمیر کے ارتقاء اور فروغ میں اہم حصہ لیا ہے مسلمان مساجد کے ساتھ بالعموم خانقاہیں تعمیر کرتے تھے جنھیں دراصل تہذیبی ادارے کہنا بجا ہوگا۔ خانقاہ اور مساجد بہترین نمونۂ فنِ تعمیر پیش کرتے تھے۔ یہ چیزیں بھی فن کی ترقی میں ممد ہوئیں

نتیجہ

غرضیکہ ان تمام اسباب و عوامل (جغرافیائی۔ مذہبی۔ تمدنی۔ ثقافتی) نے دیگر عوامل کے ساتھ مل جل کر ہندی اسلامی فنِ تعمیر کے ارتقاء میں حصہ لیا ہے اور یہ بات بے خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ برِ عظیم ہند و پاکستان میں انڈو مسلم (Indo Muslim - Saracenic) فنِ تعمیر نے وہ عروج و فروغ حاصل کیا جس کو فنِ تعمیر کی دنیا میں معراج الکمال (climax) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے یہ فنِ تعمیر کیا بلحاظ عظمت و شان کیا بلحاظ سنگین و استحکام۔ کیا بلحاظ پختگی و تجربہ اور کیا بلحاظ اصولِ فن دنیا کی تمام عمارات پر فائق ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندستان میں ہندی اسلامی فنِ تعمیر کے ظہور میں آنے سے قبل مسلم فنِ تعمیر مختلف تجرباتی مراحل و مدارج میں سے گذر چکا تھا اور مسلم فنِ تعمیر کی تمام امتیازی خصوصیات مثلاً محراب نما کمانیں۔ مقرنسی کمانیں۔ گنبد۔ خالص کمانی نظام وغیرہ نہ صرف معرضِ وجود میں آ چکے تھے بلکہ تجرباتی مراحل طے کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ مسلم سلاطین کی سرپرستی فن۔ دیسی کاریگروں کی قدردانی اور حوصلہ افزائی۔ مال و دولت کی فراوانی اور ملکی امن و خوش حالی نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا اور ایسی حیرت انگیز اور لاثانی عمارات معرضِ وجود میں آئیں جن کے سامنے دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ عمارات بے قدر و قیمت نظر آتی ہیں۔

نیکی و بدی؟

از

(میر ولایت علی صاحب حیدرآباد دکن)

ہر کس نہ شناسندۂ راز است و گر نہ ۔ اینہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

دنیا میں جتنے کام ہو رہے ہیں وہ تمام کام صرف نیکی یا صرف بدی ہی نہیں ہیں۔ بلکہ بہت سے کام نیکی یا بدی کے صرف مقدمات ہیں۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ ان کا صحیح استعمال نیکی اور غلط استعمال بدی کا مقدمہ بن جاتا ہے۔ نیکی و بدی کی ایک سیدھی سادی تعریف یہ ہے کہ :-

"ہر وہ کام جو قیام امن و ترقی کے لئے ہے وہ نیکی ہے اور ہر وہ کام جس سے امن میں خلل پڑے یا ارتقائے انسانیت میں رکاوٹ ہو وہ بدی ہے۔"

مثلاً امانت، دیانت، احسان و امداد وغیرہ بالذات نیکی ہیں اور قتل، چوری، دغابازی، و حرام کاری وغیرہ بالذات بدی ہیں۔ مقدمات و متعلقات کی تعریف یہ ہے کہ وہ کام جو اگرچہ بذاتِ خود امن افزا ہوں نہ امن سوز مگر بالآخر ان کا انجام امن یا خلل ہو۔ شریعت کی زبان میں انھیں حلال۔ حرام، مباح مکروہ، جائز، ناجائز، واجب و نفل وغیرہ کہا جاتا ہے۔ صاحبانِ شریعت کی نگاہ بڑی دور رس ہوتی ہے اس لئے ان کاموں کو جو نیکی پر منتج ہونے والے ہوتے ہیں۔ لازم قرار دیتے ہیں اور جو کام نقصان کی طرف لے جانے والے ہوتے ہیں ان سے منع کر دیتے ہیں، گو وہ بذاتہ اچھے یا بُرے نہیں ہوتے۔ مثلاً عقائد، نماز، روزہ، حج وغیرہ۔ انسان کو نیک بنانے کے ذرائع ہیں اس لئے یہ لازم قرار دئے گئے ہیں۔ اور بدکاروں سے میل جول، بدکرداروں کی صحبت، ظالموں سے دوستی، غیر محرموں سے ہنسی دل لگی شراب، جوا، ناچ، رنگ، گانا بجانا وغیرہ بدی کی طرف لے جانے والے اسباب ہیں اس لئے ان سے منع کیا گیا ہے۔ وضاحتِ مفہوم کے لئے چند مثالیں درجِ ذیل ہیں۔

(۱) "نماز" یعنے کسی خاص طرف منہ کرنا اور کسی مخصوص طریقہ پر خدا کو یاد کرنا۔ یہ کام فی نفسہٖ نیکی نہیں ہے بلکہ نیکی پر پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ خود واضع نے اس کا مقصد واضح کر دیا ہے کہ "نماز بے حیائی اور نفاق وغیرہ بُرے کاموں سے روکتی ہے۔" اور اس کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ اگر نماز سے مقصدِ نماز پورا نہ ہو یتیموں و مسکینوں سے ہمدردی کے جذبات اُجاگر نہ ہوں تو ایسی نمازیں محض ایک دھوکہ دکھاوا ہیں۔ یہ اللہ کی عبادت نہیں بلکہ آبائی رسم کی عادت ہے۔ ایسے نمازیوں کے لئے ویل مقدر ہے۔ بجائے فلاح پانے کے اُلٹے نقصان پاتے ہیں۔ دیکھ لیجئے کہ دنیا میں ایسا ہی ہو رہا ہے کہ نہیں؟

(۲) "روزہ" ایک مخصوص طریقہ کا فاقہ۔ اس سے محض بھوک کی تکلیف دینا مقصود نہیں ہے بلکہ جسمانیت میں مست رہنے والے انسان کی توجہ روح کی طرف پھیر کر جذبات ہمدردی و اعانت کی تربیت کرنا ہے۔ اسی لئے اس کو لازم قرار دیتے ہوئے "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" فرمایا گیا ہے پس روزہ بھی کسی نیکی کی تیاری ہے۔ اگر روزہ دار مقصد روزہ کو پورا نہ کرے تو ظاہر ہے کہ وہ ایک ایسا فعل ہوگا جیسے کسی جانور کا منہ بند کر دیا جائے۔

(۳) "حج" مرکزی مقام پر سالانہ اجتماع کا نام ہے۔ ایک ہی مقام پر بہ یک وقت جمع ہو کر امیر جماعت کی ہدایات حاصل کرنا بے شمار فوائد کا حامل ہے۔ قیام کعبہ کی غرض ہی ھُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ کہی گئی اور اس سفر میں چند اصولوں کی عملی تعلیم (ٹریننگ) اور مختلف فوائد کے تذکرہ کے باوجود "خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى" بھی فرمایا گیا ہے۔ گویا اس چھوٹے سے سفر سے میل، ملاپ، محبت و ہمدردی کے جذبات کو بیدار کر کے آخرت کے بڑے سفر کے لئے توشہ تیار کرانا ہے۔ اگر اس سے رفتار زندگی درست اور عاقبت کا توشہ تیار نہ ہو یعنی حاجی سے پاجی پن نہ چھوٹے تو ایسا رسمی حج سوائے تضیع اوقات و نقصان رقم کے اور کیا ہے۔ (حج کی عملی تعلیم کی وضاحت مطلوب ہو تو میری کتاب اسلامی تعلیمات میں مضمون "تاثرات حج" ملاحظہ ہو جو ادارۂ علمیہ اعظم پورہ سے مل سکتی ہے)

(۴) "قربانی" بطریقہ مخصوص بہ تعین ایام ذبیحہ جانور کا نام ہے اس کا تذکرہ احکام حج کے ساتھ آیا ہے۔ اور صاف وصریح طور پر کہہ دیا گیا ہے کہ قربانی کا گوشت اور خون خدا کو نہیں پہنچتا اس کا مقصد

تو تمہارے اندر نیکی کے جذبات کو ابھارتا ہے۔ اگر کسی کام سے اس کا مقصد پورا نہ ہو تو وہ محض ایک فعل عبث ہے۔

(۵) "زکوٰۃ" یہ اسلامی سلطنت کا مخصوص ٹیکس ہے جو بیت المال یعنے خزانہ میں جمع کر کے فقراء و مساکین کی ضروریات اور سلطنت کے استحکام و تحفظ کے لئے صرف کیا جاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ حکومت امن و سلامتی کے تحفظ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اس لئے اس کا استحکام بھی شدید ترین ضرورت ہے اگر کوئی حکومت امن و سکون برقرار رکھنے کی صلاحیت کھو دے تو وہ بلا رو رعایت فوراً بدکاروں سے چھین کر نیکوں کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ غرض نفس زکوٰۃ بھی جو انفرادی حیثیت کی حامل بن جائے فی نفسہٖ نیکی نہیں ہے[1]۔ بلکہ اجتماعی نیکی کا ذریعہ ہے۔ اس سے بھی اگر اجتماعی مفاد کا کام نہیں لیا گیا تو شیرازۂ قومی کی ابتری و پراگندگی روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

(۶) "پردہ" تحفظ عصمت و عفت کا ذریعہ ہے۔ محض بے پردگی فی نفسہٖ کوئی بدی نہیں ہے ہر بے پردہ عورت کو بے عصمت نہیں کہا جا سکتا۔ ہزارہا بے پردہ عورتیں ایسی ہیں جو تحفظ عصمت کے ساتھ سماجی کاموں میں مردوں کا ہاتھ بٹا کر انسانیت کی ترقی کا موجب ہوتی ہیں۔ ان سے تو مردوں کو سبق لینا چاہیئے کہ وہ صنفِ نازک ہو کر بھی صنفِ قوی کو کارزارِ حیات میں پیچھے ڈھکیل رہی ہیں۔ —— پردہ کا ایک دوسرا رخ یہ ہے کہ خاندان کے یا بزرگانہ سلسلہ کے بہت سے ایسے لوگوں کے سامنے پردہ کرایا جاتا ہے جن سے بے پردہ ہونا فقہاً جائز نہیں ہے۔ خرابی کی جڑ اکثر یہی ہوا کرتا ہے۔ ظاہر کچھ اور باطن کچھ کے منافقانہ افعال ہی بہت زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ تیسری اور اہم ترین بات یہ ہے کہ رب العٰلمین نے عالم کی تمام عورتوں کو پردہ کرنے کا حکم ہی نہیں دیا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ ناممکن العمل ہے دنیا اپنے اپنے رواج و مصالح پر چل رہی ہے۔ اس کے اسی طرح چلنے میں کوئی ہرج نہیں ہے اس میں خواہ مخواہ دو فریق بن کر اپنے رواج کو حلال اور دوسرے کے رواج کو حرام قرار دینا بزدلوں کا کام نہیں ہے۔ اس سے انھیں پرہیز کرنا چاہیئے[2]۔

(۷) "ناچ رنگ گانا بجانا وغیرہ" یہ فی نفسہٖ بدی نہیں ہیں صرف کھیل تماشے اور محنت سے

---

[1] یہ تعبیر وضاحت طلب اور قابل غور ہے۔ [2] یہ تشریح بھی بحث طلب ہے اس کے لئے دوسری محتاط تعبیریں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ (ع)

تھکے ہوئے دماغوں کے لئے موجب تفریح ہیں۔ یہ افعال جب تک تفریح کے حدود میں رہیں درگزر کے لائق ہو سکتے ہیں مگر جب اپنے حدود سے آگے بڑھ کر سفلی جذبات کو بھڑکانے کا وسیلہ بن جائے ہیں تو ان سے روکنا ضروری ہو جاتا ہے یہ خیال کہ قوت ارادی پر قابو رکھنے والے سمجھدار لوگ اس امتناع سے مستثنیٰ ہونے چاہئیں اس لئے درست نہیں ہو سکتا کہ ناواقف لوگ تو اپنے نفس کے خواہشات کی تکمیل کے لئے انہی بڑے لوگوں کے اعمال کو اپنے لئے نمونہ سمجھتے اور سند جواز حاصل کرتے ہیں۔ دیکھ لیجئے کہ محتاط بزرگوں نے مجالس نعت کو صرف اپنے لئے ایجاد کر کے کیسی کیسی سخت سے سخت پابندیاں عاید کی ہیں مگر آج اس کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ ہر شیطان تھوڑی دیر کے لئے فرشتے بن جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر تلبیس اور کیا ہو سکتی ہے کہ جلوت میں تسبیح و تقدیس کا مجسمہ نظر آئے اور خلوت میں وہ سب کچھ کرے جس پر خود اس کا ایمان آنسو بہائے۔

(۴) پتھر کی مورت کو کوکو لگانا۔ قبر پر صندل ملنا۔ علم پر گلاب چھڑکنا۔ تصویر پر پھول چڑھانا۔ وغیرہ وغیرہ فی نفسہٖ نیکی یا بدی نہیں ہیں۔ یہ کام ہو سکتا ہے کہ کسی اچھے تصور کے تحت رائج کئے گئے ہوں مگر ظاہر ہے کہ انسانوں کے مقرر کردہ سب طریقوں کا انجام خراب ہی ہوا کرتا ہے۔ عوام الناس ان ذرائع کو بالذات نیکی سمجھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ کچھ نیک کام تو کر لئے ہیں اور دوسرے واقعی نیک کاموں سے مجرمانہ چشم پوشی کر لیتے ہیں۔ نہیں بلکہ ان مفروضہ نیکیوں کو اپنے جرائم کا بدل بھی تصور کر لیتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ امت کی بہت بڑی اکثریت فرائض مذہبی سے بے پروا ہو کر مذہب ہی کے مقدس نام پر اپنے مفروضات کے لئے ایسی شدت پیدا کر لیتی ہے کہ فساد و خونریزی کے اکھاڑے بن جاتے ہیں۔ اب کون سمجھائے کہ فساد فی نفسہٖ بدی ہے اس سے بچو۔

مذکورۂ بالا چند امور کے رازہائے سربستہ کو اس لئے کھولا گیا ہے کہ انہی اصول پر تمام مسائل حیات کو جانچا جائے کہ نیکی اصالتاً کیا ہے جس کو بہر حال کرنا ہے۔ اور بدی اصالتاً کیا ہے جس کو بہر حال چھوڑنا ہے اور درمیانی کام کیا ہیں کہ انھیں وقتی اور ضمنی اعمال مان کر چشم پوشی کیا کریں اس سے فتنہ و فساد کے سارے دروازے بند ہو جائیں گے۔

اللہ پاک نے انسان کو اچھا جسم اور اچھا علم عطا فرمایا ہے مگر اس میں سب برابر نہیں ہیں تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ اس کے ہزارہا درجے قایم ہو سکتے ہیں۔ ہم باریکیوں میں الجھے بغیر اس کی دو موٹی موٹی قسمیں قرار دے سکتے ہیں۔ ایک صاحبانِ جسم اور دوسرے صاحبانِ علم قرآن نے حضرت طالوت کی فضیلت اس طرح تبلائی ہے کہ انھیں علم و جسم دونوں میں کشادگی بخشی گئی تھی اور حضرت آدم کی فضیلت اسماء یعنی حقائق اشیاء کی معرفت سے ظاہر فرمائی گئی ہے اور حضرت ذوالقرنین کو جب جسمانی طاقت کی ضرورت ہوئی تو انھوں نے قوم سے قوت اور محنت کا مطالبہ کیا اور اس سے سدِ سکندری قائم کردی وغیرہ۔ پس آج بھی ان گذشتہ واقعات سے سبق لے کر صاحبانِ غور و فکر کا کام یہ ہے کہ وہ حقائق کی تحقیق و تلاش میں لگ جائیں کہ وہ ان کے مقام و منصب کے فرائض ہیں۔ اس سے نچلے کاموں کی طرف کوئی توجہ نہ دیں کہ یہ ان کے شایانِ شان نہیں۔ اسی طرح صاحبانِ جسم کا کام صرف یہ ہے کہ وہ ضروریاتِ زندگی کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف رہیں۔ اچھی غذا پیدا کریں۔ اچھا لباس فراہم کریں۔ صحت و صفائی کا لحاظ رہے اور ہر وقت محبت و خلوص کے ساتھ ہمدردی و بھائی چارہ پیشِ نظر رہے کہ یہ ان کا صحیح مقام ہے ان دو گروہوں کے درمیان ایک ایسا گروہ بھی ہوتا ہے جو نہ محنت کے میدان میں پورا اترتا ہے اور نہ اسپِ فہم کی سواری کر سکتا ہے مگر اپنے کو اپنی سطح سے اونچا سمجھ کر اپنے ذاتی مفاد کے مدِ نظر دونوں طرف ہاتھ ملتا ہے اور دونوں بہترین گروہوں کو ان کے اپنے مقامات سے ہٹا کر باہم متصادم کرا دیتا ہے جس سے کارِ جہاں خراب ہو جاتا ہے صاحبانِ فہم کا سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ نہ یہ خود کسی سے الجھیں نہ کسی کو الجھنے دیں۔ ہمیشہ صلح و مصالحت پیشِ نظر رہے کہ اسی کو عملِ صالح کہتے ہیں۔ نظریاتی دوڑ انسان کی فطری اور ضروری چیز ہے اس میں سب یکساں نہیں ہو سکتے اس میں کامیابی کا راز محض محبت و رشک ہے۔ حسد کسی طرح نہیں۔ پس اگر مذکورۂ بالا طریقہ پر لوگ کاربند ہوں تو کیا عجب ہے کہ بگڑی بن جائے۔ میری دلی تمنا ہے کہ صاحبانِ فکر اپنے بڑے حوصلہ کے ساتھ جھگڑ کر نیزا زہ بندی کی طرف متوجہ ہوں۔ فروعات کو پیچھے ڈال کر اصولوں کو آگے بڑھائیں اور تمام زندگی کو حقیقی زندگی سے سرفراز کریں اور آنے والی نسل کے لئے نمونہ چھوڑ جائیں خدا سے دعا ہے کہ ایسا وقت جلد آئے۔

حالاتِ حاضرہ

پاکستان اور امریکہ کا مجوزہ عسکری معاہدہ اور ہندوستان

از

(اسرار احمد صاحب آزاد ایڈیٹر ہفت روزہ جدید)

پاکستان اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے مابین جس عسکری یا مقدم الذکر کو سامانِ جنگ بہم پہنچانے کے معاہدہ کی گفت وشنید ہو رہی ہے، ہندستان کی حکومت اور اس ملک کے عوام ہی نہیں بلکہ ایشیا کے چند ممالک کو چھوڑ کر اس براعظم کے ہر گوشہ کے بسنے والے اسے تشویش کی نظر سے دیکھ رہے ہیں حتیٰ کہ پاکستان کے جمہوریت پسند حریت خواہ اور بقاء امن کے حامی حلقوں کی طرف سے بھی اس معاہدہ کی مخالفت کی جارہی ہے اور پاکستان کے جمہوریت پسند عوام اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ اس معاہدہ کی بدولت نہ صرف جنگ کے امکانات قوی تر ہی ہو جائیں گے بلکہ خود پاکستان بھی امریکی جنگ باز سرمایہ داروں کی گرفت میں چلا جائے گا اور پاکستان کے ہمسایہ ملکوں کے ساتھ اس کے تعلقات خوشگوار نہ رہ سکیں گے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرف سے پاکستان ہی کو نہیں بلکہ ایشیا کے کسی بھی ملک کے ساتھ عسکری معاہدہ کرنے یا اسے سامانِ جنگ دینے کا مقصد سوویٹ یونین اور عوامی چین کے مقابلہ میں ملوکیت پسندوں کے محاذ کو مستحکم بنانے کے علاوہ کچھ نہیں لیکن ہند اور پاکستان کے روابط اور تعلقات کی خصوصی نوعیت کے پیش نظر ان دونوں ملکوں میں سے کسی ایک ملک کے ساتھ، دنیا کے کسی ملک کا عسکری معاہدہ قدرتی طور پر دوسرے ملک کے لئے تشویش کا موجب ثابت ہونا چاہئیے اور ان حالات میں جہاں ہمیں اس بات کو تسلیم کر لینا چاہئیے کہ دونوں ملک اپنے اپنے اندرونی اور بیرونی معاملات میں قطعاً آزاد اور خود مختار ہیں اور اس زاویۂ نظر کے ماتحت پاکستان امریکہ ہی کے

ساتھ نہیں بلکہ دنیا کے ہر ملک کے ساتھ ہر قسم کے معاہدات کرنے کے لئے آزاد ہے وہیں ہمیں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کر دینا چاہیئے کہ ان معاہدات سے متاثر ہونے والے دوسرے ممالک کو بھی اپنے تاثرات کے اظہار اور اعلان کا پورا پورا حق حاصل ہے اور اگر کوئی ملک اپنے اس قدرتی حق کو استعمال کرتا ہے تو اسے بھی موردِ الزام قرار نہیں دیا جا سکتا اور ہندوستان کے ہر گوشہ سے اس مجوزہ معاہدہ کے خلاف احتجاج کی جو صدائیں بلند ہو رہی ہیں وہ اہل ہند کے اسی قدرتی حق پر مبنی ہیں۔

میں یہاں اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتا کہ پاکستان اور امریکہ مجوزہ عسکری معاہدہ سے ہند اور پاکستان کے سیاسی تعلقات اور بین اقوامی معاملات میں کیا تغیرات رونما ہوں گے اور اس کی بدولت ہمارے زمانہ کے بعض اہم اور پیچیدہ مسائل کی نزاکت اور پیچیدگی میں کس حد تک اضافہ ہو جائے گا۔ اس کے برعکس ان سطور کو لکھنے سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ مستقبل میں اس مجوزہ معاہدہ کے نتائج خواہ کچھ ہی کیوں نہ برآمد ہوں فی الحال اس سے ہند اور پاکستان کے عوام کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہونے کا شدید ترین اندیشہ لاحق ہو گیا ہے اور اگر ہم نے ابھی سے اس اندیشہ کو محسوس کر کے اس کے سدِ باب کے سلسلہ میں کوئی موثر اقدام نہ کیا تو اس سے دونوں ملکوں کو جو نقصان پہنچے گا اس کا ازالہ آسانی کے ساتھ ممکن نہ ہو سکے گا اور عہد حاضر کا مورخ اس صورت حال کی بیشتر ذمہ داری ہم پر عاید کرے گا۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے میں یہاں قومی یا بین اقوامی زاویہ نظر سے، پاکستان اور امریکہ کے مجوزہ فوجی معاہدہ کی نقصان رسانیوں کی بحث چھیڑنا نہیں چاہتا اور میں بحث کے بغیر اس معاہدہ کو ہند اور پاکستان کے تعلقات اور بین اقوامی حالات ہی کے زاویہ نظر سے . . . .

. . . . نقصان رساں نہیں بلکہ خود پاکستان کے عوام کے مفاد کے نقطۂ نظر سے بھی مضر تصور کرتا ہوں اور پاکستان کے ایک ہمسایہ ملک کی حیثیت سے جہاں تک اس معاملہ کے ساتھ ہندوستان کا تعلق ہے اسے اپنے تاثرات کو پوشیدہ نہیں رکھنا چاہیئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کر دینا چاہیئے کہ اس معاہدہ سے اختلاف کے ساتھ ایک اور اہم اور نازک مسئلہ

بھی وابستہ ہے اور اگر اس اختلاف کے اظہار کے سلسلہ میں صحیح طریقہ کار اختیار نہ کیا گیا تو دونوں ملکوں کے مابین خوشگوار اور دوستانہ تعلقات کے قیام کی تحریک کو شدید نقصان پہنچے گا، دونوں ملکوں میں فرقہ واریت کا جذبہ نہ صرف اُبھری آئے گا بلکہ قوی تر بھی ہو جائے گا اور دونوں ملکوں کی جمہوری تحریکات کمزور ہو جائیں گی۔

ہمارے ملک میں پاکستان اور امریکہ مجوزہ عسکری معاہدہ کو دو مختلف زاویہ ہائے نظر سے دیکھا جارہا ہے یعنی ایک گروہ اس معاہدہ کو تیسری عالم گیر جنگ اور ایشیا میں ملوکیت کی نشاۃ ثانیہ کا پیش خیمہ تصور کرتا ہے اور اس لئے اس کی مخالفت کر رہا ہے اور دوسرا گروہ اس معاہدہ کا صرف اس لئے مخالف ہے کہ اس کی بدولت بظاہر پاکستان کی عسکری قوت میں اضافہ ہو جائے گا اور اسی لئے یہ گروہ نہ صرف اس معاہدہ ہی کی مخالفت کر رہا ہے بلکہ ہندوستانی عوام کو پاکستان کے خلاف مشتعل کرنے اور انھیں پاکستان کا حریف بنا دینے کی کوششوں میں بھی مصروف ہے دوسرے الفاظ میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ پہلے گروہ کی طرف سے اس مجوزہ معاہدہ کی جو مخالفت کی جارہی ہے اس کا مقصد ایشیا میں امن کو باقی رکھنا، تیسری عالم گیر جنگ کے امکانات کو مسدود کرنا اور ہند اور پاکستان کے تعلقات کو خوشگوار اور مستحکم بنانا ہے اس کے برعکس دوسرا گروہ ہندوستانی عوام کو پاکستان کے خلاف مشتعل کر کے ایسے حالات پیدا کرنا چاہتا ہے جن کی موجودگی میں پاکستان کے جمہوریت پسند اور مخالف جنگ عناصر کم ہو جائیں گے۔ اس معاہدہ کی تکمیل سے پہلے یا پھر تکمیل کے بعد ان کی جانب سے اس کی جو مخالفت کی جائے گی وہ بے اثر ثابت ہوگی، ملوکیت پسندوں کو ایشیا کے ایک اہم ملک میں قدم رکھنے اور مزاحمت کے بغیر اپنی مذموم سرگرمیاں شروع کر دینے کا موقع مل جائے گا اور تیسری عالمگیر جنگ کے امکانات میں اضافہ ہو جائے گا۔

اس بات کو نظر انداز نہیں کر دینا چاہیے کہ تقسیم ہند کے ابتدائی ہنگاموں، عمل اور رد عمل کے بعد ہمارے ہمسایہ ملک پاکستان کو جس معاشی اور اقتصادی بحران سے گذرنا پڑا ہے اس نے اس کے باشندوں کے ذہن سے ماضی کی بہت سی تلخیوں کو محو کر دیا ہے اور ہماری طرح پاکستان کے عوام بھی اس حقیقت کو محسوس کرتے جارہے ہیں کہ ان کی اور ان کے وطن کی حقیقی فلاح و بہبود کا انحصار امریکہ

یا برطانیہ کی امداد پر نہیں بلکہ ہند اور پاکستان کے مابین خوشگوار تعلقات کے قیام پر ہے پھر وہ اس بات سے بھی ناواقف نہیں کہ امریکہ یا دنیا کی کسی ملوکیت پسند طاقت کے ساتھ پاکستان کا فوجی اتحاد خود پاکستان کی آزادی اور خود مختاری کے لئے ایک عظیم خطرہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اسی لئے مشرقی اور مغربی پاکستان کے عوام اور عوامی جماعتوں کی طرف سے اس مجوزہ معاہدہ کی مخالفت کی جا رہی ہے لیکن اگر ہندوستان کی طرف سے فرقہ پرستانہ ذہنیت کے تحت اس معاہدہ کی مخالفت کی جائے گی اور ہندوستانی عوام کو اس معاہدہ کی مخالفت کے پس پردہ پاکستان کے خلاف متحد ہونے کی دعوت دی جائے گی تو اسی نوع سے تعلق رکھنے والے پاکستانی بھی اپنے ملک میں ہندوستان کی معاندانہ اور جارحانہ ذہنیت کا حوالہ دے کر پاکستانی عوام کو اس مجوزہ معاہدہ کی مخالفت سے باز رکھنے کی کوشش کریں گے اور کسی ملک کے عوام کی طرف سے اس ملک کی حکومت کے کسی فیصلہ یا اقدام کی جو مخالفت کی جا سکتی ہے اور جو موثر بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ اس طرح پاکستان کے عوام اس مخالفت سے دست کش ہونے پر مجبور ہو جائیں گے۔

مذکورہ بالا نقصان کے علاوہ ہماری طرف سے پاکستان اور امریکہ کے مجوزہ معاہدہ کی غیر محتاط مخالفت سے ہمیں داخلی طور پر بھی نقصانات پہنچ سکتے ہیں۔ مثلاً ہمارے ملک کے فرقہ پرست عناصر اس مجوزہ معاہدہ کے پس پردہ ہندو عوام کو ہندوستانی مسلمانوں کے خلاف بھی مشتعل کرنے کی کوشش کریں گے اور اس طرح ہندوستان کی پرامن اور پرسکون فضا میں کبیدگی اور کشیدگی پیدا ہو جائے گی اس کے علاوہ چونکہ اس معاہدہ کی مخالفت کے نام پر اس ملک کے فرقہ پرست عناصر کو غیر فرقہ پرست عناصر کے دوش بدوش عوام کے روبرو آنے اور اس تحریک کو منظم کرنے کا موقع مل سکے گا اور وہ اس موقع کو اپنے مذموم مقاصد کی تبلیغ و اشاعت کے لئے استعمال کر سکیں گے اس لئے مستقبل میں یہ امر حکومت کے لئے بھی بہت سی پیچیدگیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

مختصر یہ کہ ہمیں ایشیا کو ملوکیت پسندوں کی گرفت سے آزاد رکھنے، ایشیائی ملکوں کی آزادی اور خود مختاری کے تحفظ، تیسری عالم گیر جنگ کے امکانات کے انسداد اور ہند اور پاکستان کے

تعلقات کے استحکام اور خود پاکستان کو مغربی ملوکیت پسندوں کے منحوس اثرات سے پاک رکھنے کے لئے اس معاہدہ کی مخالفت تو ضرور کرنا چاہیئے لیکن اس طرح کہ ہند اور پاکستان کی دوستی کے مخالف اس مخالفت سے کسی طرح بھی ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکیں اور اس سلسلہ میں ہماری طرف سے اس بات کو بالکل واضح کر دیا جائے کہ اس مجوزہ معاہدہ کے خلاف ہمارا احتجاج ارباب حکومت کی حکمت عملی کے خلاف ہے، پاکستان اور پاکستانیوں کے خلاف نہیں اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ کام ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے پارلیمنٹ کے گذشتہ اجلاس میں اس معاملہ پر بیان دے کر جس خوبی اور خوبصورتی کے ساتھ انجام دیا ہے اس سے بہتر طریقہ پر اس کا انجام پانا ممکن نہیں تھا اور اگر کسی ملک کے وزیر اعظم کی آواز کو اس ملک کے باشندوں کی آواز کہا جا سکتا ہے تو پھر اب اس معاملہ میں ہمیں مزید مظاہروں اور ہنگامہ آرائیوں کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور اس سلسلہ میں ہماری آئندہ سرگرمیاں ہمارے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے لئے تقویت کا موجب ثابت ہوں گی۔

ادبیات

عرفانِ مختوم

یعنی

ترجمہ گیتائے منظوم (فیضی)

از

آثم مظفر نگری

ادھیائے ششم اُونم سنجم جوگ نام

ضبطِ دل اور اتصالِ تصوری

"میں نے گیتائے منظوم فارسی مصنفہ علامہ فیضیؔ کا اردو میں مکمل ترجمہ کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ گیتا کے مضامین اردو میں اس طرح نظم ہو جائیں کہ پڑھنے والا ان پر کما حقہٗ عبور حاصل کر سکے اور ساتھ ہی ساتھ لطفِ سخن سے بھی بہرہ اندوز ہوتا رہے، میں اس کے باب ششم کا ترجمہ بذریعہ رسالہ "برہان" اہلِ نظر کے سامنے پیش کر رہا ہوں جس سے یہ اندازہ کیا جا سکے گا کہ ترجمہ کس اسلوب پر کیا گیا ہے رہی یہ بات کہ میں ترجمہ کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں اس کا فیصلہ تو اسی وقت ہو سکے گا جب کہ پوری کتاب چھپ کر سامنے آئے گی، اس کتاب کے خاص مضامین عمل بے غرض محبت الٰہی اور عرفان حقیقی ہیں جو کچھ تمام کتاب میں بطرق مختلفہ کیا گیا ہے وہ انھیں عنادین کی تشریح و تفسیر ہے باب ششم میں یہ دکھایا گیا ہے کہ باوجود تصفیۂ دل اور ترک کلی نجات ممکن نہیں جب کہ تصور

ذاتِ حق نہ ہو چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

باوجود تصفیۂ دل و ترک کلی نجات ممکن نہیں جب تک کہ تصور ذات حق نہ ہو اس لئے باب ششم میں اتصال تصوری کو بیان کیا گیا۔

نہیں چاہتا جو جزائے عمل　　ہے صرف اس کی ہمت برائے عمل
نظر اس کی سود و زیاں پر نہیں　　وہ ہے عارفِ زندگی بالیقیں
حدیں ملتی ہیں جوگ و سنّیاس کی　　یہ ہیں منزلیں پاس انفاس کی
تفاوت کا ان میں نہیں ہے گزر　　یہ راز اہلِ غفلت سے ہے مستتر
اگر مہرِ دنیا نہ دل سے گئی　　ریاضِ سحر بھر ہے اک دل لگی
کہاں بے عمل اور کہاں اوج جوگ　　بہر لحظہ ہے وہ گرفتار سوگ
یہاں جو ہے پابندِ ذوقِ حواس　　ہے مردودِ ہر دو جہاں بے قیاس
مگر جوگ میں جو کہ کامل ہوا　　خدا کا اسے وصلِ حاصل ہوا
دل اس کا جب اس دلربا سے ملا　　ہوا بند اس پر درِ ماسوا
یہ دل دوست بھی اور دشمن بھی ہے　　یہی راہبر اور رہزن بھی ہے
اگر دل پہ حاصل ہے قابو تجھے　　تو حاصل ہے اک خضرِ کامل تجھے
جو وہ تیرے پنجے سے آزاد ہے　　تو ہے صید وہ مثلِ صیاد ہے
ہے ہر اہلِ دل فارغ کیف و کم　　نہ خورسندِ شادی نہ مجروحِ غم
وجود اس کا ہے گنجِ علم و کمال　　سمجھتا ہے عالم کو خواب و خیال
زر و خاک یکساں ہیں اس کو مدام　　بجز راستی کچھ نہیں اس کا کام
وہ ہمدرد ہے سب کا ہنگام کار　　ہوں اغیار یا اس کے خویش و تبار
بدیں طور لازم ہیں اشغالِ جوگ　　منزہ رہیں تاکہ اعمالِ جوگ
مسطح جگہ اس پہ ہو گھاس بھی　　پھر اک مرگ چھالا بھی کرپاس بھی

ادبیات

عرفانِ مختوم

یعنی

ترجمہ گیتائے منظوم (فیضی)

از

اثر مظفر نگری

ادھیائے ششم اونم سنجم جوگ نام

ضبطِ دل اور اتصال تصوری

"میں نے گیتائے منظوم فارسی مصنفہ علامہ فیضی کا اردو میں مکمل ترجمہ کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ گیتا کے مضامین اردو میں اس طرح نظم ہو جائیں کہ پڑھنے والا ان پر کماحقہ، عبور حاصل کر سکے اور ساتھ ہی ساتھ لطفِ سخن سے بھی بہرہ اندوز ہوتا رہے، میں اس کے باب ششم کا ترجمہ بذریعہ رسالہ "برہان" اہل نظر کے سامنے پیش کر رہا ہوں جس سے یہ اندازہ کیا جا سکے گا کہ ترجمہ کس اسلوب پر کیا گیا ہے، رہی یہ بات کہ میں ترجمہ کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں اس کا فیصلہ تو اسی وقت ہو سکے گا جب کہ پوری کتاب چھپ کر سامنے آئے گی' اس کتاب کے خاص مضامین عمل بے غرض محبت الٰہی اور عرفان حقیقی ہیں، جو کچھ تمام کتاب میں بطریق مختلفہ کیا گیا ہے وہ انھیں عنادین کی تشریح و تفسیر ہے، باب ششم میں یہ دکھایا گیا ہے کہ باوجود تصفیۂ دل اور ترک کلی نجات ممکن نہیں جب کہ تصور

ذاتِ حق نہ ہو چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

باوجود تصفیۂ دل و ترکِ کلی نجات ممکن نہیں جب تک کہ تصورِ ذاتِ حق نہ ہو اس لئے باب ششم میں اتصالِ تصوری کو بیان کیا گیا۔

نہیں چاہتا جو جزائے عمل ۔۔۔ ہے صرف اس کی ہمت برائے عمل
نظر اس کی سود و زیاں پر نہیں ۔۔۔ وہ ہے عارفِ زندگی بالیقیں
حدیں ملتی ہیں جوگ و سنیاس کی ۔۔۔ یہ ہیں منزلیں پاسِ انفاس کی
تفاوت کا ان میں نہیں ہے گزر ۔۔۔ یہ رازِ اہلِ غفلت سے ہے مستتر
اگر مہرِ دنیا نہ دل سے گئی ۔۔۔ ریاضِ سحر پھر ہے اک دل لگی
کہاں بے عمل اور کہاں اوجِ جوگ ۔۔۔ بہر لحظہ ہے وہ گرفتار سوگ
یہاں جو ہے پابندِ ذوقِ حواس ۔۔۔ ہے مردودِ ہر دو جہاں بے قیاس
مگر جوگ میں جو کہ کامل ہوا ۔۔۔ خدا کا اسے وصل حاصل ہوا
دل اس کا جب اس دلربا سے ملا ۔۔۔ ہوا بند اس پہ دلِ ماسوا
یہ دل دوست بھی اور دشمن بھی ہے ۔۔۔ یہی راہبر اور رہزن بھی ہے
اگر دل پہ حاصل ہے قابو تجھے ۔۔۔ تو حاصل ہے اک خضرِ کامل تجھے
جو وہ تیرے پنجے سے آزاد ہے ۔۔۔ تُو ہے صید وہ مثلِ صیاد ہے
ہے ہر اہلِ دل فارغ کیف و کم ۔۔۔ نہ خورسندِ شادی نہ مجروحِ غم
وجود اس کا ہے گنجِ علم و کمال ۔۔۔ سمجھتا ہے عالم کو خواب و خیال
زر و خاک یکساں ہیں اس کو مدام ۔۔۔ بجز راستی کچھ نہیں اس کا کام
وہ ہمدرد ہے سب کا ہنگام کار ۔۔۔ ہوں اغیار یا اس کے خویش و تبار
بدیں طور لازم ہیں اشغالِ جوگ ۔۔۔ منزہ رہیں تا کہ اعمالِ جوگ
مسطح جگہ اس پہ ہو گھاس بھی ۔۔۔ پھر اک مرگ چھالا بھی کرپاس بھی

حواس اس کی ہوں یاد میں جمع یوں — کہ دل شمع سے بھی ہو روشن فزوں
زبان و دل و دست یکجا ہوں سب — توجہ ہو پوری بدرگاہِ رب
سر بینی ہو صرف مد نظر — رہے مستعد ذوق جلوہ بگر
دل و جاں میں تب نورِ مطلق مرا — بچشمِ حقیقت نظر آئے گا
زیادہ جو سوتا ہے اور کھاتا ہے — وہ ادبارِ غفلت میں دب جاتا ہے
ہے لازم خور و خواب میں اعتدال — کہ تا معرفت میں ہو حاصل کمال
نہیں بجھتا جیسے وہ روشن دیا — ہوا سے جو ہر وقت بچتا رہا
اسی طرح جوگی بہ عمرِ دراز — رہا کرتا ہے قائم و جاں نواز
نفس ہے ہوا اور جاں ہے چراغ — تو رکھ اس ہوا کو بجوفِ دماغ
ہر اک دل برہم حرج سے ہے خوشی — دکھی اس سے ہوتا نہیں ہے کوئی
وہ لذاتِ ہستی سے ہے دور تر — گزرتا ہے ہستی سے مثلِ شرر
نہیں رنجِ محنت کشی کا اسیر — تصرف میں ہے اس کے گنجِ خطیر
کہ زنبور جیسے بطرزِ نکو — ذخیرہ کیا کرتی ہے شہد کو
اسے چھوڑ دیتی ہے پھر وقت پر — کہ تا اس سے ہوں دوسرے بہرہ ور
کبھی گر وہ کرتا ہے ترکِ عمل — نہیں وضع میں اس کی آتا خلل
وہ جب چھوڑتا ہے ہوا و ہوس — تو کہتا ہے اللہ باقی و بس
دل اس کا ہے پابندِ صبر و قرار — ہے آزاد ہر گردشِ روزگار
وجود اس کا ہے مرکزِ عینِ نور — عیاں اس سے ہے ذاتِ حق کا ظہور
وہ ہے لذتِ وصل سے بہرہ ور — دل اس کا ہے پاک از خیالِ دگر
کہاں شیشۂ دل پر اس کے غبار — ہے جلوہ نما اس میں تصویرِ یار
وہ ہے فارغِ رنج و غم ہر گھڑی — ہے حاصل اسے لذتِ سرمدی

ہے پیشِ نظر اس کے روئے نگار
وہ خوش ہے بفیضِ تجلیٔ یار

وہ ذرہ میں ہے دیکھتا آفتاب
نظر اس کو آتا ہے حق بے نقاب

جہاں اس کے اندر کبھی ہے نہاں
کبھی وہ جہاں پر ہے جلوہ فشاں

جو کرتا ہے خود آپ کو محوِ ذات
سمجھتا ہے عالم کو عینِ صفات

وہ گردابِ اعمال سے بچ گیا
ہے خلوت گہِ قدس میں اس کی جا

ذرا دیکھ میرے گل و برگ و بار
نظر آئے گا تجھکو پروردگار

محیطِ جہاں ہے جو یہ موجزن
ہیں کون و مکاں اس میں جلوہ فگن

کہا پھر یہ ارجن نے اے محترم
یہ اعمالِ جوگ اور یہ حبسِ دم

یہ تفصیل بتلایئے گا یہ مجھے
نہیں دل مرا چین دیتا مجھے

مجھے اپنے دل پر نہیں دسترس
ہوں مجبور اس سے بہر یک نفس

پریشانیٔ دل سے حیراں ہوں میں
بہت اپنے اوپر پشیماں ہوں میں

یہ دل ہے مرا یا کہ بادِ رواں
نہیں میرے قابو میں اے مہرباں

کہا کشن یہ دل مثلِ سیماب ہے
تو کیوں شدتِ غم سے بیتاب ہے

بتدریج کر اس کو قابو میں تو
نہ یکبارگی کیونکہ ہے شعلہ خو

پیا کر باہستہ خونِ جگر
کہ تا رام ہو جائے یہ فتنہ گر

بتائی ہے میں نے جو راہِ سلیم
تو چل اس پہ با ہمتِ مستقیم

ہوا و ہوس کے طلسموں کو توڑ
تماشائے ہستی سے لے منہ کو موڑ

یہ ہے نفسِ امارہ خصمِ قوی
شکست اس کو دے کر بنا زندگی

کہا پھر کہ اے غمگسارِ جہاں
دے اس مردِ کامل کا مجھ کو نشاں

کیا اپنے قابو میں ہو جس نے دل
زبوں نفس کو کر کے اور مضمحل

اور اک وہ کہ جس نے تمنا کا دام
دیا توڑ بہرِ خدائے انام

اور اک وہ کہ یا جوگ ہے متصل — بہر لحظہ ہستی میں ہے غم گُسل
پس از مرگ یہ سب کہاں جائیں گے — کہاں رہ کے وصلِ خدا پائیں گے
کہا سُن کے ہے جو بھی محوِ رضا — پس از مرگ جنت ہی میں جائیگا
جو کامل کہ ہے عارفِ ناتمام — بتدریج پاتا ہے اعلیٰ مقام
وہ تا وقتِ موعود رہ کر یہاں — چلا جاتا ہے تا بدار الاماں
وہ ہو شاہزادہ کہ اک مردِ عام — عمل سے رہا کرتا ہے شادکام
پہنچتا ہے یوں تا حدِ کمال — کہ ہوتا ہے آزاد ہر یک زوال
بنا اپنے دل کو تو جوگ[علہ] آشنا — کہ تا مجھ سے مل کر ہو عینِ بقا
مرے وصل سے جو ہوا کامراں — ملی اس کو سرداریٔ دو جہاں

غزل

از

(شمس نوید)

ترا خیالِ لطیف لیکر فراق میں آنکھ لاکھ جھپکے — سکوں نہ ہوگا کہ زندگی ہے وہ "اشک" جو خشک ہو نہ ٹپکے!
کسے بتائیں دماغ و دل پر پڑا تھا کس آرزو کا سایہ — مہِ منوّر نظر جب آیا حسیں فضاؤں میں ابر چھٹکے
کبھی خرد نے شکست کھائی کبھی محبت نے ہار مانی — کہیں حقیقت سے کی بغاوت، کہیں گرانمایہ خواب ٹپکے
تری محبت کی خیر چاروں طرف بھیانک خلا سا پایا — نگاہ کی اپنی زندگی پر اگر مقامِ جنوں سے ہٹکے

لطیف ہے فطرتِ محبت، عذاب ہے قسمتِ محبت
یہ سلسلہ حسنِ آرزو کا، یہ واقعاتِ الم کے جھٹکے

علہ یعنی متوصل بہ حق ہو جا۔

شئون علمیہ

موت سے رہائی

کیا مرنا ضروری ہے؟ ہم سب یقین کرتے ہیں کہ موت ناگزیر ہے۔ لیکن دیکھئے کہ ماہرین حیاتیات کیا کہتے ہیں۔

ان کے نزدیک ہمارے اندر خود ہماری فنا کے تخم موجود ہیں اور طبعی موت لازمی نتیجہ ہے ہمارے طرز بود کا۔

پیدا ہوتے ہی بلکہ جنین کی حالت ہی میں مہلک کیمیاوی تغیرات ہمارے بدن کے اندر کام کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس لئے موت کا سبب غالباً یہی ہے کہ فضلات کی سمیت پھیل جاتی ہے۔

بایں ہمہ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ حیات لازماً مسلسل ہے۔

ٹھہرے پانی میں ایک حیوان پایا جاتا ہے جس کو پیرامیسیئم کہتے ہیں۔ اس کے جسم میں صرف ایک خلیہ (سیل) ہوتا ہے۔ وہ اس قدر چھوٹا ہوتا ہے کہ سوائے خوردبین کے نظر نہیں آتا۔ اس میں ندرت یہی ہے کہ وہ فنا نہیں ہوتا۔ وہ اپنی زندگی اس طرح قایم رکھتا ہے کہ اپنے کو دو نئے خلیوں میں تقسیم کر لیتا ہے۔ چنانچہ ایک ماہر حیاتیات نے اس حیوان کو مطالعہ خاص کا موضوع بنایا تو معلوم ہوا کہ خود تقسیمی کی بدولت یہ حیوان ۱۳½ برس میں ۹ ہزار نسلیں تیار کر دیتا ہے۔ انسانی زندگی کے اعتبار سے یہ مدت کوئی ۲½ لاکھ برس کی ہوئی۔

تو کیا اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ منفرد خلیہ غیر فانی ہے؟ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو لیکن ہم ابھی نہیں جانتے۔

چند برس ادھر تحقیقی کام کرنے والوں نے ایک بافت (ٹشو) کو پھینک دیا جو پہلی جنگ عالمگیر کے قبل سے زندہ تھی اور اس میں نمو تھا۔ ۱۹۱۲ء میں ڈاکٹر الکسی کیرل نے راک فیلر

انسٹیٹیوٹ میں ایک چوزے کے قلب کی بافت کا ایک ٹکڑا علیحدہ کیا اور اس کو خاص آلے میں رکھ دیا اور دعوے کیا کہ وہ کبھی فنا نہ ہوگا۔ اس کو بالآخر پھینک دیا گیا کیونکہ تجربہ صدیوں تک کیا جا سکتا تھا۔

ہم جس کو طبعی موت کہتے ہیں وہ غالباً ارتقار کے ساتھ ساتھ آئی ہے۔ پیرامیسیم کو جس طرح کی "بقا" حاصل ہے وہ لاکھوں برس ادھر ہاتھ سے جاتی رہی جب کہ حیوانی دنیا میں یک خلیہ ہستیوں کی بجائے پیچیدہ تر اور کارگزار کثیر خلیہ مخلوق نے لے لی۔

انسان کی پیچیدگی نے اس کو فنا کے گھاٹ اُتار دیا۔ ہم اس لئے فنا ہو جاتے ہیں کہ ہمارے جسم کے اندر خلیوں کا ایک گروہ دوسرے کا ساتھ نہیں دیتا۔ "جگر" اگر ساتھ چھوڑ دے تو "کل" کو فنا کر دیتا ہے اگرچہ دل گردے اور پھیپھڑے اپنی اپنی جگہ بالکل درست ہیں۔ جب ہم مرتے ہیں تو ہمارا "کل" ایک دم فنا نہیں ہو جاتا۔ جب کسی فرد کو قانونی طور پر مردہ تصور کر لیا جاتا ہے تو بھی ہمارے 'کل' کے بعض 'اعضاء' پورے طور پر "زندہ" رہتے ہیں۔ جسم کے ہر عضو کی 'شرح موت' جداگانہ ہے۔ سائنس داں اب اس 'واقعہ' کی تفصیلات حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ اور اس طرح امید کرتے ہیں کہ بعض خاص قسم کی موت کو روکا جا سکے گا۔

'شرح تحلیل' کا انحصار غالباً تپش (ٹمپریچر) پر ہے۔ چنانچہ عملیات (فزیالوجسٹ) کے ایک ماہر ژاک لوئب نے پھلوں کی مکھی کی زندگی میں ۹۰ فی صد کا اضافہ تپش میں دو تہائی کمی کر کے کر دیا۔ ان کا خیال ہے کہ اگر انسانی جسم کی تپش کو ۹۸ء۴ درجہ فارن ہائٹ سے اتار کر ۹۴ء۳ درجہ پر لے آیا جائے تو انسانی زندگی ۱۹۰۰ برس تک بڑھائی جا سکتی ہے۔ لیکن مشکل یہی ہے کہ فطرت ۹۸ء۴ درجہ کی تپش قائم رکھتی ہے خواہ کوئی گرم ممالک کا باشندہ ہو یا سرد ممالک کا جیسے اسکیمو۔

عملِ جراحی کے وقت جن لوگوں کا قلب رُک جاتا ہے اس کو دوبارہ جاری کرنے میں ڈاکٹروں کو جو نئی معلومات حاصل ہوئی ہیں اُن سے توقع ہو چلی ہے کہ موت کو بھی ٹالا جا سکتا ہے۔ وہ طبی موت اور خلیاتی موت میں تفریق کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ حیاتی بقا نہ بھی حاصل ہو تو بھی انسان اپنی زندگی کو طویل تر کر سکتا ہے اس لئے بعض لوگوں کا خیال ہو گیا ہے

کہ طبعی عرصۂ حیات ۱۱۵ برس ہو سکتا ہے بشرطیکہ انسان کو طبعی اور جذباتی "تھک جسم" سے محفوظ رکھا جا سکے۔

جامعہ کولمبیا کے ڈاکٹر ہنری سمس نے حساب لگایا ہے کہ اگر جسم انسانی میں مرض کا مقابلہ کرنے اور بدل ما یتحلل کی وہ قوت باقی رہے جو دس برس کی عمر میں اس کو حاصل ہوتی ہے تو اس کی مدتِ حیات ۷۰۰ برس تک ممتد ہو سکتی ہے اور بعض افراد ۲۲ ہزار برس تک زندہ رہ سکتے ہیں۔

موت کی نوعیت پر یہ "تحقیق انیق" تو جاری رہے گی لیکن ہم اس امر سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے کہ اس کرۂ ارضی پر رہنے والوں میں سے اکثر کے لئے سوال یہ نہیں ہے کہ وہ صدیوں تک زندہ رہ سکیں گے یا نہیں بلکہ بڑا سوال یہی ہے کہ وہ 'کل' بھی زندہ رہیں گے یا نہیں۔

امریکہ کے ایک محکمہ نے ۱۹۵۰ء میں یہ رپورٹ شایع کی تھی کہ مصر اور ہندوستان جیسے ملکوں میں اوسط عرصۂ حیات کوئی ۳۰ برس ہے۔ ان ملکوں میں ۴۵ فی صد بچے ۱۵ برس کی عمر کو پہنچتے ہیں اور اعظم معاشی پیدا آوری کے دور میں داخل ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد ان ۴۵ میں سے صرف پندرہ کام کے قابل رہتے ہیں باقی یا تو مر جاتے ہیں یا پھر بے کار ہو جاتے ہیں حالانکہ کام کاجی زندگی ۶۰ برس تک مانی جاتی ہے۔ دوسرے ملکوں میں جو صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ ہیں ۹۲ فی صد بچے ۱۵ برس کی عمر کو پہنچتے ہیں۔ ان میں سے ۷۰ بچے ۶۰ برس کی کام کاجی مدت تک پہنچتے ہیں۔

شرحِ اموات کو گھٹانا ضروری ہے کیونکہ آبادی میں اضافہ سے پیدا آور ذرایع میں بھی اضافہ ہوگا۔

عالمی ادارۂ صحت (ورلڈ ہیلتھ آرگنیزیشن) کا کہنا ہے کہ معاشی اور معاشرتی اصلاح کے ساتھ انسانوں کی زندگیاں زیادہ پُرلطف اور طویل ہوں گی۔ ان کو زندگی کا بھرپور حصہ ملے گا اور ناچیز پیرامیسیم کا مطالعہ انسان کو "بقا" عطا کر دے گا۔

ن۔ا۔ع

تبصرے

اجتہاد از جناب خالد انصاری تقطیع کلاں ضخامت ۱۳۸ صفحات طباعت وکتابت بہتر قیمت درج نہیں۔ غالباً مصنف سے بھوپال کے پتہ پر ملے گی۔

اسلام دین کامل اور عالمگیر مذہب ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم خاتم المرسلین ہیں اس لئے اب نہ کوئی اور مذہب آئے گا اور نہ پیغمبر کا نزول ہوگا۔ لیکن دنیا میں تہذیبی تمدنی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی و معاشی حالات برابر تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور اس بنا پر نئے نئے معاملات و مسائل پیش آتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان نئے معاملات و مسائل کا اسلامی حل اس وقت تک ہرگز نہیں معلوم ہوسکتا جب تک علمائے کرام فقہ اسلامی کے مختلف ادوار کو سامنے رکھ کر ہمارے قدیم ائمہ فقہ کے طرز پر ان جدید مسائل کے لئے اجتہاد سے کام نہیں لیں گے۔ چنانچہ آج سینکڑوں سماجی اور اقتصادی مسئلے ہیں جو علمائے کرام کی توجہ کے مستحق ہیں اور جن کی نسبت قطعی طور پر اسلامی حکم معلوم ہونا چاہیے لیکن افسوس ہے کہ علماء میں ایک طبقہ ایسا ہے جسے یا تو ان مسائل کی خبر ہی نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو اس میں مجتہدانہ طور پر استنباط و استخراج احکام و مسائل کی جرأت نہیں ہے۔ اس صورت حال سے اسلام کو کس قدر شدید نقصان پہونچ رہا ہے اس کا اندازہ صرف انہیں لوگوں کو ہوسکتا ہے جن کو تہذیب و تمدن کے اس عجیب دور میں ان مسائل سے براہ راست سابقہ پڑتا ہے جناب خالد انصاری نے اسی ضرورت کے پیش نظر یہ کتاب لکھی ہے جس میں فقہ اسلامی کے مختلف ادوار اور ان میں سے ہر دور کی خصوصیات پر عالمانہ و فاضلانہ گفتگو کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ فقہائے اسلام نے ہر دور میں اس دور کے جدید معاملات و مسائل کے لئے احکام مستنبط کئے ہیں۔ اس بحث کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح زمانہ سلف میں

ضرورتوں اور زمانہ کے حالات میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ احکام و مسائل میں بھی تبدیلی پیدا ہوتی رہی ہے اور کبھی اسلام کی قوتِ اجتہاد میں جمود پیدا نہیں ہوا اسی طرح آج بھی سینکڑوں ہزاروں نئے مسائل ہیں جن کو جدید حالات اور تقاضوں کے ماتحت فقہی طور پر از سرِ نو مدوّن کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے علما کو لامحالہ اجتہاد سے کام لینا ہوگا۔ کتاب پُر از معلومات۔ مفید اور بصیرت افروز ہے۔ علم دین کے طلبا اور علما کو خاص طور پر اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

فارابی | مترجمہ جناب رئیس احمد جعفری تقطیع متوسط ضخامت ۱۶۰ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ:۔ المطبوعات ۱۸/۴ بہار کالونی۔ کلیٹن روڈ کراچی ۵

مصر میں مشاہیرِ اسلام پر چھوٹی چھوٹی کتابوں کے شائع کرنے کا ایک سلسلہ شروع ہوا ہے اسی ذیل میں استاذ عباس محمود نے فارابی پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں اسلام کے آغاز سے فارابی کے عہد تک کی اسلامی تاریخ بہ طور پس منظر پیش کرنے کے بعد اسلام کے مشہور مفکر اور فلسفی حکیم ابو نصر فارابی کے جو معلم ثانی کے لقب سے مشہور رہے ہے حالات و سوانح بیان کرنے کے بعد اس کے علمی کارناموں اور فلسفہ میں اس کے مخصوص خیالات و افکار پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب مذکورۂ بالا کتاب کا عربی سے اردو میں صاف و سلیس اور شستہ و رواں ترجمہ ہے لیکن اردو خواں طبقہ کی رعایت سے ترجمہ میں کتاب کے اس حصہ کو شامل نہیں رکھا گیا ہے جس میں فارابی کے فلسفیانہ افکار پر بحث کی گئی ہے چونکہ اس طرح کی سیریز (سلسلہ وار کتابوں) کا مقصد مشاہیر کے حالات و سوانح سے متوسط درجہ کی استعداد رکھنے والوں کو واقف کرنے کے علاوہ ان کے مخصوص افکار و آرا سے باخبر کرنا بھی ہوتا ہے اور یورپ و امریکہ میں یہی طریقہ ہے جس کے ذریعہ عوام کو علمی مسائل اور فلسفیانہ حقائق سے آشنا کر کے ان میں علمی مذاق پیدا کیا جاتا ہے اس بنا پر مناسب نہ تھا کہ ترجمہ میں اصل کتاب کے اس اہم حصہ کو نظرانداز کیا جاتا ورنہ ظاہر ہے کہ فارابی کی شخصیت بحیثیت ایک فلسفی اور مفکر کے کتاب پڑھنے والے پر روشن نہیں ہو سکتی۔ تاہم ترجمہ میں اصل کتاب کا جتنا کچھ حصہ بھی آگیا ہے بہرحال مفید اور دلچسپ ہے اور اس کے مطالعہ سے حکیم ابو نصر فارابی کی جلالت و منزلتِ علمی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر

از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تقطیع خورد ضخامت ۱۱۲ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۴ر پتہ:۔ مکتبہ جماعت اسلامی (ہند) رام پور (یوپی) اس کتاب میں پہلے اسلام میں اور دوسرے مکاتب خیال میں عبادت کے مفہوم پر تقابلی گفتگو کی گئی ہے اور اس کے بعد اسلامی عبادات میں سے صرف نماز روزہ کی حقیقت۔ ان کے منافع وفوائد۔ اور ان کی حکمتوں اور مصلحتوں پر دل نشین و دلچسپ انداز میں بحث کرکے ان کی اہمیت وعظمت اور ضرورت ثابت کی گئی ہے۔ فاضل مصنف کی تمام خصوصیات تحریر اس رسالہ میں بھی موجود ہیں۔ عام قارئین کے علاوہ یہ اس لائق ہے کہ مسلمان طلبا اور طالبات کے نصاب دینیات میں اس کو شامل کیا جائے۔

منہاج التبلیغ

تقطیع خورد ضخامت ۹۲ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت درج نہیں پتہ:۔ ناظم مرکز تبلیغ اسلام۔ صدر بازار دہلی۔

اس رسالہ میں اس کے مرتب جناب مفتی سید حفیظ الدین احمد صاحب نے اسلام کی بنیادی تعلیمات قرآن وحدیث کی روشنی میں بیان کی ہیں اور اس کے بعد اسلام کے مختلف محاسن ومحامد، مسلمانوں کے بعض کارنامے۔ تبلیغ کی ضرورت واہمیت اور مبلغ کے اوصاف وفرائض اور تبلیغ کے اصول ونظام پر گفتگو کی ہے کتاب مجموعی حیثیت سے مفید اور بہت سی کام کی باتوں پر مشتمل ہے لیکن غالباً مصنف میدان تصنیف میں نو وارد ہیں کہ معلومات ومواد میں کوئی ترتیب قائم نہیں ہے اسلام کی عالمگیری پر گفتگو کرتے کرتے مسلمانوں کی ایجادات پر ملتبدیانہ انداز میں داد تحقیق دینے لگے ہیں اور اس کے بعد پھر تبلیغ وغیرہ جیسے مباحث کی طرف لوٹ آئے ہیں۔ علاوہ بریں مصنف نے بعض جدتیں بھی عجیب طرح کی کی ہیں۔ مثلاً غفوراً کے معنی "وہ گناہوں کا بخشنے والا نہیں بلکہ گناہوں سے بچانے والا کرتے ہیں اس بنا پر صرف پیغمبر ہی نہیں بلکہ "فَإِنَّهُ كَانَ لِلْأَوَّابِينَ غَفُورًا" کے ارشاد کے مطابق غیر پیغمبر بھی معصوم ہوجاتے ہیں حالانکہ جمہور امت کا فیصلہ ہے کہ سوائے انبیاء کے کوئی معصوم نہیں ہے پھر مصنف نے بعض جگہ جو زبان استعمال کی ہے مثلاً مکی زندگی کے الزامات" اور مدنی زندگی کے اتہامات" کے زیر عنوان اگرچہ وہ نقل کفر کفر نباشد کے ماتحت آئی ہے تاہم ادب اور سنجیدگی تحریر کے خلاف ہے۔

بُرہان

جلد نمبر ۳۲ شمارہ نمبر ۲

فروری ۱۹۵۴ء مطابق جمادی الثانی ۱۳۷۳ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو (علیگ) نے آکسفورڈ سے اپنے ایک خط میں انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی طبع جدید سے متعلق ایک مفید اور اطلاعی نوٹ بھی لکھا ہے۔ ہم اسے اہلِ علم کے افادہ کے لئے بعینہٖ شائع کرتے ہیں

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، جس کی جلدیں عرصہ ہوا لندن سے شائع ہوئی تھیں اب نایاب ہیں کچھ دنوں سے اس بات کی سخت ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ مستشرقین کا یہ کارنامہ دوبارہ شائع کیا جائے اور ممکن ہو تو اور زیادہ وسیع پیمانے پر اسے مرتب کیا جائے جس میں دنیائے اسلام کی تاریخ، جغرافیہ، ادب اور تہذیب و ثقافت پر جدید ترین تحقیقات کے نتائج بھی شامل ہوں۔ اس خیال کے تحت کچھ لوگوں نے ایک لائحہ عمل تیار کیا اور مستشرقین کے اکیسویں بین الملی اجلاس میں جو جولائی ۱۹۴۸ء میں پیرس میں منعقد ہوا تھا پیش کیا، مندوبین نے اس تحریک سے گہری دلچسپی کا ثبوت دیا اور یہ تحریک منظور ہو گئی اس خیال کو عملی جامہ ہالینڈ کی رائل اکیڈمی آف سائنس نے پہنایا اور انٹرنیشنل یونین آف اکیڈمیز، اور مشرقی ممالک کے مختلف نمائندوں نے بڑا ہاتھ بٹایا اس ہفتہ آکسفرڈ میں انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی جلد اول کا پہلا حصہ چھپ کر آگیا ہے۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے اور اس کا جلد اشاعت پذیر ہونا ممکن نہیں زیر نظر حصہ ۶۴ صفحات پر مشتمل ہے اور طباعت کا اہتمام اور مجموعی اندازِ اشاعت اول کی طرح ہے۔

مرتبین میں آر جہانی گر ہمر، پروفیسر ایچ اے آر گب (آکسفرڈ) اور لیوی پروونسال (پیرس) کے اسماء سرورق پر ملتے ہیں۔ مرتبین نے امید دلائی ہے کہ اسی طرح ہر دو ماہ پر ایک حصہ یعنی ہر سال چھ حصے شائع ہوتے رہیں گے اس کی پانچ جلدیں ہوں گی اس لئے اندازہ ہے کہ مکمل کتاب کی اشاعت

میں کئی سال لگ جائیں گے۔

اس نئی اشاعت کا مجموعی انداز، پہلی اشاعت ہی کا سا ہوگا لیکن اقتصادی، عمرانی اور تہذیبی مسائل پر زیادہ توجہ کی جائے گی اور سارا مواد اس طرح پیش کیا جائے گا کہ غیر مستشرقین بھی اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں۔ مرتبین نے کتاب کے آخر میں ایک مکمل انڈکس اور اسلامی دنیا کے مکمل نقشے کے اضافے کا بھی وعدہ کیا ہے۔

زیر نظر حصے کے مضمون نگاروں کی تعداد ۴۶ ہے اور ان میں تقریباً سارے کے سارے مشہور لوگ ہیں ان میں چار مسلمان اہلِ قلم بھی نظر آتے ہیں۔ عبدالوہاب (تیونس) نے تیونس کے ایک شہر عباسیہ، وہاب خالدی (فلسطین) نے عبدالغنی نابلوسی، شیخ عنایت اللہ (لاہور) نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور پروفیسر محمد شفیع (لاہور) نے شیخ عبدالحق دہلوی پر مضامین لکھے ہیں صحابہ کرام میں عباس بن عبدالمطلب رض، عبداللہ بن عباس رض، عبداللہ بن جحش رض، عبداللہ بن رواحہ رض، عبداللہ بن عمر بن الخطاب رض، عبداللہ بن الزبیر رض پر اور شعراء میں ابان بن عبدالحمید اللاحقی عباس بن الاحنف اور عباس بن مرداس السلمی پر مضامین شریک اشاعت ہیں،

برناڈ یوئیس (لندن) نے خلفائے عباسیہ اور برنشوگ (فرانس) نے مادۂ عبد پر بہت تفصیلی اور فاضلانہ مقالے لکھے ہیں، پروفیسر گب نے مندرجۂ ذیل اصحاب پر مضامین لکھے ہیں، عبداللہ بن عامر، عبداللہ بن خازم السلمی، عبداللہ بن الزبیر، عبداللہ بن وھب الراسبی۔ جغرافیہ پر زیادہ تر مضامین منورسکی کے، ترکی کے اشخاص وقبائل پر ہوارٹ کے اور مراقش وہسپانیہ پر لیوی پروفنسال کے لکھے ہوئے ملتے ہیں، روم کی ایک خاتون (ECCIAVAGLIERE) بھی شریک بزم ہیں جنھوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رض اور حضرت عبداللہ بن عمر بن الخطاب رض پر مختصر لیکن جامع مضامین لکھے ہیں۔

جدید اشاعت میں تازہ ترین معلومات مہیا کرنے کی کس قدر کوشش کی گئی ہے اس کا اندازہ ذیل کی سطروں سے ہوگا:

"عباس حلمی سابق خدیو مصر کے دو بیٹے محمد عبدالمنعم اور محمد عبدالقادر ہیں۔ اول الذکر (ولادت

۲۰ رفروری ۱۹۵۲ء) شاہ فاروق کی معزولی (۲۶ رجولائی ۱۹۵۲ء) کے بعد ریجینسی کونسل کے ممبر مقرر کئے گئے اور اکتوبر ۱۹۵۲ء کو ریجنٹ بنائے گئے تا آنکہ جون ۱۹۵۳ء میں مصر نے جمہوریہ بننے کا اعلان کر دیا۔"

اس حصے کے مندرج مضامین میں دو ہندوستانی اہل قلم ڈاکٹر زبید احمد (الہ آباد) اور ڈاکٹر خورشید احمد فارق (علی گڑھ۔ دہلی) کی تحقیقات حوالہ کے طور پر استعمال کی گئی ہیں۔

بعض مضامین کے سلسلے میں کچھ باتیں کہنے کے لائق ہیں لیکن اس وقت اس حصہ پر تبصرہ نہیں بلکہ محض اطلاع مقصود ہے گو اس وقت اس کے اظہار میں مضائقہ نہیں کہ بعض مضامین علمائے مغرب نے اسی زاویۂ نظر سے لکھے ہیں جس سے وہ اسلام اور اس کے مسائل کو دیکھنے کے عادی رہے ہیں اور جو مسلم طریقۂ فکر سے یکسر مختلف ہے، لیکن اس کی شکایت بے کار ہے یہ اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک خود مسلمانوں میں فاضل اہل قلم پیدا نہ ہو جائیں اور وہ خود اس کے لکھنے کی ذمہ داری قبول نہ کریں۔ مجھے یقین ہے کہ اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جو پاکستان سے پروفیسر محمد شفیع کی نگرانی میں شائع ہو رہی ہے ان ساری کمیوں کی تلافی کر دے گی۔

اس حصے کی قیمت ۱۹ رشلنگ ہے جو کتاب کی اہمیت کے لحاظ سے کچھ ایسی زیادہ نہیں یہ حصہ بریل (لیڈن) لوزک (لندن) اور ان کے ایجنٹ سے مل سکتا ہے۔

گذشتہ اشاعت میں ایک انجمن "تلک شکن" کا تذکرہ آیا تھا، لیکن اس سلسلہ میں غلطی یہ ہو گئی کہ جگہ کا نام صحیح نہیں لکھا گیا جس کا افسوس ہے۔ اب قارئین کرام از راہِ عنایت نوٹ کر لیں کہ یہ انجمن ضلع مونگیر میں نہیں بلکہ پٹنہ کے ایک علاقہ میں جس کا نام دھرتی ہے قائم ہوئی ہے۔ اخبارات سے ایک دوسری اطلاع یہ بھی ملی ہے کہ حال ہی میں بہار شریف کے محلہ شیخانہ میں ایک اجتماع ہوا اور اس میں اسی طرح کی ایک انجمن کے قیام کا فیصلہ کیا گیا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ پہلی انجمن کا نام تلک شکن تھا اور اس نئی انجمن کا نام تلک توڑ تجویز ہوا ہے ان دو انجمنوں کے علاوہ احباب بہار کے خطوط سے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ برہان کی تحریروں کا وہاں کافی اثر ہوا ہے اور امید ہے کہ چند اور مقامات پر بھی اسی مقصد خیر کے لئے انجمنیں قائم ہوں گی جزی اللہ اھل بہار عنا جزاء حسنا۔

سنسکرت کا فارسی ترجمہ

از

(جناب مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی)

یہ مقالہ اورینٹیل کانفرنس احمد آباد میں پڑھا گیا

سنسکرت عربی ہی کی طرح بڑی وسیع زبان ہے۔ اس کی گرامر بھی عربی ہی کی مثل ذرا پیچیدہ ہے، پھر بھی اس مفید زبان کے سیکھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے میں غیر ملکیوں نے کبھی دریغ نہیں کیا، سب سے پہلے ایران کے مشہور بادشاہ نوشیرواں کے عہد میں حکیم برزویہ نے ہندوستان آکر سنسکرت سیکھی۔ اور یہاں کی مشہور کتاب پنچ تنتر (کلیلہ دمنہ) کا ترجمہ فارسی پہلوی میں کیا۔ جس کو نصر بن نوح سامانی کے عہد میں رودکی نے نظم کا جامہ پہنایا۔ پھر بہرام شاہ غزنوی کے عہد میں ابوالمعالی (۵۳۹ء) نصراللہ مستوفی نے عربی سے فارسی میں کیا۔ اس کے بعد مولانا حسین کاشفی نے امیر شیخم سہیلی کے حکم سے اس کو آسان فارسی میں کیا اور انوار سہیلی نام رکھا۔ اور ابوالفضل نے آسان تر کر کے عیار دانش کے نام سے موسوم کیا۔ پھر شترنج کی کتاب کا ترجمہ ہوا جس کو چترنگ کہتے تھے۔

اسلامی عہد میں ہندوستان میں سب سے پہلے جب کالنجر کا راجہ سلطان محمود غزنوی کے خوف سے قلعہ بند ہو گیا ہے، اور کچھ دنوں کے بعد اطاعت پر مجبور ہوا، تو اس نے ایک قصیدہ سنسکرت میں سلطان محمود غزنوی کی شان میں لکھ کر پیش کیا، جس کا ترجمہ فارسی میں کیا گیا، اور جب محمود نے اس کو سنا، تو بہت خوش ہوا اور متعدد قلعے اس کو انعام میں دیئے[۲]۔

البیرونی بھی اسی عہد کا عالم ہے، جس نے ملتان میں ۱۶ برس مقیم رہ کر جو اس عہد میں علم کا مرکز تھا سنسکرت کی مکمل تعلیم حاصل کی۔ اس نے سنسکرت سے زیادہ تر عربی میں ترجمہ کیا ہے، جیسے کتاب الہند،

---

[۱] ماثر رحیمی جلد سوم کلکتہ۔ [۲] فرشتہ جلد اول ص۲۹ و طبقات اکبری ص۱۵ جلد اول کلکتہ،

غرۃ الازیاج وغیرہ، اس کی بعض کتابیں فارسی میں بھی ہیں۔

ہندوستان میں غلاموں کا عہد فقط فتوحات کا زمانہ ہے، ان کے عہد میں علمی کاموں کو کمتر فروغ ہوا۔ لیکن خلجی عہد سے اس طرف کافی توجہ کی گئی، چنانچہ علاؤالدین شاہ محمد خلجی متوفی ۷۱۶ھ کے عہد میں ایک صوفی نے جو آسام میں تھے، امرکنڈ کا ترجمہ فارسی میں کیا جس کا نام بحرالحیات رکھا۔ اس کا اصل مصنف کاماپنڈت ہے، جو سنسکرت کا ایک بڑا عالم تھا۔ پھر سلیس فارسی میں بھروچ کے دوستوں کے اصرار سے حسین گوالیاری بن محمد ساری چشتی نے کیا، جو اب طبع ہو گئی ہے۔[۱]

۷۶۴ھ میں جب فیروز شاہ تغلق نگر کوٹ (کانگڑہ) فتح کرنے گیا تھا تو جوالامکھی کے مندر کی کتابیں بھی اس کے ہاتھ آئیں۔ جن کی تعداد (۱۳۰۰) تھیں، سلطان نے برہمنوں سے اس کا حال دریافت کیا اور پھر تفصیل معلوم ہو جانے کے بعد سلطان نے مختلف فنوں کی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا۔

اسی عہد کے مشہور شاعر اعزالدین کو عقلی علوم سے بڑی دلچسپی تھی، اس نے حکمت طبعی، شگون اور فال کی کتابوں کا ترجمہ فارسی (نظم) میں کیا اور اس کا نام دلائل فیروز شاہی رکھا۔[۲] یہ کتابیں اکبر کے عہد تک موجود تھیں، چنانچہ ملا عبدالقادر بدایونی نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا ہے اور اس[۳] پر تنقید بھی کی ہے۔ سیر المتاخرین میں ہے کہ دلائل فیروزی کے ترجمہ پر سلطان نے خوش ہو کر مترجم کو سونا اور چاندی کے علاوہ جاگیر بھی عنایت کی۔

آٹھویں صدی کے آخر سے لے کر نویں صدی کے ابتدا تک مرکزی حکومت (دہلی) کے کم زور ہو جانے پر ہندوستان کے تقریباً سب صوبے خود مختار ہو گئے اور کم و بیش تقریباً دو سو برس تک ان کی سلطنت رہی۔ سیاسی اعتبار سے اس طرح متفرق ہو جانا ملک کے لئے اگرچہ نامبارک تھا لیکن علمی اور صنعتی اعتبار سے بہت مفید ثابت ہوا۔ ہر صوبہ میں کوئی نہ کوئی نکل آیا جس نے علم کو اپنے ملک میں کافی ترقی دی۔

---

[۱] یہ کتاب کتب خانہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ احمد آباد میں قلمی موجود ہے۔ [۲] فرشتہ جلد دوم صفحہ ۵۲ حیدرآباد
[۳] منتخب التواریخ جلد اول صفحہ ۲۳۹۔

کشمیر میں زین العابدین (۸۲۶ھ) میں ایک مشہور بادشاہ گذرا ہے۔ یہ بڑا منصف علم کا قدر داں اور فیاض بادشاہ تھا۔ یہ خود بھی کئی زبانیں جانتا تھا۔ اس کا دربار عالموں اور پنڈتوں سے بھرا رہتا تھا اور اس کی قدردانی سے علم کی ترقی میں لوگ کوشاں رہتے۔

مشہور کتاب راج ترنگنی مصنفہ پنڈت رگوناتھ اسی عہد کی لکھی ہوئی ہے۔ جس کو مولانا عماد الدین نے فارسی کا جامہ پہنایا۔ پھر مہابھارت کا ترجمہ فارسی میں پہلی دفعہ اسی کے زمانہ ۸۶۴ھ میں ہوا۔ اس کے علاوہ اور بے شمار کتابیں تصنیف کی گئیں[۱]

گجرات بھی کشمیر سے پیچھے نہ رہا۔ یوں تو تصنیفات کا سلسلہ سلطان احمد شاہ متوفی ۸۴۶ھ اول کے عہد سے شروع ہو گیا تھا۔ لیکن سلطان محمود اعظم (عرف بیگڑو) کا عہد بڑا ممتاز رہا۔ اس کا دربار ہر فن کے علما کا مخزن تھا۔ اس نے ایک محکمہ تراجم کا قائم کیا تھا۔ جس میں ماہر لوگ کام کرتے اور منتخب کتابوں کا ترجمہ فارسی زبان میں کرتے۔ چنانچہ تاریخ ابن خلکان کا فارسی ترجمہ اسی عہد میں ہوا۔

واگھ بھٹ ایک مشہور طبیب (وید) تھا، اس نے سنسکرت میں ایک طب کی کتاب لکھی ہے، جس کا نام "اسٹ انگ ردی" ہے۔ یہ بڑی مقبول کتاب ہے، اور علم طب میں بڑی مستند سمجھی جاتی ہے، علی محمد بن اسمٰعیل اساولی اصیلی، بڑے جید عالم تھے اور طب سے کامل واقفیت رکھتے تھے۔

۸۷۶ھ میں جب سلطان محمود (بیگڑو)، دوارکا (جگت) فتح کر کے واپس آیا تو قیام مصطفےٰ آباد (جوناگڑھ) میں ایک دن سلطان نے ان سے فرمائش کی، کہ واگھ بھٹ کی کتاب کا فارسی میں ترجمہ کر ڈالو، چنانچہ کئی پنڈتوں کی مدد سے اس کا مکمل ترجمہ ہو گیا، جو آج بھی موجود ہے، اس کتاب کا نام شفاء محمودی رکھا۔ طب محمود شاہی بھی اس کو کہتے ہیں۔

اس کتاب کو چھ استھان (مقامات) پر تقسیم کیا ہے۔ اور ہر استھان میں متعدد ادھیا (باب) دیا ہے، جن کی مجموعی تعداد ایک سو بیس[۱۲] ہے، یہ کتاب ابھی تک طبع نہیں ہوئی ہے۔

زیر تبصرہ نسخہ میں دو مقام تو مکمل ہیں اور تیسرے مقام میں ۱۶ باب ہیں۔ ان میں سے

---

[۱] طبقات اکبری جلد سوم ص۴۴۴ کلکتہ۔ [۲] واگھ بھٹ قلمی کتاب خانہ ورنکولہ سوسائٹی احمد آباد۔

صرف تیرہ باب اس کتاب میں موجود ہیں۔ اس کا لکھنے والا محمد عزت اللہ ہے، پہلا مقام ۶ اشعبان ۱۱۹۲ھ میں، اور دوسرا مقام ۱۱ رمضان ۱۱۹۸ھ میں ختم کیا۔ تیسرے مقام کے تیرھویں باب کو نامکمل چھوڑا ہے، یعنی آخری صفحہ خالی ہے، اس کتاب کا مکمل نسخہ بھروچ سے حیدرآباد پہنچ گیا ہے[1]۔

بیجاپور کو عادل شاہی حکومت میں بھی علوم وفنون کی ترقی کسی سے کم نہ تھی، چنانچہ ابراہیم عادل شاہ کے عہد میں ایک کتاب تصنیف کی گئی، جس کا اصلی نام تو دستورالاطبا ہے، مگر عام طور پر لوگ اس کو طب فرشتہ کہتے ہیں۔ اس کا مصنف محمد قاسم بن ہندو شاہ فرشتہ ہے۔ اس کی مشہور کتاب گلزار ابراہیمی ہے جو عام طور پر تاریخ فرشتہ کے نام سے مشہور ہے۔

مصنف نے اس میں سنسکرت زبان کی متعدد کتابوں سے مضامین انتخاب کر کے ترتیب دیا ہے، جیسے واگھ بھٹ، اشٹش رت وغیرہ، غرض ہندوستانی طب (وید) کو سنسکرت سے فارسی زبان میں اس نے پہلی دفعہ منتقل کیا۔ اس کی ترتیب بالکل ہندوستانی طب کے موافق ہے، اکثر دواؤں کا نام پہلے ہندوستانی میں لکھتا ہے پھر اس کا ترجمہ فارسی میں دیتا ہے۔

یہ کتاب ایک مقدمہ، تین مقالہ اور ایک خاتمہ پر منقسم ہے۔ مقدمہ ارکان بدن اور اخلاط کے بیان میں ہے۔ پہلے مقالہ میں دواؤں کے خواص اور غذائے مفرد کا بیان ہے، دوسرے میں مشہور مرکبات کا ذکر ہے اور تیسرے میں معالجات کا حال تحریر کیا ہے اور خاتمہ میں "منزہ" کی شرح اور ربع ممالک سکون کی تقسیم میں ہے۔ اس میں کہیں کہیں نظام شاہ اور کسی جگہ عادل شاہ کے درباری حکیموں کا مجرب نسخہ بھی درج ہے، اس میں کسی جگہ یونانی اور عربی حکما کا نام نہیں آتا۔ بلکہ ان کی جگہ ہمیشہ وہ سنسکرت داں وید کی مستند کتابوں کا حوالہ لاتا ہے۔

وہ ابتدا میں لکھتا ہے کہ ہندوستانی طب کے اصول کو مضبوط پایہ پر دیکھ کر میرے دل میں خیال آیا کہ اس کو فارسی میں منتقل کردوں، تاکہ ایران، توران اور عرب کے حکما اس سے فائدہ اٹھائیں ۹۹۷ھ میں مصنف احمد نگر سے بیجاپور گیا[2] یہاں ابراہیم عادل شاہ کے دربار میں ملازم ہوگیا۔

---

[1] طب فرشتہ قلمی کتب خانہ وریا سبھا احمد آباد [2] واگھ بھٹ قلمی کتب خانہ در بجولہ سوسائٹی احمد آباد

مصنف نے یہ کتاب اسی جگہ لکھی ہے، کیونکہ ابراہیم عادل شاہ کے درباری حکیم اور وید دونوں کے معالجات کے حکایات تحریر کرتا ہے، اغلب یہی ہے کہ تاریخ فرشتہ سے پہلے یہ کتاب لکھی گئی۔ میرا خیال ہے کہ ۹۹۵ھ اور ۱۰۰۰ھ کے درمیان اس نے تصنیف کی۔ اس کے بعد تاریخ فرشتہ ۱۰۱۵ھ میں مکمل ہوئی عرصہ دراز ہوا کہ اسی کتاب کو امرتسر کے ایک حکیم صاحب نے تھوڑے سے نسخے طبع کرائے تھے۔ وہ بھی نایاب ہیں۔ اس کا ایک نسخہ ہماری سوسائٹی میں اور دوسرا مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے کتب خانہ میں قلمی موجود ہے۔[1]

سکندر لودی شاہ دہلی کے زمانہ میں ایک بڑے عالم اور طبیب میاں بہوہ تھے، انہوں نے طب میں ایک کتاب معدن الشفا نامی لکھی۔ جو طب سکندری کے نام سے مشہور ہوئی۔ سکندر ان کا بڑا قدردان تھا۔ دیباچہ میں انھوں نے لکھا ہے کہ یونانی دواؤں کو یہاں کے مزاج کے موافق نہ پاکر میں نے ہندوستانی دواؤں کو یکجا کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ بادشاہ کے حکم سے یہ کتاب میں نے لکھی۔ اس میں سنسکرت کی مختلف کتابوں سے مثلاً چرت، چرکہ، چنتامن، چکروت، ناکھت وغیرہ کی کتابوں سے دواؤں کے نام، خواص اور علاج وغیرہ اخذ کیا ہے، دواؤں اور بیماریوں کے نام ہندی میں بھی دیئے ہیں، ۹۰۸ھ میں اس کی تکمیل ہوئی۔ یہ کتاب مطبع نول کشور لکھنؤ میں طبع ہو چکی ہے۔

ہندوستان کے صوبہ میں مالوہ بھی زرخیز اور مردم خیز خطہ تھا۔ وہاں بھی اچھے اچھے پنڈت، علماء اور صوفیا پیدا ہوئے، اجین ان کا مرکز تھا۔ اسلامی عہد میں شادی آباد کو رونق ہوئی اور اس جگہ بھی عالموں اور فاضلوں کا مغلیہ عہد تک مجمع رہا۔

اجین ہی میں ایک شخص نے صد النکار ایک کتاب لکھی۔ جو سنسکرت سے ماخوذ تھی، اس کے مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ، کوول یانند، اور بہاشا بھوشن، دونوں کتابوں کے مطالعہ کے بعد میرے ذہن میں آیا کہ اس کو فارسی زبان کا جامہ پہناؤں۔ چنانچہ فارسی کے قالب میں سو النکار لکھے کر ہدیہ ناظرین کئے اس میں تین فصلیں ہیں۔ پہلی میں ایک سو النکار کا اجمالی ذکر ہے (النکار اس فن کا نام ہے جس میں

---

[1] طب فرشتہ قلمی کتب خانہ ودیا سبھا احمد آباد

صنائع، بدائع، تشبیہ و استعارہ کا بیان ہو)

دوسرے میں اس کی تشریح ہے۔ تیسرے میں مخلوط اور مجموعۂ اشیا کا ذکر ہے۔ افسوس ہے کہ زیر تبصرہ کتاب ابتدا، وسط اور آخر سے ناقص ہے۔ اس نسخہ میں کل ''۵۹'' الفکار ہیں۔ یعنی تیسری فصل بالکل نہیں ہے۔ مصنف نے کسی جگہ اپنا نام ظاہر نہیں کیا ہے۔ اس فن کی کتابیں عربی میں بہت ہیں۔ لیکن مصنف نے اس بات کا خاص اہتمام رکھا ہے کہ ہر چیز کی مثال تمام تر فارسی اشعار سے ہے۔ اور پھر اس کی خود ہی تشریح بھی کرتا ہے۔

ہر عنوان کو حاشیہ پر سنسکرت میں تحریر کیا ہے۔ ایک دوسرا نسخہ بھولا ناتھ لائبریری سے ملا ہے لیکن وہ بھی ناقص ہے۔ اس لئے جب تک مکمل تیسرا نسخہ نہ مل جائے اس کی تکمیل مشکل ہے۔ فی الحال دونوں نسخے گجرات ودیا سبھا کے کتب خانے میں ہیں۔[1]

یوپی میں بدایوں ایک مردم خیز خطہ ہے، حضرت نظام الدین چشتیؒ اسی خاک پاک سے اٹھے اور مشہور مورخ عبد القادر بدایوں ہی کا باشندہ تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی متعدد علماء اور فضلا یہاں پیدا ہوئے، طوطی نامہ کے مؤلف بھی اسی جگہ کے رہنے والے تھے۔

آپ کا نام ضیاء الدین ہے۔ وطن آپ کا نخشب رجو ضلع بخارا میں ایک دلچسپ مقام تھا۔ عربی میں اس کو ''نسف'' کہتے تھے اور اسی لئے بعض علما کے نام کے ساتھ نسفی، کا لفظ ملتا ہے۔

جب تاتاریوں نے ساتویں صدی میں اس پر حملہ کیا تو ان کا خاندان وہاں سے ہندوستان چلا آیا تاتاریوں نے نصف میں اپنی چھاونی بنائی اور وہاں امیروں نے بکثرت محلات تعمیر کئے اور اس کا نام قرشی رکھا، تاتاری زبان میں اس کے معنی محل کے ہیں۔ اور یہ جگہ آج تک موجود ہے

مولانا ضیاء الدین کا خاندان ہندوستان میں اِدھر اُدھر گھومتا بدایوں میں آکر مقیم ہوگیا۔ مولانا نے شیخ محمد شہاب الدین مہرہ سے تعلیم کی تکمیل کی۔ شیخ فرید الدین ناگوری، بنیرہ شیخ حمید الدین ناگوری سے مرید ہوئے۔ عمر بھر درویشانہ زندگی بسر کی۔ باکمال شاعر تھے، ان کی متعدد تصنیفات تصوف وغیرہ

---

[1] صد الفکار قلمی کتب خانہ ودیا سبھا گجرات احمد آباد۔

میں ہیں۔ عربی، فارسی، سنسکرت اور سریانی زبان سے واقف تھے۔

مولانا نخشبی کی تصنیفات میں سب سے زیادہ شہرت طوطی نامہ کو ہوئی۔ یہ تقریباً ۵۵۰ ساڑھے پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے۔

اس کتاب کا ترجمہ سب سے پہلے کسی دوسرے شخص نے فارسی میں کیا تھا، اس میں ۵۲ حکایات تھے، مگر اس کی عبارت شگفتہ نہ تھی، ایک دن ایک بزرگ نے ان سے فرمائش کی، کہ تم اس کو فارسی میں شگفتہ طریقہ سے منتقل کر ڈالو، انہوں نے اس کو قبول کر لیا اور سنہ ۷۳۰ھ میں اس کو مکمل کر دیا یہ سلطان محمد تغلق کا عہد تھا۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کا خاندان بلبن کے آخر عہد یا خلجیوں کے ابتدائی عہد یعنی ساتویں صدی کے آخر میں ہندوستان آیا۔

یہ کتاب دراصل سنسکرت زبان میں تھی۔ اس کا نام "کوکا سپتی" تھا، اس ترجمہ میں باون حکایات ہیں۔ اکبر نے اس کو سادہ بنانے کا حکم دیا، ابوالفضل نے طوطی نامہ کو بہت ہی سہل بنا دیا۔ پھر سترھویں (عیسوی) میں محمد قادری نے اس کا خلاصہ کیا، جو ۳۵ ابواب (یا حکایات) پر مشتمل ہے۔ یہ بہت مقبول ہوا۔ اور دنیا کی متعدد زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔ ہندوستانی زبان میں سب سے پہلے غواصی نے فارسی سے ہندوستانی میں ترجمہ کیا۔ بنگالی میں "سی" منشی نے کیا، عبداللہ آفندی نے ترکی میں منتقل کیا، حمید لاہوری نے اس کو نظم کر ڈالا، ایران میں چہل طوطی کے نام سے جو افسانے لکھے گئے ہیں، اس کا مواد اسی سے حاصل کیا گیا۔ سنہ ۱۷۹۲ء میں اس کی بارہ کہانیوں کا ترجمہ انگریزی میں ہوا۔ قادری کے خلاصہ کو سنہ ۱۸۲۲ء میں ایک جرمنی نے جرمن میں لکھا، سنہ ۱۸۸۲ء میں ترکی ترجمہ سے پھر جرمنی میں ترجمہ ہوا۔ اسی طرح یونانی میں بھی اس کو تحریر کیا گیا۔ لیکن ان ترجموں میں سے کوئی بھی مکمل کتاب کا ترجمہ نہیں ہے۔ صرف ایک روسی نے اس کا مکمل ترجمہ روسی زبان میں کیا ہے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اس کا سنسکرت میں اصلی نام "شک سپ تتی" ہے۔ اس میں کل ستر کہانیاں تھیں۔ یہ کس کی تصنیف ہے۔ درحقیقت اس کا پتہ نہیں۔ لیکن عام طور پر مشہور شاعر کالی داس کا نام لیا جاتا ہے۔ لیکن خواص اہل علم اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ کتاب بارھویں صدی سے

چودھویں صدی عیسوی کے درمیان کی تصنیف ہے، ایسا محققوں کا خیال ہے۔

اصل یہ ہے کہ ایک کتاب سوم دیو نے سنسکرت میں "کتھا سرت ساگر" نامی لکھی، اس کو دیکھ کر دو ترین نے بھی اس طرز پر متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ لیکن ان میں سے سب سے زیادہ مقبولیت طوطی نامہ کو ہوئی گجراتی میں بھی سامل نامی ایک شخص نے ترجمہ کیا اور اس کا نام "سوڈا بھوتری" رکھا۔ اس میں اس نے (بہتّر) افسانے تحریر کئے ہیں۔ اصل افسانے میں ایک تاجر کا قصہ ہے۔ جو مختصر طور پر مندرجہ ذیل ہے۔

ایک تاجر کے پاس ایک طوطا بڑا دانا تھا۔ وہ جب تجارت کے لئے پردیس جانے لگا تو طوطے سے کہا کہ میری بیوی کی حفاظت کرتے رہنا۔ اس کے چلے جانے کے بعد کچھ دن جب گذر گئے، تو اس کی بیوی کی کسی سے آشنائی ہو گئی۔ اور اس نے رات کے وقت اُس سے ملنے کا ارادہ کیا اور طوطے سے صلاح لی۔ طوطا ہر شب ایک کہانی کہہ کر رات ختم کر دیتا، اس طرح سے اس نے اس کو روک رکھا۔ یہاں تک کہ اس کا شوہر تاجر واپس آگیا۔ اس کتاب سے اس عہد کا تمدن بخوبی معلوم ہوتا ہے اور اسی لئے اس کی شہرت زیادہ ہے۔[1]

بشن داس بھٹ دکن کا رہنے والا اور مہا پرش لوگوں میں سے تھا، اس کا ایک نوجوان چیلہ پورکھ نامی تھا، جس کو وہ اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا۔ تصوف کی طرف اس کو مائل کرنے کی بہت کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ کیونکہ پورکھ کا دل قصہ کہانیوں کی کتابوں اور دوسرے لہو ولعب کی طرف زیادہ مائل تھا یہ دیکھ کر بھٹ نے قصہ کے پیرائے میں ایک کتاب تصنیف کی، جس کا نام "پر بودھ چندرودے" رکھا۔ جس کے معنی طلوع قمر کے ہیں۔ گیارھویں صدی ۱۰۷۰ھ میں ایک صاحب سوامی بنوالی داس تھے، جن کا تخلص ولی تھا، فارسی کے ادیب اور تصوف کے ماہر۔

وہ لکھتے ہیں کہ ایک دن دوستوں کی مجلس میں بیٹھا تھا، کہ اس کتاب کا ذکر آیا۔ دوستوں نے فارسی میں اس کتاب کے ترجمے کی فرمائش کی۔ چنانچہ میں نے اس کتاب کو جو سنسکرت نظم میں تھی، فارسی کا جامہ پہنایا۔ کل کتاب چھ چمن پر تقسیم کی گئی ہے، چمن اوّل کا عنوان ہے، چہل اور صحبت

---

[1] کتب خانہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ احمد آباد۔

اغیار کے باعث انسان صورت اصلی کو فراموش کر دیتا ہے۔

زیر تنقید کتاب ۱۱۰۹ھ کی مکتوبہ ہے، اور کتب خانہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ احمد آباد میں موجود ہے مترجم نے اس فارسی ترجمہ کا نام "گلزار حال" رکھا ہے[1]

ایک کتاب "مجمع البحرین" ہے، جو "اُپ نِ کھت" کا ترجمہ ہے۔

یہ کتاب بھی سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کی گئی ہے، مترجم کا نام شاہ سرمد ۱۱۳۶ھ، ہے، اور کاتب کا نام سندر رام ولد اننت رام ہے، ابتدا میں ہے، یعنی ترک لذات کردہ پیش بر بہار فتہ پرسید، اور آخر میں ہے "وید انوکہ ہمہ ساعت می مرد تمام شد" خط فارسی، نستعلیق، اس میں مروجہ کتابوں کی طرح فصل اور باب نہیں ہے، مگر بطور فصل آخر میں تمام شد از اتھروں وید کا جملہ ہر مضمون کے ختم کے بعد آتا ہے۔ صفحات ۸۲ ہیں۔ یہ کتاب جناب قاضی نور الدین صاحب بھروچ کے کتب خانہ میں میری نظر سے گذری۔ یہ کتاب دارا شکوہ کے مجمع البحرین سے علاوہ کوئی کتاب ہے، اختلاف سنہ سے بھی اس کا یقین ہوتا ہے، مجھے افسوس ہے کہ قلتِ فرصت کے سبب سے اندرونِ کتاب کا مطالعہ نہ کر سکا[2]

مفتاح دانش نامی ایک کتاب جناب نواب صاحب بڑودہ کے کتب خانہ میں میری نظر سے گذری، یہ سنسکرت سے فارسی کی گئی ہے، اصل سنسکرت کتاب کا نام "نیت پردیپ کا" ہے۔ اس کے مترجم گوپال رائو منشی ہیں۔ فنِ سیاست میں یہ کتاب تصنیف کی گئی ہے، نواب جمال الدین صاحب کے نام معنون ہے، ۱۲ جمادی الاول ۱۲۶۰ھ کا یہ مخطوطہ ہے۔

اس وقت تک جو کچھ لکھا گیا بہ جز آخری فقرہ کے یہ سب عہدِ مغلیہ سے قبل کا ہے، اگر تتبع اور کوشش کی جائے تو اور بھی کتابوں کا کھوج لگایا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کی اسلامی سلطنتوں میں مغلیہ کا زمانہ تراجم کے متعلق سب سے زیادہ ممتاز

---

[1] کتب خانہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ [2] کتب خانہ قاضی نور الدین صاحب بھروچ قلمی [3] کتب خانہ نواب بڑودہ قلمی۔

نظر آتا ہے۔ اکبر اعظم ہند کا پہلا بادشاہ ہے، جس نے ایک وسیع پیمانہ پر باقاعدہ تراجم کا ایک ایسا محکمہ قائم کیا، جس میں مختلف فنوں کی کتابوں کو مختلف طریقوں سے ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ بعض لوگوں کو ایک ایک کتاب کا ترجمہ کرنے کے لئے حکم دیا گیا، اور بعض کتابوں کے ترجمہ کے لئے متعدد آدمی مقرر کئے گئے، یعنی ضخیم کتاب کے مختلف حصے ایک ایک کو دئے گئے، اور آخر میں ان پر نظر ثانی کے لئے ایک اور شخص مقرر ہوا۔ بعض کتابوں کے کئی کئی ترجمے کرائے گئے، یعنی پہلا ترجمہ ناپسند ہوا تو کسی دوسرے شخص سے اس کا ترجمہ کرایا گیا، اور بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ ایک کتاب کا ترجمہ پہلے سے مشہور تھا، لیکن اس کی عبارت مغلق اور مشکل تھی، اس کو دوبارہ سلیس اور سہل عبارت میں کرایا گیا، یہ زمانہ علمی حیثیت سے بڑا مبارک عہد تھا۔ اس محکمہ میں جن لوگوں سے کام لیا گیا، ان میں سے ممتاز لوگ مندرجہ ذیل تھے۔

فیضی، ابوالفضل، عبدالقادر بدایونی، شیخ محمد سلطان، نقیب خاں، کشن پنڈت، کاشی ناتھ، سری بھٹ، دیوی برہمن، کشن جوتشی، گنگادھر، مہیش، مہانند[1]

ان میں سے فیضی نے جن کتابوں کا ترجمہ کیا، اس میں مثنوی نل دمن، مشہور کتاب ہے، اس کا اصلی نام "نی شدھ چرت" ہے، اس کا مصنف سری ہرش ہے، یہ بہت ہی قدیم کہانی ہے، اس کا ذکر مہابھارت میں "نل اپاکیان" (نرو پاکھیان) کے نام سے آتا ہے، پھر پران میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔ اس کا مصنف سری ہرش بنارس کے راجہ جے چندر کے دربار میں اپنے باپ ہیر (ہیرا) کی جگہ کام کرتا تھا، جے چندر کی فرمائش سے نل دمینتی (نل دمینتی) کے قصہ کو نظم کی لڑی میں پرو دیا۔

یہ بہت بڑا شاعر تھا، کالی داس، بھارُوی، اور ماگھ، کے ہم رتبہ تسلیم کیا جاتا ہے، اس تصنیف کی اہمیت کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ مذکور شعرا کی چیدہ تصنیفات، کمار سبھ دم، رگھو ونشم، کراتار جونی یم، اور شسشو پال ودھم کے ساتھ، نی شدھ چرتم، کا اضافہ جب کیا جائے تو ان کو پنج کاویہ کہا جاتا ہے عربی کے سبعہ معلقہ کی طرح یہ پنج کاویہ (پانچ نظم اعظم) بھی سنسکرت زبان کی بہترین مستند نظم ہے جس کا جواب آج تک نہ ہو سکا۔ کیوں کہ اس میں صنائع بدائع کی ایسی بھرمار ہے، کہ دوسروں کے لئے تقلید تو کیا،

---

[1] مقالات شبلی جلد ششم صفحہ ۱۰۵ اعظم گڈھ۔

اس کا سمجھنا بھی مشکل ہے۔

اکبرِ اعظم کے دربار کا مشہور ملک الشعرا "فیضی" تھا۔ بادشاہ کے حکم سے اس نے بڑی محنت کرکے اس کتاب کو فارسی نظم کے قالب میں ڈھالا، اس میں کل چار ہزار اشعار ہیں۔ سنہ ۳۹ جلوس بموافق سنہ ۱۰۰۳ھ کی تالیف ہے [1]۔

اس کتاب کے قصہ کا بہت ہی اختصار یہ ہے کہ،

ہندوستان کی سرحد پار ایک راجہ رہتا تھا، جس کا نام "نل" تھا۔ ایک دن اس نے ایک ہنس (بط) پکڑا، اس نے کہا کہ اگر تم مجھ کو چھوڑ دو، تو تمہاری شادی ایک بڑی خوبصورت لڑکی سے کرادوں گا، اس نے چھوڑ دیا۔

ادھر ملک برار کے راجہ کی ایک بڑی خوب صورت لڑکی تھی، جس کا نام دمینتی تھا، اس نے عہد کیا کہ اپنے ہی جیسا خوب صورت سے شادی کروں گی، باوجود تلاش کے عرصہ تک اس کو کوئی نہ ملا۔ ایک دن ہنس گھومتا پھرتا اس کے باغ میں پہنچا، اور دمینتی سے نل کی بڑی تعریف کی۔ وہ راضی ہوگئی مگر مشکل یہ آپڑی کہ وہ ہندوستانی نہ تھا، آخر ترکیب یہ سوچی گئی کہ سویمبر میں ملکی اور غیر ملکی دونوں طلب کئے جائیں، چنانچہ نل بھی آیا اور دونوں کی شادی ہوگئی۔

نل ایک دفعہ جوئے میں سب ہار گیا اور رانی کو لے کر جنگل جنگل مارا مارا پھرتا رہا۔ پھر اس کو خیال آیا کہ میرے ساتھ اس کو مفت تکلیف ہورہی ہے، اس کو چھوڑ کر اگر چلا جاؤں تو یہ اپنے گھر جاکر آرام سے رہے گی۔ چنانچہ ایک شب اسے سوتا چھوڑ کر وہ چلا گیا۔ رانی بھی اپنے کسی رشتہ دار کے یہاں جاکر مقیم ہوگئی، اور نل کو تلاش کراتی رہی۔ لیکن وہ نہ ملا، آخر اس کو ایک تدبیر سوجھی، اس نے اعلان کیا کہ وہ اپنی شادی کے لئے سویمبر کرنا چاہتی ہے اور تاریخ اس قدر قریب کی دی کہ اتنا جلد وہاں پہنچنا مشکل تھا۔

اجودھیا کے راجہ کو بھی اس کی خبر ملی۔ وہ چاہتا تھا کہ سویمبر میں شرکت کرے مگر دوری حائل

---

[1] نل دمن قلمی کتب خانہ گجرات ودیا سبھا احمد آباد

تھی، آخر اس نے اپنے گاڑی بان سے اس کا ذکر کیا، اس نے وہاں وقت پر پہنچا دینے کا وعدہ کیا، یہ گاڑی بان اصل میں نل تھا، جس نے نوکری کر لی تھی، وہ گھوڑے کے فن کا بڑا ماہر تھا، چنانچہ جب وہ پہنچا اور دوسرا کوئی نہ پہنچ سکا تو دمینتی سمجھ گئی کہ اس قدر جلد نل کے سوا کوئی اس قدر تیز گھوڑا لا نہیں سکتا لیکن اس کا رنگ وروپ بدلا ہوا تھا، اس لئے اس کو شناخت کرنا مشکل تھا، دمینتی اس کی مختلف عادتوں سے واقف تھی، انھیں کے ذریعہ اس کی معرفت کر کے، اس سے خود نل ہونے کا اقرار کرایا۔ دیوتاؤں کی مہربانی سے وہ پھر اصلی رنگ وروپ پر آگیا اور پھر دونوں آرام سے رہنے لگ گئے۔

یہ مثنوی جس کا نام "نل دمن" رکھا، بہت مشہور ہوئی، اکبر نے اس کا ایک مصور اڈیشن بھی تیار کرایا[1]

سنسکرت کی ایک مشہور کتاب "سِنگھاسن بتیسی" ہے۔ اصل میں یہ سنسکرت کے دو لفظ سے مرکب ہے۔ ایک سینہ، جس کے معنی شیر کے ہیں۔ اور دوسرا آسن، جس کے معنی بیٹھنے کے ہیں۔ یعنی شیر کے بیٹھنے کی جگہ۔

راجہ بکرماجیت جس تخت پر جلوس کرتا تھا، اس کے سامنے کے دونوں سروں پر دو شیر بنے ہوئے تھے، اسی سبب سے اس کو "سینہ آسن" کہتے تھے، کثرت استعمال سے پھر "سنگھاسن" ہوگیا (یہ نام اسی طرح کا ہے جیسا کہ شاہجہاں کے زمانہ کا تخت طاؤس)، اس تخت کے نیچے تیس پتلیاں تھیں جو گویا تخت کو اٹھائے ہوئے تھیں۔

جب راجہ بکرماجیت کا انتقال ہوگیا، تو اس قابلیت کا راجہ نہ ہونے کے سبب سے لوگوں نے اس تخت کو دفن کر دیا، راجہ بھوج کا جب عہد آیا تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا، ایک دفعہ ایک مقدمہ میں راجہ نے غلط فیصلہ کیا، اس کا بڑا چرچا ہوا، ایک میدان میں چند لڑکے کھیلتے تھے، انہوں نے اس مقدمہ کا بھی کھیل کیا، اس میں سے ایک لڑکا ایک خاص مقام پر بیٹھا اور راجہ بن کر اس کا فیصلہ کیا، اس فیصلہ کا بھی بڑا چرچا ہوا، راجہ کو بھی معلوم ہوا، لڑکوں کو بلا کر فیصلہ سنا، لیکن تجربہ سے

---

[1] دربار اکبری صفحہ ۳۷ لاہور۔

معلوم ہوا، کہ لڑکا جب میدان کے خاص مقام پر بیٹھ کر فیصلہ کرتا ہے، تو بہت عادلانہ ہوتا ہے، اس لئے راجہ کے حکم سے یہ مقام کھودا گیا، تو سنگھاسن نکلا، راجہ بھوج نے جب اس پر بیٹھنا چاہا تو پتلیوں نے کہا کہ اس پر وہی شخص بیٹھ سکتا ہے، جو بکرماجیت جیسی اہلیت رکھتا ہو، راجہ نے ان سے اس کا حال دریافت کیا، ایک ایک پتلی روزانہ اس کے اخلاقِ حمیدہ قصہ کے پیرائے میں بیان کرتی، اس طرح بتیس ۳۲ دن میں یہ قصے ختم ہوئے، پھر راجہ بھوج نے ان سب کا جواب دے کر مطمئن کر دیا، یہی بتیس کہانیاں ہیں جو سنگھاسن بتیسی کے نام سے مشہور ہے۔

اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ متعدد اشخاص نے ایسی طرز کی کتابیں تصنیف کیں، لیکن اس کتاب کی طرح مقبولیت کا درجہ کسی کو نہ ملا۔ اس کے مصنف کا نام معلوم نہیں۔ بعض لوگوں نے کالی داس کا نام لیا ہے۔ مگر یہ بے پایہ بات ہے، اصل سنسکرت کے علاوہ مول گجراتی جدید گجراتی، پراکرت، اپ بھرنش، بنگالی، ہندی، انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے، اکبر بادشاہ کے عہد میں اس کا بھی ترجمہ کرنے کا حکم دیا گیا، چنانچہ خواجہ حسین مروی نے فارسی میں نظم کرنا شروع کر دیا، مگر ۹۷۹ھ میں وفات پاجانے سے غالباً نامکمل رہ گیا، پھر ملا عبدالقادر بدایونی نے اس کو ۹۸۲ھ میں نثر میں اس کا ترجمہ کر کے "خرد افزا" نام رکھا۔ یہ نام تاریخی ہے، کلکتہ سے انیسویں صدی عیسوی میں لوہے کے ٹائپ کے ذریعہ اردو زبان میں ترجمہ کر کے شائع کیا گیا۔

وید کا چوتھا حصہ جس کو اتھرین وید کہتے ہیں، شیخ بھاون ایک نومسلم برہمن نے ۹۸۳ھ میں ملا عبدالقادر بدایونی، شیخ فیضی، اور حاجی ابراہیم سرہندی کی مدد سے فارسی میں ترجمہ کیا، اس کا ایک نسخہ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے کتب خانہ میں موجود ہے، اسی طرح مہاراج سری کرشن کے حال میں ایک مشہور کتاب "ہری ونس" تھی، ملا شیری نے سنسکرت سے اس کا ترجمہ فارسی میں کیا۔

اکبری دربار کے نورتن میں عبدالرحیم خان خانان کا پایہ بہت بلند تھا، یہ سپہ سالار شمشیر زنی میں جس طرح مشاق نظر آتا ہے، اسی طرح قلم کا بھی دھنی تھا، یہ سنسکرت، ہندی، فارسی اور ترکی کا ماہر تھا، اس کو نثر اور نظم دونوں پر قابو تھا، اس نے بابر کے "تزک" کا ترکی سے فارسی میں ترجمہ کیا، جو تزک بابری کے نام سے آج شائع

ہوگئی ہے، اس کی ہندی نظم تمام اہل ذوق بڑی دل چسپی سے آج بھی پڑھتے ہیں۔ اس نے جوتش کا بھی اچھا مطالعہ کیا تھا، چنانچہ ایک کتاب اس نے اس خوبی سے اس فن (جوتش) پر لکھی کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے، یہ کتاب نظم میں ہے، اس کا پہلا مصرعہ فارسی اور دوسرا سنسکرت میں ہوتا ہے، اس سے اس کی قابلیت کا اندازہ ناظرین کرسکتے ہیں، ۹۹۷ھ میں یہ نظم مکمل ہوئی[1]

اسی عہد میں ایک عالم مکمل خاں تھے، ان کو عام طور پر علوم وفنونِ مروجہ سے کامل واقفیت تھی، مگر علم نجوم میں ان کو بڑی مہارت تھی؛ اکبری عہد میں گجرات سے پایہ تخت پہنچے، اور محکمہ تراجم میں شامل کرلئے گئے، سنسکرت کی مشہور کتاب "تاجک" نامی جو علم ہیئت میں تھی، اس کا ترجمہ ان کے سپرد ہوا جس کو انہوں نے انجام تک پہنچایا باوجود گجراتی ہونے کے گجرات میں ان کو کوئی نہیں جانتا، البتہ ایسی کتاب کی بدولت آج تک کتابوں میں ان کا نام روشن ہے۔

وششٹھ اور رام چندر دو رشیوں کے درمیان دینی اور اخلاقی مسائل پر جو مکالمہ ہوا تھا، اس کو تحریر میں لاکر اس کا نام "جوگ وششٹھ" رکھا، ابوالفضل، ملاشاہ اور نقیب خاں نے مل کر فارسی میں اس کا ترجمہ کیا، اسی طرح ابوالفضل نے کشن جوشی کا بھی ترجمہ فارسی میں کیا اور "مہیش مہانند" کو بھی ابوالفضل نے فارسی کا جامہ پہنایا[2]

مہابھارت کا وہ حصہ جو بھگوت گیتا کے نام سے مشہور ہے، اس کا ابھی تک ترجمہ نہیں ہوا تھا، چنانچہ ابوالفضل نے فارسی میں اس کا بھی ترجمہ کرڈالا، لیکن ابھی حال میں منشی جگر ریش پرشاد ایم اے نے گوالیار کے مطبع سے بھگوت گیتا کا فارسی ترجمہ شائع کیا ہے، مترجم کا نام فیضی بتایا ہے۔ یہ چھوٹی تقطیع پر کل ۱۰۴ صفحات ہیں، کل کتاب نظم میں ہے، اس میں اٹھارہ ۱۸ ادھیائے (فصلیں) ہیں۔ فصل اول کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

طراز ندۂ داستاں کہن ؛ بدیں ساں بیفگند طرح سخن ؛ اور کتاب کا خاتمہ اس شعر پر ہے، "بکن سجدۂ شکر پروردگار ؛ کہ آمد ز دست تو زیں گونہ کار۔ بہت ممکن ہے کہ اصل ترجمہ فیضی ہی کا ہو، جس کو غلطی سے لوگوں نے ابوالفضل کی طرف منسوب کردیا۔

---

[1] دربار اکبری، بیان اکبر کی عہد کی تصانیف، [2] لٹریری ہسٹری بائی عبدالغنی ص۲۳۲ الہ آباد

ہندوستان میں علومِ حدیث کی تالیفات

از

(شیخ الحدیث مولانا حبیب الرحمن الاعظمی)

"برہان (اگست دستمبر (دسمبر ۱۹۵۳ء) میں مسطورہ بالاعنوان کے ماتحت مولانا ابوسلمہ شفیع احمد بہاری کا مضمون پڑھ کر خیال ہوا کہ اگرچہ مولانا نے تمام تالیفات کے استیعاب کا ارادہ نہیں کیا ہے تاہم اس سلسلہ کی جن تالیفات کا اب تک ذکر نہیں ہوا ہے ان میں سے جن کے نام اس وقت ذہن میں ہیں، ان کو بھی پیش کر دیا جائے تو خالی از فائدہ نہیں ہے، ذیل کی سطریں اسی خیال کی تکمیل ہیں"۔

(۱) ترجمہ مشارق الانوار، علوم حدیث کی ہندوستانی تالیفات میں یہ ایک قدیم تالیف ہے، ملا عزیز اللہ مداری لکھتے ہیں۔

شیخ سلیمان محدث کہ از فحول محدثین بودہ صاحب، ترجمہ صغانی ست در ہشت صد و شصت و پنج تمام کردہ بنظر شریف میر سید صدر جہاں گزرانیدہ۔[1]

شیخ سلیمان محدث زبردست محدثین میں سے تھے انھوں نے صغانی (مشارق الانوار) کا ترجمہ کیا ہے، ۸۶۵ھ میں ترجمہ پورا کر کے میر سید صدر جہان کی خدمت میں پیش کیا۔

(۲) معدن الاسرار شرح مدارج الاخبار، مولانا ابوسلمہ صاحب نے جس مدارج الاخبار کا ذکر اپنے مضمون میں کیا ہے[2] یہ کتاب اسی کی شرح ہے، شرح و متن دونوں خواجہ مبارک بن شیخ ارزانی

---

[1] تحفۃ الابرار قلمی ورق ۲۱ [2] اس کتاب کا ذکر مولوی ابویحییٰ امام خاں نوشہروی شرح مشارق کے سلسلہ میں کر چکے ہیں (ملاحظہ ہو معارف دسمبر [illegible]) مولانا ابوسلمہ بہاری نے شاید سہواً اس کو غیر مذکورہ تالیفات میں شمار کر دیا، ہاں سابق الذکر کا مدارج الاخبار کو شرح مشارق لکھنا صحیح نہیں ہے،

کی کاوش و محنت کا نتیجہ ہیں، معدن الاسرار کا سال تصنیف ۹۵۲ھ ہے، اور اس کو خواجہ مبارک نے اسلام خاں سور کے نام سے معنون کیا ہے[1]۔

اس کتاب کے مصنف کا اصل نام مبارک ہے، مگر اُس عہد کے دستور کے مطابق ان کا نام باپ کے نام کے ساتھ ملا کر خواجہ مبارک ارزانی لکھا جاتا تھا، بعد میں کسی نے شاید مبارک کو لقب و وصف سمجھ کر حذف کر دیا، اور صرف خواجہ ارزانی لکھ دیا، جس سے شبہ ہونے لگا کہ ان کا نام خواجہ ارزانی ہے، حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے، ملا عزیز اللہ مداری جو خواجہ مبارک کے نواسے ہیں انھوں نے ان کا نام خواجہ مبارک ارزانی اور ان کے والد کا نام شیخ ارزانی لکھا ہے، ملا نے یہ بھی لکھا ہے کہ از فحول محدثین بودہ اور ان کی تصنیفات حدیث میں مندرجہ ذیل کتابوں کے نام بھی لکھے ہیں۔

(۳) ریحانی شرح مشکوٰۃ المصابیح

(۴) شرح حدیث انما الاعمال بالنیات وحدیث الایمان بضع وسبعون شعبۃ

مدارج الاخبار کے مصنف کا نام شاہ یٰسین صاحب بنارسی نے بھی خواجہ مبارک لکھا ہے اور ان کو زبدۃ المحدثین کے لقب سے یاد کیا ہے اور لکھا ہے کہ عالم باعمل اور محدث کامل تھے (منقا قبل حین الکلام الحکمی)

(۵) الفصول شرح جامع الاصول، از حضرت شیخ علی متقی المتوفی ۹۷۵ھ اس کا قلمی نسخہ بانکی پور میں ہے۔

(۶) شمائل النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) از شیخ مذکور اس کا قلمی نسخہ علی گڈھ میں ہے۔

(۷) البرہان فی علامات مھدی آخر الزمان، بڑی تقطیع کے چھیالیس (۴۶) ورق کا ایک رسالہ ہے اس کے مولف شیخ علی متقی رحمۃ اللہ ہیں، مہدی کے باب میں جو حدیثیں وارد ہوئی ہیں ان کو مصنف نے اس رسالہ میں یکجا کر دیا ہے، مولف کا بیان ہے کہ میں نے سیوطی کے رسالہ العرف الوردی کو مبوب کر دیا ہے اور جمع الجوامع سے کچھ احادیث کا اضافہ بھی کیا ہے

---

[1] تحفۃ الابرار قلمی ورق ۳۲

(۸) حواشی مشکوٰۃ از شیخ عبداللہ سندی، مصنف حضرت شیخ علی متقی کے خلیفۂ خاص اور یاران با اختصاص میں تھے، علم حدیث شیخ متقی اور ابن حجر مکی سے حاصل کیا تھا، عربیت میں اتنے ماہر تھے کہ ابن حجر ان سے کہا کرتے تھے اعرب لنا ھذا الکلام (ذرا اس کی عربی کردو) شیخ عبداللہ کے اجازت نامہ میں ابن حجر نے یہاں تک لکھدیا کہ انھوں نے جتنا مجھ سے استفادہ کیا اس سے زیادہ میں نے ان سے استفادہ کیا، شیخ عبداللہ نے مشکوٰۃ کا ایک نسخہ تصحیح کا لکمال اہتمام کر کے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا، اور اس پر حاشیہ بھی لکھا تھا، حواشی میں مذہب حنفی کی تائید اور اس کے دلائل ذکر کئے تھے، فرماتے تھے کہ میں نے مشکوٰۃ کو حنفی بنا دیا ہے، یہ بھی فرماتے تھے کہ میں نے اپنی عمر میں سب سے اچھا کوئی کام کیا ہے تو یہی مشکوٰۃ کی تصحیح ہے، مجھ کو اسی سے مغفرت کی امید ہے، سنہ ۹۹۶ھ میں وفات پائی (تفصیل، حدائق الحنفیۃ، و تذکرہ علمائے ہند)

(۹) الحواشی علی منہج العمال فی سنن الاقوال، منہج العمال شیخ علی متقی کی تصنیف ہے، اور اس پر مولانا نجیب بن قاسم چندراوتی احمد آبادی نے حاشیہ لکھا ہے، اس میں حمد و صلوٰۃ کے بعد فرماتے ہیں اما بعد فقد فرغت من مطالعۃ ھذہ النسخۃ ..... ومن تصحیحہا ومقابلتہا وکتابۃ حواشیہا من اولہا الی اخرہا بعون اللہ وحسن توفیقہ فی الضحوۃ الکبری فی الیوم التاسع والعشرین من الشہر المعظم المبارک شہر رمضان عمت وشاعت برکاتہ سنۃ ست وخمسین وتسع مائۃ فی شہر احمد آباد صینت عن الآفات والبلیات وحرسہا اللہ عن الحوادث والنکبات فالمامول من الناظرین والمرجومن المستفیدین من ھذہ النسخۃ ان لاینسونی من دعائہم المستجاب قالہ افقر العباد الی اللہ الغنی نجیب بن قاسم المرحوم الجند راونی

منہج العمال کا قلمی نسخہ جس پر یہ حواشی ہیں جامع مسجد بمبئی کے کتب خانہ میں ہے، یہ نسخہ محشی کے بھانجے قاضی عبداللہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس کا سن کتابت سنہ ۹۸۶ھ ہے، شیخ نجیب کا مزید حال معلوم نہیں ہو سکا، خود ان کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ حواشی مصنف کی زندگی میں لکھے

ہیں، کچھ بعید نہیں کہ وہ شیخ مصنف کے شاگرد بھی ہوں۔

(۱۰) مختصر المواہب اللدنیۃ، یہ شیخ طاہر بن یوسف سندی کی تالیف ہے، اس کا قلمی نسخہ میں نے جامع مسجد بمبئی کے کتب خانہ میں دیکھا ہے، اس کے سرورق پر نسخہ کے قدیم مالک علی بن عبد اللطیف سندی نے کتاب و مصنف کتاب کا نام یوں لکھا ہے الفوائد الاحمدیہ لتاج المحدثین شیخ طاہر السندی مگر خود مؤلف نے کتاب کے اخیر میں یوں لکھا ہے ہذہ النسخۃ فوائد محمدیۃ مستخرجۃ منتخبۃ من المواہب اللدنیۃ استخرجہا فقیر طاہر بن یوسف۔ اس نسخہ کا کاتب حسین بن یحیٰی ہے جس نے اس کو سنہ ۱۰۰۲ھ میں نقل کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب کم از کم دسویں صدی ہجری میں تالیف ہوئی ہے، مؤلف کی وفات سنہ ۱۰۰۴ھ میں ہوئی، ان کے حالات کے لئے میرا مضمون "ضمیمہ حیات شیخ عبد الحق" ملاحظہ کیا جائے۔

(۱۱) اسامی رجال صحیح بخاری

(۱۲) موجز القسطلانی (قسطلانی شرح بخاری کا اختصار)

(۱۳) ملتقط جمع الجوامع (سیوطی کی جمع الجوامع کا انتخاب)

یہ تینوں کتابیں بھی تاج المحدثین علامہ طاہر بن یوسف سندی کی تصنیف ہیں۔

(۱۴) شرح صحیح البخاری، مصنفہ حکیم عثمان بن شیخ عیسیٰ بن شیخ ابراہیم صدیقی بوبکانی سندی ثم البرہانفوری، آپ شیخ وجیہ الدین علوی اور قاضی محمود مومنی اور شیخ حسین بغدادی کے شاگرد تھے، اور قاضی نصیر الدین بن شیخ سراج محمد بنبانی، شیخ صالح سندی اور قاضی عبد السلام سندی شارح مختصر وقایہ کو آپ سے شرف تلمذ حاصل تھا، آپ کی تصنیفات میں شرح بخاری کے علاوہ بیضاوی کے حواشی بھی ہیں، سنہ ۱۰۰۸ھ میں چوروں کے ہاتھ سے شہید ہوئے (گلزار ابرار)

کتب خانہ رامپور میں ایک کتاب دو جلدوں میں غایۃ التوضیح للجامع الصحیح مصنفہ علامہ عثمان بن ابراہیم الصدیقی الحنفی کے نام سے موجود ہے، میرا خیال ہے کہ وہ یہی کتاب ہے جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔

(۱۵) شرح شمائل ترمذی، تصنیف شیخ محمد عاشق بن عمر حنفی محدث فقیہ، شاگرد مخدوم الملک عبداللہ بن شمس الدین انصاری سلطان پوری، (المتوفی سنہ ۹۹۰ھ) مصنف نے سنہ ۱۰۳۲ھ میں وفات پائی، اس کتاب کا قلمی نسخہ مولانا شمس الحق ڈیانوی کے کتب خانہ میں تھا، اب معلوم نہیں موجود ہے یا ضائع ہو گیا۔

(۱۶) مثبت الشیخ عبدالحق المحدث الدہلوی، یہ ایک مختصر رسالہ ہے جس میں شیخ نے اپنی اسانید حدیث جمع کر دی ہیں اور وہ اجازت نامے بھی نقل کر دئے ہیں جو ان کے شیوخ حدیث نے ان کو مرحمت فرماتے ہیں۔

(۱۷) اشرف الوسائل، شرح شمائل ترمذی، یہ کتاب شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے پڑپوتے شیخ سیف اللہ (بن نور اللہ بن نور الحق بن عبدالحق) کی تصنیف ہے، ۲ رجب سنہ ۱۰۹۱ھ کو مکمل ہوئی اور اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کی گئی (حیات شیخ عبدالحق صہ ۲۶۱)

(۱۸) ترجمۂ فارسی شمائل ترمذی، یہ کتاب قطب الدین محمد شاہ عالم بادشاہ غازی کے عہد میں اور ان کے حکم سے سنہ ۱۱۲۳ھ میں تالیف ہوئی، چھوٹی تقطیع کے ۳۳۹ ورق پر لکھی ہوئی جامع مسجد بمبئی کے کتب خانہ میں موجود ہے، میں نے اس کا سرسری مطالعہ کیا ہے، دیباچہ کتاب میں مؤلف نے اپنا نام قاضی محمد عاقل بن شیخ محمد غازی بتایا ہے اور ان الفاظ میں اپنا تعارف کرایا ہے "آستان بوس مدرسہ امام المحققین شیخ نور محمد لاہوری و مدرسہ قدوۃ المحدثین والمفسرین شیخ الحرمین شیخ احمد عرف شیخ جیون"۔ اس تعارف سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف ملا جیون امیٹھوی (المتوفی سنہ ۱۱۳۰ھ) کے شاگرد تھے۔

(۱۹) زبدۃ المقاصد فی تجرید الزوائد، یہ المقاصد الحسنہ (سخاوی) کا خلاصہ ہے، مؤلف نے لکھا ہے کہ میں نے مقاصد حسنہ سے ان چیزوں کو منتخب کر کے جمع کر دیا ہے، جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام قطعاً نہیں ہے، بلکہ امت کے کسی عالم یا ولی وغیرہ کا کلام ہے مگر حدیث کے نام سے ان کی شہرت ہے، اس رسالہ میں وہ اقوال حروف کی ترتیب پر مذکور ہیں پہلا قول آخر الطب الکی ہے۔

(۲۰) تذکرۃ الاحیاء فی تصفیۃ الاحیاء، یہ حافظ عراقی کی تخریج احادیث احیاء العلوم کی تلخیص ہے، مؤلف کا بیان ہے کہ میں نے اس رسالہ میں صرف ان روایات کو تخریج احیاء سے منتخب کرلیا ہے جو موضوع یا منکر ہیں یا جن کی سند میں کوئی کذاب یا متہم بالکذب یا مردود یا متروک یا فاسق راوی ہے یا جس کی سند محدثین کے نزدیک معروف نہیں ہے۔

یہ دونوں کتابیں شیخ ابو الفضل عبدالحق بن فضل اللہ المحمدی البنارسی کی تالیف ہیں، مؤلف کا سال وفات ۱۲۸۶ھ ہے، بحمداللہ سبحانہ میں ۷ و ۱۶ و ۱۹ و ۲۰ کے مطالعہ سے بہرہ یاب ہوا ہوں۔

(۲۱) رسالہ صداق السیدۃ فاطمۃ الزہراء، تصنیف شیخ صبغۃ اللہ بن محمد غوث مدراسی۔

(۲۲) ازالۃ الغمۃ فی حدیث اختلاف الامۃ، تصنیف شیخ صبغۃ اللہ المدراسی

(۲۳) رسالہ تعلیم النساء الکتابۃ، تصنیف شیخ سابق الذکر

ان تینوں رسالوں کے قلمی نسخے کتب خانہ جامع مسجد بمبئی میں میرے مطالعہ سے گذرے ہیں

(۲۴) ذیل القول المسدد، یہ حافظ ابن حجر کے رسالہ القول المسدد کا تتمہ ہے، اور اسی کے ساتھ حیدرآباد میں چھپا ہے، اس کے مصنف بھی شیخ صبغۃ اللہ مذکور ہیں سال تصنیف ۱۲۷۹ھ ہے۔

(۲۵) کشف الاحوال فی نقد الرجال، یہ کتاب سابق الذکر محدث کے بھائی شیخ عبدالوہاب بن مولوی محمد غوث کی تصنیف ہے، اور المقاصد الحسنہ کے ساتھ طبع ہوکر لکھنؤ سے مدت ہوئی شائع ہوچکی ہے۔

(۲۶) رسالہ در اصول حدیث

(۲۷) فرہنگ صحیح مسلم

(۲۸) تذکرۃ الموضوعات

یہ تینوں کتابیں دارالعلوم ندوہ میں موجود ہیں اور فہرست میں مصنف کا نام مولانا عبداللہ محمدی الہ آبادی لکھا ہوا ہے، ان میں سے بعض خود مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں، سن کتابت ۱۲۶۵ھ ہے۔

(۲۹) خیر المواعظ، احادیث کا ایک عمدہ مجموعہ ہے طبع بھی ہو چکا ہے، اس کی دو جلدیں ہیں، اس کے مصنف مولانا محمد زماں خاں شاہجہاں پوری استاد نظام الملک محبوب علی خاں نواب حیدر آباد ہیں، آپ کی شہادت ۱۲۹۲ھ میں ہوئی، تفصیلی حالات کے لئے "تذکرہ علمائے ہند" ملاحظہ کی جائے۔

(۳۰) اربعین مسمی احادیث الحبیب المتبرکۃ، یہ تاریخی نام ہے (۱۲۶۵ھ)، جمع کردہ حضرت مفتی عنایت احمد (تلمیذ حضرت شاہ اسحاق دہلوی) متوفی ۱۲۷۹ھ

(۳۱) اربعین مسمی بہ تسخیر (تاریخی نام ۱۲۷۰) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی اربعین کا منظوم ترجمہ، از مولوی ہادی علی لکھنوی۔

(۳۲) ضوء المشکوۃ، حاشیہ مشکوۃ، مصنفہ مولانا فیض الحسن ادیب سہارنپوری (المتوفی ۱۳۰۴ھ) اس کتاب کا قلمی نسخہ کتب خانہ ٹونک میں ہے (معارف فروری ۱۹۴۸ء)

(۳۳) ظفر الامانی بشرح مقدمۃ الجرجانی، اصولِ حدیث میں بہت محققانہ کتاب ہے، مصنفہ حضرت مولانا عبدالحئی لکھنوی المتوفی ۱۳۰۴ھ

(۳۴) سلطان الاذکار، مصنفہ نواب نورالحسن خاں ولد نواب صدیق خاں بھوپالی، اذکار نبوی کا بہت عمدہ مجموعہ ہے، طبع ہو چکا ہے۔

(۳۵) کشف الاستار عن رجال معانی الآثار، مصنفہ مولانا ابو تراب رشد اللہ شاہ صاحب العلم الرابع (پیر جھنڈا سندھ) معانی الآثار امام طحاوی کے رجال کے بیان میں ہے خود مصنف کا بیان ہے کہ انھوں نے علامہ عینی کی معانی الاخیار سے ان رجال کے حالات نقل کرتے ہیں جو صحاح ستہ کے راوی نہیں ہیں، اس کے بعد معانی الآثار میں جو صحاح ستہ کے راوی

ہیں ان کے حالات تقریب وتہذیب سے لے کر اس کتاب کو ترتیب دیا ہے، یہ کتاب دیوبند سے طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے، مصنف کا بیان ہے کہ ان کو علامہ عینی کی معانی الاخیار کا نسخہ ۱۲۲۳ھ میں مدینہ منورہ میں ملا تھا،

(۳۶) اسماء رجال کتاب الآثار، امام محمد رحمۃ اللہ کی کتاب الآثار کے رجال کا بیان ہے،

(۳۷) تسہیل المنہج فی اسماء رجال کتاب الحجج، یہ کتاب امام محمد کی کتاب الحجج کے رجال کے بیان میں ہے، یہ دونوں کتابیں مولٰنا عبدالباری فرنگی محلی مرحوم کی تصنیف ہیں، خدا ان کو جزائے خیر دے کہ اس ضروری کام کی طرف ان کو توجہ ہوئی اور انھوں نے یہ علمی خدمت انجام دی، مگر افسوس ہے کہ یہ کام جتنی محنت وکاوش اور تلاش وجستجو سے انجام دینے کا تقاضا تھا اتنی محنت اور جستجو سے وہ کام نہ لے سکے، اس لئے بہت سے رجال کی نسبت وہ اس فن کے ماہرین کے اقوال نہ پا سکے اور نہ ان کو وہ رجال کتب رجال میں مل سکے اس وجہ سے ان کی نسبت ان کو لحارمن ضعفہ یا لحاعرفہ لکھنا پڑا۔ نیز رجال کے ناموں میں ناقلوں کی ستم ظریفی سے جو تحریف ہو گئی ہے اس پر بھی ان کو تنبہ نہیں ہوا، مثلاً ابان بن لقیط کی نسبت انھوں نے لکھا کہ لحارمن ضعفہ، حالانکہ یہ نام ہی غلط چھپ گیا ہے، صحیح نام ایاد بن لقیط ہے، اور وہ صحیح مسلم وسنن کا راوی ہے، اور ابن معین وغیرہ نے اس کو ثقہ قرار دیا ہے۔

اور البراء بن قیس کی نسبت لکھ دیا مقبول واللہ اعلم جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ راوی ان کو کتب رجال میں نہیں ملا اور اپنے وجدان سے اس کو مقبول قرار دیا ہے، حالانکہ اس کا ذکر ثقات ابن حبان اور تاریخ بخاری میں موجود ہے،

اور مثلاً علی بن ندیمہ کی نسبت صرف اتنا لکھا کہ لم یجرح ولم یضعف جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جو تحریف ہوئی ہے اس پر ان کو تنبہ نہیں ہوا، اور اسی لئے یہ نام ان کو کتب رجال میں نہیں ملا تو اپنی طرف سے لم یجرح ان کو لکھنا پڑا، حالانکہ صحیح علی بن بذیمہ ہے اور وہ سنن کا راوی اور تہذیب التہذیب میں مذکور ہے۔

اور جیسے حکیم بن عتبہ ان کو کتب رجال میں نہیں ملا، تو صرف یہ لکھ کر آگے بڑھ گئے کہ اخرج لہ الامام محمد بن الحسن فھو مقبول، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس نام میں دو غلطیاں ہو گئی ہیں اس لئے وہ کہیں نہیں ملا، صحیح الحکم بن عتیبہ ہے اور وہ تہذیب التہذیب میں مذکور ہے، اسی طرح اس سے روایت کرنے والا نہ الحسن بن الجبیر ہے نہ الحسن بن الجبر بلکہ الحسن بن الحر ہے جو تہذیب میں مذکور ہے، مولانا فرنگی محلی نے الحسن بن الجبر کو تلاش کیا، نہیں ملا تو محض اپنے وجدان سے "مقبول" لکھ کر ختم کر دیا۔

یوں ہی داؤد بن قیس الفراء مطبوعہ نسخۂ الجج میں کاتبوں نے الفزاری لکھ دیا ہے مولانا کو داؤد بن قیس فزاری کہیں نہیں ملا تو لکھ دیا کہ لم اقف علی تضعیفہ حالانکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا صحیح الفراء ہے اور وہ تہذیب میں مذکور ہے،

اسی طرح زہیر بن الصلت ان کو کہیں نہیں ملا تو لکھا لم ار من نبّہ علی ضعفہ حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ نام غلط چھپا ہے صحیح زمید بن الصلت ہے اور اس کا ذکر طبقات ابن سعد اور تعجیل المنفعہ میں ہے۔

یہ مشتے نمونہ از خروارے ہے، ورنہ اس طرح کی اور بھی بہت سی فروگذاشتیں ہیں۔

اسماء رجال کتاب الآثار بھی اس عیب سے پاک نہیں ہے، اس میں بھی اس طرح کی متعدد مثالیں ملتی ہیں، مثلاً

(۱) افلح بن قیس کی نسبت یہ لکھ کر کہ محفوظ ابو الافلح ہے میزان سے یہ نقل کر دیا کہ لا یدری من ھو حالانکہ میزان میں یہ فقرہ اس راوی کی نسبت ضرور مذکور ہے، مگر حافظ ابن حجر نے ذکر کیا ہے کہ وہ ثقہ اور معروف ہے، جیسا کہ تھذیب ج ۳۶۹/۱۲ اور تھذیب التھذیب ص ۱۳/ج ۱۲ سے ظاہر ہے۔

(۲) ابو عازیہ کے باب میں لکھا کہ میں ان سے واقف نہیں ہوا مگر گمان کرتا ہوں کہ یہ ابو الغادیہ ہیں۔ حالانکہ وہ بے شبہ ابو الغادیہ ہیں اگر ابو الغادیہ نہ ہوتے تو ابو عازیہ نام کے راوی کا ذکر تعجیل المنفعہ

یا تہذیب میں ہونا ضروری تھا جیسا کہ تعجیل المنفعۃ کے مقدمہ سے ظاہر ہے۔ اس مثال کے اور نظائر بھی اس کتاب میں ہیں۔

(۳) عبد الملک بن عمیر عن رجل من آل ابی حثمہ اومن آل بلحرث کی نسبت کچھ نہیں لکھا، حالانکہ تہذیب میں عبد الملک کا حال شرح وبسط سے مذکور ہے۔

(۴) کدام بن عبد الرحمٰن کے ذکر میں اتنا لکھ کر چھوڑ دیا کہ لا یعرف مجھول من الثالثۃ کذا فی التقریب وقد روی عنہ محمد، حالانکہ تہذیب میں ہے کہ ان سے عثمان بن واقد اور امام ابو حنیفہ نے روایت کی ہے اور جب دو شخصوں نے ان سے روایت کی ہے تو اصول حدیث کی رو سے وہ مجہول نہیں رہے، اسی لئے تہذیب میں ابن حجر نے ان کو مجہول کہنے کی نسبت ابن حزم کی طرف کی ہے۔

مولانا کے اوہام میں سے ایک وہم یہ بھی ہے کہ انھوں نے تعجیل المنفعۃ کو شیخ ابن حجر مکی کی تصنیف قرار دیا ہے (دیکھئے مقدمہ التعلیق المختار ص۳)

حالانکہ وہ ابن حجر عسقلانی کی تصنیف ہے جو اول الذکر سے اقدم واعلم ہیں۔

نیز امام طحاوی کو کتاب الآثار امام محمد کا شارح قرار دیا ہے (مقدمہ تعلیق مختار ص۶۵) حالانکہ کسی تذکرہ نویس نے ان کی تصنیفات میں شرح آثار امام محمد کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ان کو اس کا شارح لکھا ہے، معلوم ہوتا ہے کہیں کہیں کتابوں میں یہ جو لکھا ہوا ملتا ہے کہ ذکرہ الطحاوی فی شرح الآثار تو اس سے مولانا نے شرح آثار محمد سمجھ لیا، حالانکہ لکھنے والوں کی مراد شرح الآثار سے شرح معانی الآثار ہے

(۳۰) الدرر الباہرۃ فی الاحادیث المتواترۃ

(۳۹) الباقیات الصالحات فی الاسانید والاوائل والمسلسلات

یہ دونوں رسالے بھی مولانا عبد الباری مرحوم کے ہیں، ان کا موضوع ان کے ناموں سے ظاہر ہے، یہ سب کتابیں طبع ہو چکی ہیں،

(۴۰) المناہل السلسلۃ فی الاحادیث المسلسلۃ، مطبوعہ مصر

(۴۱) الاسعاد بالاسناد، مطبوعہ مصر، یہ دونوں کتابیں شیخ عبدالباقی ایوبی انصاری فرنگی محلی ثم المدنی کی تصنیف ہیں مولانا عبدالباقی کی وفات ابھی سے چند برس پہلے ہوئی ہے۔

(۴۲) زجاجۃ المصابیح، یہ کتاب مشکوٰۃ کے طرز پر لکھی گئی ہے، ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ مشکوٰۃ کے مصنف شافعی ہیں انھوں نے فروع میں وہ حدیثیں ذکر کی ہیں جن سے شوافع کی تاکید ہوتی ہے اور زجاجۃ المصابیح کے مصنف حنفی ہیں، انھوں نے فروع میں وہ حدیثیں نقل کی ہیں جن سے حنفیہ کا مذہب ثابت ہوتا ہے یہ اس کتاب کی پہلی جلد جو کتاب الایمان، کتاب العلم، کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ اور کتاب الصوم پر مشتمل ہے پانچ سو نوے صفحات میں حیدرآباد سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے، کتاب کے مولف مولانا ابوالحسنات سید عبداللہ شاہ حیدرآبادی ہیں جابجا مصنف کے قلم سے حواشی بھی ہیں، جن میں فقہی مباحث اور احادیث کی توجیہات ہیں حواشی میں احادیث کی صحت وضعف اور رجال کی بحث بالکل نہیں ہے، حالانکہ یہ بھی ضروری چیز تھی،

(۴۳) شرح شمائل ترمذی، مصنفہ باباحاجی اس کا قلمی نسخہ ابھی حال میں میری نظر سے گذرا ہے، اور اسی وجہ سے اس کو تینتالیسویں نمبر پر جگہ ملی، ورنہ ترتیب زمانی کے لحاظ سے اس کا ذکر بہت پہلے ہونا چاہئے تھا، اس لئے کہ اس کا سال تصنیف سنہ ۹۷۰ھ یا سنہ ۹۸۶ھ ہے، شمائل ترمذی کی یہ شرح فارسی زبان میں ہے، میرے خیال میں اس کتاب کے مصنف شیخ بابا مسعود کشمیری کے صاحبزادہ شیخ باباحاجی ہیں، جن کی نسبت اسرار الابرار میں مذکور ہے کہ صاحب استعداد کاملہ بود خداوند ارشاد شاملہ واہل کشف وکرامات بود وخرمن ریاضات وانبار عبادات (اسرار الابرار ورق ۱۹۹) سن وفات معلوم نہیں ہوا مگر اسرار الابرار کا سال تصنیف سنہ ۱۰۶۳ھ ہے اور باباحاجی کی وفات اس سے پہلے ہو چکی تھی۔

(۴۴) قلائد الازہار شرح کتاب الآثار، مصنفہ مولانا مہدی حسن شاہجہان پوری مفتی دارالعلوم دیوبند، امام محمد کی کتاب الآثار کی بہت مبسوط اور محققانہ شرح ہے، آثار کی تخریج اور رجال پر بحث کا بھی التزام ہے، میں نے جگہ جگہ سے دیکھا ہے، مفتی صاحب کی محنت قابل داد ہے جزاہ

اللہ خیراً، اب تک چھپنے کی نوبت نہیں آئی، کتاب اس قابل ہے کہ کوئی صاحب ہمت اس کو طبع کرادے۔

(۵م) الحاوی لرجال الطحاوی، اس کتاب کا ذکر اس سلسلہ میں محض تحدث بالنعمۃ کے طور پر ہے، حقیر راقم الحروف نے اس کتاب میں مشکل الآثار اور معانی الآثار دونوں کے رجال جمع کئے ہیں اور بقدرِ امکان پوری تحقیق سے ان کے حالات لکھے ہیں، نیز دونوں کتابوں میں اسماء الرجال میں جو تحریفات و تصحیفات ہوئی ہیں ان کی تصحیح میں بھی بہت کاوش کی ہے اب تک طبع نہیں ہوئی

ان مصنفات کے علاوہ ہندوستانی تالیفات میں ہم کو رسالہ نی لمعات المشکوۃ مصنف شیخ محمد طاہر پٹنی، حاشیہ مشکوۃ مصنف شیخ طیب برہان پوری رسالہ سود مند (جس میں تمام اقسام حدیث کو نہایت سلیقہ سے جمع کیا گیا ہے) مصنفہ شاہ میر شیرازی گجراتی کے نام بھی ملتے ہیں (ملاحظہ ہو حیات شیخ عبد الحق ص۱۲۴)

نیز اسی سلسلہ کی چیز مولانا عبد الباری مرحوم کی التعلیق المختار علی کتاب الآثار ہے جو امام محمد کی کتاب الآثار پر مبسوط حاشیہ ہے اور غالباً اب تک طبع نہیں ہوا ہے اور اس کتاب پر ایک مختصر حاشیہ مولانا محمد اسحٰق ہندی ثم المدنی کا بھی ہے جس کی نسبت مولانا عبد الباری مرحوم کا بیان ہے کہ میں نے اس کو دیکھا ہے، وہ نافع ہے، اور جہاں ضرورت تھی وہیں حاشیہ لکھا ہے، مولانا اسحٰق ہندوستان سے ہجرت کر کے مدینہ میں مقیم ہو گئے تھے اور ان کی وفات وہیں ۱۳۲۲ھ میں ہوئی مسجد نبوی میں کتاب الآثار کا درس دیا کرتے تھے (مقدمہ تعلیق مختار ص۶۷)

---

[1] دراصل سندھی ہیں وہیں تعلیم بھی پائی، مفتی یونس سندھی آپ کے استاد ہیں سندھ سے ایلچ پور (برار) اور وہاں سے برہان پور آئے اور وہیں کے ہو رہے ۹۹۰ھ اور ۱۰۰۰ھ کے درمیان وفات ہوئی (گلزار)

[2] حیات شیخ عبد الحق میں شاہ میر کا جو سال وفات نقل کیا گیا ہے غلط ہے، صاحب گلزار ابرار نے شاہ میر کا سال وفات بتایا ہی نہیں ہے، ہاں ان کے پوتے سید ابو تراب کی نسبت البتہ یہ لکھا ہے کہ ۱۰۰۰ھ تک زندہ رہے اور مرآۃ احمدی میں ہے کہ سید شاہ میر شیرازی سلطان محمود بیگڈھ کے عہد میں ۸۹۶ھ میں جاپانیر آئے اور وہیں ان کا مزار ہے، اور ان کے پوتے یا پڑپوتے سید ابو تراب کا سال وفات ۱۰۰۳ھ ہے۔

اسی سلسلہ کی ایک کتاب معلم القاری شرح ثلاثیات امام بخاری بھی ہے، یہ کتاب مولانا رضی الدین ابوالخیر عبدالمجید خاں داماد نواب وزیر الدولہ کی تصنیف ہے اور چھپ چکی ہے مصنفِ کتاب، حدیث میں شیخ عبداللہ بن عبدالرحمٰن سراج حنفی حرم مکی کے شیخ المدرسین کے شاگرد تھے، ۱۲۶۱ھ میں انھوں نے حج کیا اور اسی سال شیخ مذکور کے پاس صحیح بخاری پڑھی اور اسی سال یہ رسالہ تصنیف کیا۔

"تاریخی حقایق"

از

(مولانا محمد ظفیر الدین دار العلوم معینیہ سانحہ ضلع مونگیر)

اس عنوان سے میں نے جولائی، اگست ۱۹۵۱ء کے برہان میں اندلس اور بغداد کے بعض سلاطین کے حالات لکھے تھے، اس وقت یہ تاریخی حقایق بہت پسند کئے گئے تھے، کتاب "آئینۂ حقیقت نما" مولفہ مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی میں بھی بعض واقعات پڑھتے وقت بہت پسند آئے، دل نے کہا یہ واقعات قوم و ملک کے سامنے بھی پیش کر دیئے جائیں تاکہ مشعلِ راہ کا کام دیں، وما توفیقی الا باللہ۔

(ظفیر صدیقی)

محمد بن قاسم فاتح سندھ کسی تعارف کے محتاج نہیں، سب سے پہلے باضابطہ یہی بزرگ راجہ داہر کے زمانہ میں ہندوستان تشریف لائے، جن کا مقصد مظلوم مسلمانوں کی اعانت اور گلو خلاصی تھا، سیوستان میں راجہ داہر کا بھتیجا بجے رائے حکمراں تھا، محمد بن قاسم جب اس طرف بڑھے اور بجے رائے نے مقابلہ کا ارادہ کیا، تو باشندگان شہر اور شہر کے علمائے بدھ نے جلسہ کر کے طے کیا کہ جنگ مناسب نہیں ہے اور بجے رائے کی خدمت میں اہل شہر کی طرف سے یہ درخواست پیش کی:

"مسلمانوں کا مقابلہ نہ کیجئے، اور صلح اور آشتی سے کام لیجئے، مسلمان درخواست صلح کو رد نہیں کرتے، اور کسی کے مذہب میں دخل نہیں دیتے، لہٰذا کشت و خون کا ہنگامہ برپا کرنا فضول ہے[1]"

یورپی مورخین نے مسلمانوں کو کس قدر بدنام کیا ہے، اور مسلمانوں کو ظالم ثابت کرنے کی کیسی ناپاک کوشش کی ہے مگر غور کیجئے کہ پہلی صدی ہجری ہے اور مسلمانوں کے متعلق عرب سے اتنی دور ہندوستان والے کتنا صحیح خیال رکھتے تھے، اگر واقعی اسلام ظلم ہی لے کر آتا، تو کیا ان

---

[1] آئینۂ حقیقت نما ص ۸۱ ج ۱

سندھیوں کو معلوم نہ ہوتا،

اسی موقع کا ایک واقعہ ہے کہ بجے رائے نے اپنا ایک خاص جاسوس مسلمانوں کے لشکر میں بھیجا، اتفاق سے اس نے مسلمانوں کو نماز باجماعت پڑھتے ہوئے دیکھا، اور جاکر کہا، یہ لوگ اس قدر متحد اور متفق ہیں کہ ان کا مغلوب کرنا سخت دشوار ہے۔ بجے رائے مرعوب ہوکر رات ہی کو سیوستان سے فرار ہوگیا[1]

اللہ اللہ یہ تھا مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کا اثر اب تو خود مسلمان ہی منہ آنے لگے ہیں کہ آخر نماز سے کیا فائدہ؟ دیکھ رہے ہیں اسلاف کی نماز ان کو کتنا فائدہ پہونچاتی تھی کیا اس کے باوجود نماز باجماعت کے فائدے کا انکار کیا جائے گا؟

جس دن راجہ داہر مسلمانوں کے ہاتھ مارا گیا اور مسلمانوں نے کامیابی حاصل کی، اس دن بہت سے لوگوں نے درخواست پیش کی کہ ہم بخوشی مسلمان ہونا چاہتے ہیں چنانچہ ان کی خواہش کے مطابق ان کو اسلام میں داخل کرلیا گیا، مگر دوسرے ہی دن محمد بن قاسم نے اعلان کرادیا

"جو شخص چاہے اسلام قبول کرے، اور جو چاہے اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے، ہماری طرف سے کوئی تعرض نہ ہوگا"[2]

یہ تھی مسلمانوں کی رواداری اور ان کا قرآنی آیت لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ (دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں) پر عمل، وہ لوگ آنکھیں کھول کر دیکھیں جو تعصب سے چیختے رہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، اور ان پاکستانی پرجوش مسلمانوں کو بھی غور سے پڑھنا چاہیے، جن کو غریب اقلیت کے زبردستی تبدیل مذہب کا مالیخولیا ہوتا ہو،

برہمن آباد جب فتح ہوا، تو یہاں کے بعض باشندے ڈر سے بھاگنے لگے، اس موقع پر محمد بن قاسم نے اعلان کرادیا اور اس کا یہ سلوک رہا کہ

"جو شخص اپنی جان بچانے کے لئے بھاگتا ہے اسے بھاگ جانے دو،.... باشندگانِ شہر

---

[1] آئینۂ حقیقت نما صلا‏ ج ۱ [2] ایضاً صہ

سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا سوداگر، دُکان دار، اور اہل حرفہ بدستور اپنے مشاغل میں مصروف رہے، امن و امان کا اعلان کردیا گیا...... جنگی قیدی جب محمد بن قاسم کے سامنے پیش ہوئے، تو اس نے ان کو رہا کردیا، ..... جو اپنے باپ دادا کے مذہب پر چلے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا نہ ان کے مندروں اور عبادت خانوں میں کسی قسم کی مداخلت کی جائے گی، نہ زمینیں چھینی جائیں گی، نہ جان و اموال کو کسی قسم کا نقصان پہونچایا جائے گا"[1]

اس سے بڑھ کر رواداری اور حسن سلوک کوئی اور ممکن ہے؟ کسی بات میں فتح کا غرور نظر آتا ہے؟ ظلم وجور کہیں سے معلوم ہوتا ہے؟ پھر ان فاتحوں کو برکت کیوں نصیب نہ ہوگی، ضرور نصیب ہوگی اور ہوئی بھی۔

الور فتح ہوچکا تو محمد بن قاسم نے تعجب سے دیکھا کہ بہت سے لوگ اس کے بڑے بت خانہ "نودھار" میں بت کے آگے سجدے میں پڑے ہیں، یہ اس کو پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ مندر ہے، اس کے اندر محمد بن قاسم داخل ہوا اور واپس آیا۔ ایک چیز بھی نہیں بگاڑی بلکہ نکلنے کے بعد عام اعلان کردیا

"اس شہر کے باشندے ہر قسم کے ٹیکس اور محصول سے معاف کئے جاتے ہیں"[2]

ملتان کو محمد بن قاسم نے فتح کیا، اور کس طرح کیا مورخ کا بیان ہے

"مسلمانوں نے بزور شمشیر ملتان پر قبضہ کیا، اور اہل شہر کو کسی قسم کا نقصان پہونچائے بغیر امن امان اور معافی کا اعلان کیا، محمد بن قاسم نے ہر جگہ شہروں کے لوٹنے اور رعایا کے اموال پر قبضہ کرنے سے اپنے سپاہیوں کو روکا، ... مندروں کی مورتیوں کو جو جواہرات سے مُرصّع اور سونے چاندی کی بنی ہوئی تھیں کسی نے ہاتھ نہیں لگایا"[3]

ان واقعات کو غور و فکر کی نگاہوں سے ملاحظہ کیا جائے، اور فیصلہ کیا جائے اسلامی حکومت کے اصول کتنے عمدہ ہیں

---

[1] آئینہ حقیقت نما صـ۹۶ [2] صـ۱۹ [3] ایضاً صـ۱۹

محمد بن قاسم کو سندھ کے لئے سپہ سالار بنا کر حجاج بن یوسف نے بھیجا تھا، تاریخ اسلامی میں حجاج اپنے ظلم و جور میں بری طرح بدنام ہے مگر فتح سندھ کے سلسلہ میں حجاج نے محمد بن قاسم کو جو ہدایتیں دی ہیں وہ پڑھنے کے لائق ہیں، فتح دیبل کی خوش خبری سن کر حجاج نے لکھا تھا۔

"جب ملک پر تم قابض ہو جاؤ، تو قلعوں کی استواری، اور لشکر کی رفع احتیاج کے بعد۔۔۔۔

تمام اموال و خزائن کو بہبودِ رعایا، اور رفاہِ خلق میں خرچ کرو اور یاد رکھو کہ کاشتکاروں، کاریگروں، سوداگروں، اور پیشہ وروں کی خوش حالی و فارغ البالی سے ملک آباد و سرسبز ہوتا ہے رعایا کے ساتھ ہمیشہ رعایت کرو، تاکہ وہ تمھاری طرف محبت کے ساتھ راغب ہوں"[1]

کہیں لوٹ کھسوٹ کی تعلیم ہے؟ ملک اور رعایا کے ساتھ رفق و ملاطفت کی کیسی دل نشیں تاکید ہے، محمد بن قاسم جب نیرون میں مقیم تھا تو حجاج کا گرامی نامہ موصول ہوا

"اہل نیرون کے ساتھ نہایت نرمی اور دل دہی کا سلوک کرو، ان کی بہبودی کے لئے کوشش کرو، لڑنے والوں میں جو تم سے امان طلب کرے، اس کو ضرور امان دو، کسی مقام کے اکابر و سردار تمھاری ملاقات کو آئیں، ان کو قیمتی خلعت اور انعام و اکرام سے سرفراز کرو۔ عقل و دانائی کو اپنا راہبر بناؤ، جو وعدہ کسی سے کرو۔ ضرور پورا کرو، تمہارے قول و فعل پر سندھ والوں کو پورا پورا اعتماد و اطمینان ہو"[2]

کیا ان ہدایات میں وہ ساری باتیں درج نہیں ہیں؟ جو ایک ذمہ دار کا فریضہ ہوتا ہے ایک طرح غور کیا جائے کہ جو ہدایتیں ہیں وہ ملک و قوم کی فلاح و بہبودی سے متعلق ہیں، یا ان میں ملک اور قوم کا جانی، مالی اور سیاسی نقصان ہے، اخلاق و اعمال کی پاکیزگی کی طرف اشارہ ہے، یا ظلم و جبر اور بربریت کی طرف؟

سیوستان کی فتح کی خوش خبری معلوم کر کے محمد بن قاسم کے نام اوپر سے ہدایت پہونچی کہ

"جو کوئی تم سے جاگیر و ریاست طلب کرے، تم اس کو نا امید نہ کرو، التجاؤں کو قبول کرو،

---

[1] آئینۂ حقیقت نما ج ۱ ص ۹۵ [2] ایضاً

امان وعفو سے رعایا کو مطمئن کرو۔ ــــــــــ سلطنت کے چار ارکان ہیں، اوّل مدارا ودرگزر اور محبت، دوّم سخاوت وانعام، سوّم دشمنوں کی مزاج شناسی، اور ان کی مخالفت میں عقل کو ہاتھ سے نہ دینا، چہارم قوت وشہامت، تم لوگوں سے جو عہد کرو، اس پر قائم رہو، جب وہ مال گذاری دینے کا اقرار کرلیں، تو ہر طرح ان کی امداد واعانت کرو، جب کسی کو سفیر بنا کر بھیجو تو اس کی عقل وامانت کو جانچ لو"[1]

کہیں وفاداری کے مطالبہ کی خواہ مخواہ شرط ہے، کہ رعایا سے اپنی مدح اور ستایش کے گیت گانے کا مطالبہ کرو، ان کو اتنا تنگ کرو، کہ گھر چھوڑ کر دربدر کی خاک چھانے، ارکان اربعہ اس قابل ہیں کہ حکمراں ان پر عمل کرنا سیکھیں

محمد بن قاسم دریا پار ہو کر جب داہر کی فوج سے نبرد آزما ہوا، تو حجاج بن یوسف کا ہدایت نامہ ملا،

"پنج وقتہ نماز پڑھنے میں سستی نہ ہو، تکبیر وقرأت، قیام وقعود، اور رکوع وسجود میں خدائے تعالیٰ کے روبرو تضرع وزاری کرو، زبان پر ہر وقت ذکر الٰہی جاری رکھو، کسی شخص کو شوکت وقوت خدا تعالیٰ کی مہربانی کے بغیر نہیں ہوسکتی، اگر تم خدا تعالیٰ کے فضل وکرم پر بھروسہ رکھوگے، تو یقیناً مظفر ومنصور ہوگے"[2]

ممالکِ اسلامیہ کے بادشاہ، گورنر جنرل، اور وزیرِ اعظم عبرت وبصیرت کی آنکھوں سے اس خط کو پڑھیں اور دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیں اب ان میں یہ عقیدہ اور ایمان کی یہ پختگی باقی رہی؟ ظالم حجاج کے دل میں دین کی جو وقعت تھی کیا اس کا عشرِ عشیر بھی ممالکِ اسلامیہ کے حکمرانوں میں باقی ہے؟ کاش مسلمان اس راز کو سمجھ لیتے اور ان میں اس کا صحیح یقین پیدا ہو جاتا۔ پھر دنیا ان کی تھی، اور عزت اور شوکت وعظمت ان کے قدموں سے لپٹی نظر آتی۔

راجہ داہر جب جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا اور اس کی اطلاع حجاج کو پہونچی،

---

[1] آئینۂ حقیقت نما ج۱ ص۹۶ [2] ایضاً

تو اس نے محمد بن قاسم کے نام یہ خط روانہ کیا،

"تمہارا انتظام و اہتمام اور ہر ایک کام شرع کے مطابق ہو، .... جو لوگ بزرگ اور ذی وقعت ہوں، ان کو ضرور امان دو، لیکن شریر اور بدمعاشوں کو دیکھ بھال کر آزاد کیا کرو، اپنے عہد و پیمان کا ہمیشہ لحاظ رکھو اور امن پسند رعایا کی استمالت کرو"[1]

ایک دوسرے خط میں محمد بن قاسم کی خدمت کو سراہتے ہوئے لکھا،

"اے ابن عم محمد بن قاسم! تم نے رعیت نوازی اور رفاہِ عام میں جو کوشش کی ہے، وہ نہایت تعریف کے قابل ہے"[2]

رعیت نوازی پر اب ایسی حوصلہ افزائی ہوتی ہے؟ اب تو بڑا دیش بھگت وہ ہے، جو تعصب سے کام لے اور جو کام کرے، وہ فرقہ وارانہ عینک سے پہلے دیکھ لے،

برہمن آباد کی فتح کے بعد پوجاریوں کا ایک معزز وفد محمد بن قاسم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور یہ شکوہ پیش کیا، کہ مسلمان سپاہیوں کے خوف سے ہندو مندروں میں پوجا کے لئے بہت کم آنے لگے ہیں، ہماری آمدنی کم پڑگئی ہے ایام محاصرہ میں بعض مندروں کو نقصان پہونچا ہے اس کی مرمت اب تک نہ ہو سکی ہے، لہٰذا آپ ان مندروں کی اپنے اہتمام میں مرمت کرائیں اور ہندوؤں کو مجبور کریں کہ وہ بے خوف و خطر مندروں میں آکر پوجا کریں، محمد بن قاسم نے جواب دیا کہ تمہارے مندر کا تعلق شہر الور سے ہے اور وہ میرے قبضہ میں نہیں، میں کیسے دخل دوں، پوجاریوں نے کہا، اب ان مندروں کا معاملہ ہم لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ لہٰذا اب سب کچھ آپ ہی کو کرنا چاہیئے، محمد بن قاسم نے فوراً یہ تفصیل لکھ کر حجاج کو خبر دی، حجاج نے محمد بن قاسم کو لکھا کہ

"تمہارے خط سے معلوم ہوا، کہ برہمن آباد کے ہندو اپنے مندروں کی عمارت درست کرنا چاہتے ہیں، چونکہ انھوں نے اطاعت قبول کر لی ہے، لہٰذا ان کو اپنے معبودوں

---

[1] آئینۂ حقیقت نما ص ۹۶ ج ۱ [2] ایضاً

کی عبادت میں آزادی حاصل ہونی چاہیے، اور کسی قسم کا جبر کسی پر مناسب نہیں ہے" [1]

جس وقت یہ خط پہونچا، محمد بن قاسم برہمن آباد سے کام کے لئے نکل چکا تھا اور ایک منزل کی دوری پر تھا مگر جونہی یہ گرامی نامہ ملا۔ فوراً برہمن آباد واپس آیا، اور کام یہ کیا کہ

"وہاں کے تمام اکابر وامرار کو بلایا، اور برہمنوں یعنی پجاریوں کے حقوق ومراسم کی تحقیق کی، اور داہر کے زمانہ میں سلطنت کی طرف سے کیا کیا رعایتیں برہمنوں کو حاصل تھیں، سب کو معلوم کیا، اس کے بعد اس نے شہر میں اعلان کرادیا، کہ جو لوگ اپنے باپ دادا کے مراسم کے پابند ہیں۔ ان کو ہر قسم کی آزادی ان مراسم کے بجالانے میں حاصل ہے، کوئی شخص معترض نہ ہوسکے گا، برہمنوں کو دان پن، دکشنا، بھینٹ، جس طرح پہلے دیتے تھے، اب بھی دیں، اپنے مندروں میں آزادانہ پوجا پاٹ کریں، محاصلِ ملکی یعنی سرکاری مالگذاری میں سے تین روپیہ فی صدی۔ برہمنوں کے لئے الگ خزانہ میں جمع کیا جائے گا، اس روپیہ کو برہمن جس وقت چاہیں اپنے مندروں کی مرمت اور ضروری سامان کے لئے خزانہ سے برآمد کرا سکتے ہیں" [2]

کیا اس کے بعد بھی یہی کہا جائے گا کہ مسلمانوں میں رواداری نہیں ہے؟ یہ لٹیرے ہیں، ان لوگوں نے دوسرے مذاہب والوں کے ساتھ حسنِ سلوک نہیں کیا، ملک کی تین فی صدی آمدنی مندر کو کوئی بہت حکومت بھی دے سکتی ہے؟ حکومت پاکستان کے حکمرانوں کو بھی اس واقعہ کو پڑھنا چاہئے، اور بھارت کے ان لوگوں کو بھی جو خواہ مخواہ کے تعصب میں مبتلا ہیں،

پھر آپ کو حیرت ہوگی محمد بن قاسم کے ان تمام کارناموں کو حجاج نے سراہا اور لکھا،

"میں تمہارے ملکی انتظام سے بہت خوش ہوا ہوں، تم ایسے کام کرو، کہ تمہارا نام روشن ہو،.... تم بطور خود رعیت نوازی اور عدل گستری کے طریقوں پر آزادانہ عمل درآمد کرو" [3]

ایک خط میں حجاج نے لکھ بھیجا۔

"جو مطیع ہوں ان کو امان دو، صناع وتاجر پر کوئی محصول یا ٹیکس عائد نہ کرو، جو شخص زراعت میں زیادہ

---

[1] آئینہ حقیقت نما صفحہ ۹۶ [2] ایضاً [3] ایضاً صفحہ ۹۶

توجہ اور جانفشانی سے کام لیتا ہے، اس کی مدد کرو، اور اس کو تقاوی دو، جو لوگ اسلام سے مشرف ہوں، ان سے زمین کی پیداوار کا عشر یعنی دسواں حصہ وصول کرو، اور جو لوگ اپنے مذہب پر قائم رہیں، ان سے وہی مالگذاری وصول کرو جو وہ اپنے راجاؤں کو دیا کرتے تھے"[1]

کسی جملہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مسلمان حکمرانوں کو اپنی رعایا سے محبت نہ تھی، یا وہ اپنی مطیع رعیت پر ظلم اور ستم ڈھانے کا ارادہ رکھتے تھے، عدل و مساوات میں کہیں خامی اور کمی ہے؟ کہنے والے کچھ کہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلم حکمرانوں نے کبھی بھی تعصب سے کام نہ لیا، جو حکمراں برا ہوا، وہ ہر ایک کے لئے ہوا، ہندو کے لئے بھی اور مسلمان کے لئے بھی،

تاریخ کا ایک عجیب و غریب واقعہ سبھوں کے سننے کے لایق ہے، الور فتح ہو چکا، تو کچھ لوگ محمد بن قاسم کے سامنے پیش ہوئے، جو اپنے اعمال و اخلاق کی وجہ سے حکومت کے قانون میں واجب القتل تھے، محمد بن قاسم نے ان کو جلادوں کے سپرد کر دیا، ان میں ایک نے عجیب تدبیر سوچی، اس نے کہا میرے پاس ایک چیز ایسی ہے جسے کسی نے کبھی بھی نہیں دیکھا ہے، جلادوں نے کہا دکھاؤ، اس مجرم نے کہا تم کو نہیں، تمھارے سردار محمد بن قاسم کو البتہ دکھا سکتا ہوں، محمد بن قاسم کو اس کی اطلاع ہوئی، بلا بھیجا، فرمایش کی کونسی چیز ہے۔ دکھاؤ

"اس نے کہا اس وقت دکھاؤں گا، جبکہ مجھ کو اور میرے سارے کنبہ کو امان دی جائے محمد بن قاسم نے کہا میں نے امان دی، اس نے کہا اپنا تحریری اور دستخطی امان نامہ دو، تو دکھاؤں محمد بن قاسم نے سمجھا کوئی بڑی ہی بیش قیمت چیز ہوگی، لہٰذا امان نامہ پر دستخط کر کے اس کے حوالہ کیا، امان نامہ لے کر اس نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا، سر کے بال کو بکھیر دیا، ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا، اور پاؤں کی انگلیوں کو اپنے سر سے لگایا، پھر ناچنے لگا اور کہنے لگا، کہ کسی شخص نے میرا یہ عجیب و غریب تماشا نہیں دیکھا ہوگا، محمد بن قاسم اپنی غلطی پر حیران تھا، لوگوں نے جو موجود تھے کہا، یہ کیا عجیب تماشا ہے جس کے لئے امان دی جائے، اس نے ہم کو دھوکہ دیا ہے، اسے قتل

[1] آئینہ حقیقت نما صد ۹۸

کرنا چاہیئے، محمد بن قاسم نے کہا کہ "قول مرداں جان دارد" میں چونکہ اس کو امان دے چکا ہوں، اس لئے اپنے عہد سے نہیں پھر سکتا، ہاں یہ مناسب ہے کہ اس کو قید رکھا جائے، اور اس معاملہ میں حجاج سے فتویٰ طلب کیا جائے، جب حجاج کے پاس یہ تمام کیفیت لکھی پہونچی، تو اس نے خلیفہ ولید بن عبدالملک اور کوفہ وبصرہ کے علمار کو لکھا، اور اس معاملہ میں فتویٰ طلب کیا، خلیفہ نے بھی اور علمائے کوفہ وبصرہ نے بھی حجاج کو لکھا، کہ اس مجرم کے ساتھ جو وعدہ کیا گیا ہے، وہ ضرور پورا ہونا چاہیے، چنانچہ حجاج کے پاس سے جواب آنے پر وہ شخص اور اس کے کنبہ کے بائیس آدمی جو واجب القتل تھے رہا کر دیئے گئے"[۱]

موجودہ لیڈروں کی نظروں سے یہ تاریخی واقعہ گذرے گا، تو قہقہہ مار کر ہنسیں گے اور کہیں گے، "ذراسی بات تھی جسے افسانہ کر دیا" دھوکہ دینے والوں کے ساتھ رحم کا سوال کیسا؟ اور پھر اس نے ایک چال چلی، حکومت بیسیوں چال چل سکتی تھی، بلکہ بہت سے روشن خیال پکار اٹھیں گے "تب تو انگریزی داں کہتے ہیں کہ علمار سیاست نہیں جانتے" اور بالکل درست ہے مذہبی قسم کے لوگ موجودہ دور میں سیاست کے مرد میدان نہیں بن سکتے، یہ تو ہر بات میں مسئلہ تلاش کرنے لگتے ہیں،

مگر سوچنا چاہئے کہ مسلمانوں میں ایفائے وعدہ کتنا ضروری سمجھا جاتا تھا، دھوکہ کا جواب دھوکہ نہیں، سچائی اور اخلاق ہے، آگ آگ سے نہیں، پانی سے بجھتی ہے،

"محمد بن قاسم اور اس کے عہد کے مسلمان گورنروں نے ملک سندھ میں ہندوؤں کے مندروں کے لئے بڑی بڑی جاگیریں وقف کیں"[۲]

مگر پھر بھی مہاسبھائیوں ہندوؤں کی نظر میں مسلمان حکمراں "ہندو کش اور ظالم" ہی رہے، سندھ میں محمد بن قاسم نے ان پیشہ وروں کی حکومت کی طرف سے مدد کی، جن کا کاروبار کسی وجہ سے بند ہو گیا تھا، برہمنوں کو جب معلوم ہوا کہ حکومت کی طرف سے پبلک پر رحم وکرم

[۱] آئینہ حقیقت نما صفحہ ۹۸ وصفحہ ۹۹ [۲] ایضاً

کی بارش ہورہی ہے، برہمنوں نے آکر درخواست کی کہ

"راجہ داہر ہمارا ہم قوم تھا، اور ہم ہی سلطنت کے تمام معزز عہدوں پر مامور تھے سب ہماری حکومت کو مانتے اور ہم کو سب سے زیادہ معزز جانتے تھے، ہمارے لئے آپ نے کیا انتظام کیا ہے، محمد بن قاسم نے یہ تحقیق کرنے کے بعد کہ برہمن واقعی ایک معزز اور امورِ سلطنت سے واقف قوم ہے، حکم دیا کہ برہمنوں کو "سلطنت اسلامیہ" کے "معزز عہدوں" پر مامور کیا جائے، چنانچہ محکمۂ مال کا تمام انتظام برہمنوں کے سپرد کردیا گیا، ... زر مالگذاری کا وصول کرنا، اس کا حساب رکھنا، خزانہ کی حفاظت کرنا، سب برہمنوں کے سپرد کردیا گیا، چنانچہ محمد بن قاسم کے زمانہ سے لے کر آئندہ ہر زمانہ میں ملک سندھ کا مالی محکمہ برہمنوں ہی کے ہاتھ میں رہا... برہمن محمد بن قاسم سے جس شخص کی سفارش کرتے، وہ اس کے مرتبہ کو بلند کردیتا تھا، محمد بن قاسم نے برہمنوں کو تاکید کردی تھی، کہ کاشتکاروں سے محصول یا بٹائی، وصول کرنے میں ہرگز کوئی سختی نہ کی جائے، اور جہانتک ممکن ہو کاشتکاروں کو سہولتیں دی جائیں، جس کاشتکار کے یہاں پیداوار کم ہو، اس کو سرکاری لگان معاف کردیا جائے"[۱]

اسے رواداری کہیں گے یا ظلم اور ستم؟ اہلِ ملک کو دوست سمجھا یا دشمن؟ ہندوؤں کی مسلمان حکمرانوں نے عزت کی، یا ذلیل کیا؟ پھر غور کیجئے کاشتکاروں اور ملک کے دوسرے پیشہ وروں کے ساتھ کتنا حسنِ سلوک برتا جارہا ہے، آزاد بھارت کی طرح ٹیکس پر ٹیکس تو عائد نہیں کئے، ریل کا کرایہ، لفافہ۔ کارڈ اور رجسٹری فیس میں تو اضافہ کی ان کو نہ سوجھی، زمینداری بھارت میں اٹھتی جارہی ہے اور کسان سہمے جارہے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو، کہ ریل کے کرایہ کی طرح دونی مالگذاری بھی کردی جائے اور پھر دو سال کے بعد ڈھائی گنی ہو جائے، اور دیر سویر غالباً یہ ہوکر رہے گا، یہاں تو وزیروں اور اراکین پارلیمنٹ اور اسمبلی و کونسل اور دوسرے عہدیداروں

---

[۱] آئینہ حقیقت نما صفحہ ۱۰۷ و صفحہ ۱۰۸

کی جیبیں بھرنی چاہیے، پبلک بھکاری ہوگئی تو کیا، بلکہ کچھ فائدہ ہی ہوگا کہ لالچ دلاکر ووٹ حاصل کرنے میں آسانی ہوگی،

محمد بن قاسم نے قوم اور ملک کے ساتھ جو کچھ کیا اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ

"وہ ملک سندھ سے رخصت ہوا ہے، تو عام طور پر تمام ملک میں رنج و ملال کا اظہار کیا گیا، شہر کیرج کے ہندوؤں اور بودھوں نے اپنے شہر میں محمد بن قاسم کا ایک بت بناکر رکھا، اور اس کی پرستش شروع کردی"[1]

بت تو اب بھی قائم کئے جاتے ہیں، جس میں ہاتھ خود بت والے ہی کا ہوتا ہے، مگر اسے دیکھ کر لوگ گالیاں دیتے ہیں اور بددعائیں کرتے ہیں۔ مسرت نہیں ہوتی، نفرت سے دل بھر جاتا ہے،

راجہ جے پال نے سبکتگین کو بار بار تنگ کیا اور بہت چاہا کہ غزنی حکومت کو تباہ و برباد کردے، پہلی مرتبہ غزنی حکومت پر حملہ آور ہوا، اور گرفتار ہوا، اس نے سبکتگین کے پاس درخواست بھیجی

"مجھ سے بڑی خطا ہوئی ہے آپ اس مرتبہ میرا قصور معاف کردیں، میں آئندہ ہمیشہ آپ کا فرماں بردار رہوں گا، اور پنجاب پہونچ کر بہت سا چاندی سونا بطور جرمانہ آپ کے پاس بھیجوں گا، آپ اپنے آدمی میرے ہمراہ بھیج دیجئے، میں ان کے ہمراہ خزانہ اور قیمتی تحفے مع پچاس ہاتھیوں کے بھیج دوں گا"[2]

سبکتگین کے سرداروں نے کہا کہ قابو میں آئے ہوئے دشمن کو چھوڑنا دانائی اور عقل کے خلاف ہے، مگر سبکتگین نے اسلامی تعلیم پر عمل کیا اور اس کی درخواست صلح کو منظور کرلیا اور اسے معاف کردیا، مگر یہ سن کر حیرت ہوگی کہ راجہ جے پال نے وعدہ خلافی کی، سبکتگین کے آدمیوں کو گرفتار کرلیا اور پورے ملک کے راجاؤں کو دعوت دی کہ میری مدد کرو اور سب مل کر غزنی حکومت کو تہس نہس کردو، سبکتگین کو پہلے یقین نہ آیا، مگر جب اس کے آدمی واپس نہیں آئے تو جاسوس بھیجا اور اس وقت پتہ لگا کہ عنقریب ہی جے پال جو کل معافی کی درخواست کے ذریعہ جان بچا کر گیا ہے حملہ آور ہونے والا ہے

---

[1] آئینۂ حقیقت نما ص ۱۰۰ ج ۱ و ص ۱۰۱ ج ۱ [2] ایضاً ص ۱۴۰ ج ۱

اور یہی ہوا

"اس مرتبہ لمغان کے میدان میں جے پال کے ساتھ تین لاکھ جرار فوج اور بہت سے جنگی ہاتھی تھے"

اور سبکتگین کے پاس ساٹھ ہزار سے زیادہ فوج نہ تھی، پہلے گھبرایا، مگر پھر سبکتگین نے ہمت و جرأت کی، اور مقابلہ کیا، قدرت نے مدد کی، نتیجہ یہ ہوا کہ جے پال شکست کھا کر بھاگا، گویا پورا ہندوستان حسرت کدہ بن گیا،

امیر سبکتگین کی وفات کے بعد اس کا بیٹا محمود غزنوی مسند حکومت پر بیٹھا تو جے پال نے اس امید میں کہ تجربہ کار بادشاہ مرچکا ہے ناتجربہ کار محمود کو ایک ہی حملہ میں شکست دے دیں گے، بڑی قوت سے غزنی پر تیسرا حملہ کیا، اور اس مرتبہ بھی جے پال کی ڈیڑھ لاکھ فوج نے محمود کی دس ہزار فوج کے ہاتھوں شکست کھائی، جے پال گرفتار ہوا، غزنی میں جے پال سے پوچھا گیا، تو نے بار بار کیوں پریشان کیا، جے پال نے کہا

"اس مرتبہ میری خطا اور معاف کی جائے، اور مجھ کو چھوڑ دیا جائے، میں اب تا زیست انحراف نہ کروں گا، اور پنجاب کو غزنی کا ایک صوبہ سمجھ کر حکومت کروں گا، اور سالانہ خراج بلاعذر و حیلہ بھیجتا رہوں گا، محمود نے انتہائی شرافت کو کام میں لاکر راجہ کی استدعا قبول کرلی اور غزنی سے لاہور کی جانب روانہ کردیا" [۱]

اُلٹے تاریخوں میں اسی کو محمود غزنوی کا حملہ قرار دیا جاتا ہے ع بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است، مسلمان حکمرانوں کا رحم و کرم ملاحظہ فرمائیں، جنگ و فساد سے کتنا اجتناب کیا جارہا ہے، مگر دشمن ہے جو شکست کھانے کے بعد بھی حملہ آور ہو رہا ہے، ایسے موقعہ پر کیا کرنا چاہئے؟

اس کے بعد بھی جے پال اور اور جے پال کے بیٹے انند پال نے حکومت غزنی کو تباہ و برباد کرنے کی سعی کی، مگر ہر بار گرفتار ہوا، اور معافی کی درخواست کر کے جان بخشی چاہی، اور ہر مرتبہ جان بخشی کی گئی، ـــــ اخیر میں بدنام محمود غزنوی کے بارے میں الفنسٹن صاحب کا یہ قول

---

[۱] آئینۂ حقیقت نما صہ ۱۴۶ / ۱۷

بلاحظہ فرمائیے

"یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس نے (سلطان محمود نے) ایک ہندو کو بھی مسلمان بنایا ہو ہوائے لڑائی کے کسی ہندو کو اس نے قتل نہیں کیا"[1]

سلطان بلبن کے متعلق لکھا ہے کہ

"عدل و انصاف قائم رکھنے کا اس کو سب سے زیادہ خیال تھا، اس معاملہ میں وہ اپنے بھائیوں، بیٹوں اور بھتیجوں کی بھی مطلق پرواہ نہیں کرتا تھا"[2]

تاریخ کے اس سلطان سے حکمراں طبقہ کو سبق حاصل کرنا چاہیئے، ایک حکمراں کا یہی فریضہ ہے کہ وہ انصاف کی عدالت میں کسی کی بھی تمیز نہ کرے، دوست دشمن، اپنے اور غیر سب اس کی منظر میں برابر ہوں، سلطان کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ

"ایک مرتبہ ایک نہایت عالی جاہ امیر نے جو بدایوں کا صوبہ دار اور چار ہزار اپنے ذاتی سوار رکھتا تھا، ایک پیش خدمت کو کسی بات پر ناراض ہو کر تازیانہ سے پٹوایا، تازیانہ کی ضربات سے وہ جاں بر نہ ہو سکا، اس خدمت گار کے اس طرح مرنے کا حال سلطان بلبن کو معلوم ہوا، تو اس نے امیر مذکور کو اسی طرح کوڑوں سے پٹوایا، یہاں تک کہ اس کا دم نکل گیا، پھر اس کی لاش کو شہر کے دروازے پر لٹکا دیا؛ تاکہ دوسروں کو عبرت ہو اور وہ اپنے ضعیف ماتحتوں پر ظلم روا رکھنے اور بیدردانہ سزائیں دینے کی جرأت نہ کر سکیں"[3]

اسے کہتے ہیں عدل و مساوات، اور عوام اور غریب و بے کس کا درد، اس دور میں جو تہذیب و تمدن اور جمہوریت کا دور کہا جاتا ہے، اگر کسی گورنر سے ظلم کا ارتکاب ہو جائے، تو اوپر سے نیچے تک سارے لوگ جا ہیں گے، اس پر پردہ پڑ جائے، اور گورنر صاحب کا قصور ثابت نہ ہو، بلکہ غریب ملازم اور نوکر ہی کو مجرم ثابت کیا جائے، چنانچہ آئے دن مظالم ہوتے رہتے ہیں اور حکام بالا کے سروں پر جوں تک نہیں رینگتی،

---

[1] آئینۂ حقیقت نما ص ۱۲۵ [2] ایضاً ص ۲۵۶ [3] ایضاً

اسی سلطان بلبن کا ایک اور واقعہ سننے کے لائق ہے

"ملک ہیبت خاں حاکم اودھ نے ایک شخص کو ناجائز طور پر قتل کیا، مقتول کی بیوی نے بادشاہ سے فریاد کی، بادشاہ نے ہیبت خاں کو پانسو کوڑے لگوائے، اور مقتول کی بیوہ سے کہا، کہ یہ آج تک ہمارا غلام تھا، اب تیرا غلام ہے، چاہے اس کو جان سے مار ڈال، اور چاہے زندہ رہنے دے، ہیبت خاں نے بہت سے لوگوں کو منت سماجت کر کے اپنا سفارشی بنایا، اور بیس ہزار روپیہ دے کر، اس عورت سے دستاویز لکھا کر اس کی غلامی سے آزادی حاصل کی،،[1]

اگر موجودہ دور میں اسی طرح کا انصاف ہونے لگے، اور جس طرح چھوٹوں کو جرم پر سزا دی جاتی ہے، بڑے لوگوں کو بھی سزائیں دی جائیں، تو پوری دنیا میں سکون و اطمینان ہو جائے اور کمیونزم کا زور آن کی آن میں گھٹ جائے، مگر حیرت یہ ہے کہ بڑے لوگ اپنی بے ہودگیوں کو بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں، اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ کمیونسٹ جماعت کی ترقی بند ہو جائے، یہ کیسے ممکن ہے

سلطان علاؤ الدین کے متعلق مؤرخوں کا بیان ہے کہ ایک دفعہ جب وہ دہلی پہونچا، تو

سب سے پہلا کام یہ کیا، کہ شراب خوری سے توبہ کر کے منادی کرادی، کہ آئندہ کوئی شخص شراب استعمال نہ کرے، چنانچہ اس نے اپنی حدودِ حکومت سے نہایت کامیابی کے ساتھ شراب خوری کا نام و نشان مٹادیا، خفیہ پولیس محکمہ قائم کیا . . . کسی کی مجال نہ تھی جو کاشتکار سے ایک حبہ یا ایک دانہ زیادہ وصول کر سکے، رشوت قطعاً موقوف ہوگئی، جھوٹ بولنے کی سخت سزا مقرر کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ اس کی حدودِ حکومت سے کذب و دروغ کا نام و نشان مٹ گیا، . . . . ملک میں ضروریات زندگی کی اس قدر ارزانی ہوگئی، کہ گندم ساڑھے سات جیتل کے ایک من آتے تھے

---

[1] آئینۂ حقیقت نما حصہ دوم ۲۵

چیتل تانبے کا سکہ تھا، ایک روپیہ میں چالیس چیتل ہوتے تھے یعنی فی روپیہ پونے چھ من گندم آتے تھے"[1]

واقعہ یوں ہی ہے کہ سلطان اور حکام بالا درست ہو جائیں تو پورا ملک سدھر جائے اب تو بڑے لوگ سارا عیب غریبوں کا ہی بتاتے ہیں، اپنے عیوب پر قطعاً نظر نہیں کرتے، اپنے کو منزّہ اور پاکیزہ سمجھتے ہیں، حالانکہ ان کی پرائیویٹ زندگی گندگیوں میں لتھڑی ہوئی ہوتی ہے، دنیا کی ساری برائیاں ان میں موجود ہوتی ہیں اور زبان کے سوا ان کا سب کچھ گندہ ہوتا ہے

---

[1] آئینۂ حقیقت نما ج ۱ ص ۲۷

تاریخ اسلام پر ایک نظر

یہ اسلامی تاریخ کے مختلف دوروں کے تمام ضروری واقعات وحالات کا نہایت جامع اور مکمل خاکہ ہے جس کی ترتیب میں تاریخ نویسی کے جدید تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے، طرزِ بیان نہایت ہی دل نشین اور دل پذیر۔

تاریخ اسلام پر علمائے اسلام نے اگرچہ عربی، فارسی، اردو اور دوسری زبانوں میں بڑی بڑی محققانہ کتابیں لکھی ہیں لیکن اس زمانے کے انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے ایک ایسی جامع اور مختصر تاریخ کی شدید ضرورت تھی جس میں نہ صرف آنحضرتؐ اور خلفائے راشدین کے سوانح حیات کے ساتھ خلافت بنی امیہ وخلافت بنی عباس، خلفائے فاطمین عثمانی سلاطین اور دیگر مسلم بادشاہوں کے حالات درج ہوں بلکہ اس میں اسلامی معاشرت وتمدن اور مسلمانوں کی شاندار علمی خدمات کا بھی موثر انداز میں ذکر ہو اور تاریخی حقایق کے نتائج پر بھی مبصرانہ نظر ڈالی گئی ہو۔

اس کتاب سے یہ کمی پوری ہو گئی ہے اور تاریخ اسلام پر ایک تحقیقی اور نفیس کتاب سامنے آگئی ہے صفحات ۵۲۸ اعلیٰ درجہ کا کاغذ عمدہ طباعت وکتابت قیمت چھ روپے۔ مجلد چھ روپے آٹھ آنے۔

مینیجر مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی

دیوان ابوطالب کلیم

از

جناب مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشیؔ
(ناظم کتاب خانۂ عالیہ رام پور)

دیوان کلیم کا نسخہ، ½ ۹×۴ سائز کے ۱۴۲ اوراق پر مشتمل ہے۔ کتابت کا ناپ ¾ ۴ × ½ ۲ ہے۔ مسطر ۱۷ سطری اور کاغذ کشمیری باریک ہے۔ پورے نسخے میں سنہری اور سیاہ دہری جدولیں ہیں۔ متن کتابت سیاہ اور عنوانات قصائد و قطعات شنگرفی ہیں سرورق پر یہ شعر لکھا ہے

ہر ورق را کہ ازیں گردانی گلِ دیگر شگفد، گردانی

اس شعر کو کسی بعد کے مالک نے بڑے خط میں دوبارہ لکھا ہے۔ اس شعر کے نیچے بائیں گوشے میں ترچھی سطروں کے اندر یہ عبارت درج ہے:

"در خطۂ کشمیرِ دلپذیر، ملا ابوطالب کلیم ایں دیوانِ بلاغت نشان را بفقیر تکلیف نمودند ذرۂ بے مقدار محمد کاظم بن محمد امین منشی عفر۔۔۔۔۔"

اس عبارت کی داہنی طرف لکھا ہے:

"و غزلیاتی کہ در حاشیہ نوشتہ بخطِ اوست، رحمہ اللہ تعالےٰ"۔

نسخے کا آغاز قصائد سے ہوتا ہے، چنانچہ ورق ۱ب سے پہلا قصیدہ شروع ہوتا ہے جو نعتیہ ہے۔ اس کا آغاز ہے۔

"شوق ہر کس را کہ در راہِ طلب سر می دہد"

اسی صفحے میں بسم اللہ کے اوپر رنگین لوح کے لئے سادہ جگہ چھوڑی گئی تھی۔ اس میں لکھا ہے

"من متملکاتِ مرزا غیاث الدین خاں"

اس لوح کے اوپر اور ورق ۲ الف کے حاشیہ بالا پر مُہر ہے جس میں لکھا ہے: "عماد الدولہ معتمد الملک سید یوسف علی خاں بہادر عماد جنگ ۱۲ـــــــ سنہ" (اکائی اور دہائی کے ہندسے صاف نہیں آئے) مشمولات کی صورت یہ ہے کہ ورق اب ـــ ۱۱۳ ب تک قصائد، قطعات، ترجیع بند اور مثنویاں ہیں۔ قطعوں اور قصائد میں تاریخی بھی ہیں اور غیر تاریخی بھی۔

ورق ۱۱۴ ب ـــ ۲۳۴ الف تک غزلیں ہیں، اور اسی صفحے سے ورق ۲۴۱ ب تک رباعیاں ہیں۔

نسخہ ناقص الآخر ہے، اس لئے سنہ کتابت وغیرہ کا پتا نہیں چلتا۔ جیسا کہ سرورق کے ایک نوٹ میں کہا گیا ہے، دیوان کے حواشی پر کلیم کے قلم کے حسب ذیل اضافے بھی ہیں۔

(۱) پہلی نظم ایک قطعہ ہے، جو ورق ۶۵ الف کے حاشیے پر بعنوان۔ "در معذرت توارد گفتہ ام" درج ہے۔ اس عنوان کے نیچے "یا علی" لکھا گیا ہے جو آئندہ بھی ہر اضافے کے شروع میں تحریر ہے، اور پھر قطعے کا اس شعر سے آغاز ہوتا ہے:

منم کلیم بطورِ بلندی ہمت کہ استفادۂ معنی خبر از خدا نکنم

اس کے بعد شعر ہیں۔

(۲) ورق ۱۳۰ ب پر ایک ۹ شعر کی غزل ہے جس کا مطلع ہے:

چشم ہر کس ماہ سیا روشن است ز آتشِ دل ہم چو مجمر دیدۂ ما روشن است

(۳) ورق ۱۳۷ ب پر بھی ۹ شعر کی غزل ہے، جس کا مطلع ہے۔

در طریقِ خود نمائی شیدۂ دلخواہ نیست غیر دعوی بلند و ہمتِ کوتاہ نیست

(۴) ورق ۱۴۷ ب پر ۹ شعر کی غزل ہے، جس کا مطلع ہے:

دل بزیبِ زینتِ گیتی ہنر پرور نیست غیر نقش بوریا بر خویشتن زیور نیست

(۵) ورق ۱۴۸ الف پر ۱۰ شعر کی غزل ہے، جس کا مطلع ہے۔

دائم گلہ چرخ، دلا ور در زباں چیست گر ناوکِ جوری رسدت، جرمِ کماں چیست

(۶) ورق ۱۵۰ الف پر ایک غزل متن دیوان میں ہے، جس کا مطلع ہے:

نخلِ امید ز بار افتاد است | با غم از چشم بہار افتاد است

اس غزل کے پانچویں شعر کی ردیف کے نیچے سقوط کی علامت (۷) بنا کر حاشیے پر یہ ۳ شعر لکھے ہیں:

تختہ آخر بے تابوت کسی است | کہ ز دریا بکنار افتاد است
اضطرابِ نگہت از دل ماست | باز، چشمش بشکار افتاد است
حسنِ تو با ہمہ بی پروائی | در پی خون بہار افتاد است

(۷) ورق ۱۶۸ الف پر ۱۰ شعر کی یہ غزل درج کی ہے:

خصم کو ایمن نشیں کر دست ما بالا شود | تیشہ بر پا می زنم آندم کہ دست آزما شود

(۸) ورق ۱۹۲ ب پر ۱۱ شعر کی یہ غزل ملتی ہے:

اقلیم دل بزور مسخر نمی شود | این فتح بے شکست میسر نمی شود

(۹) ورق ۱۹۳ الف پر ۹ شعر کی یہ غزل لکھی ہے:

گر گرم در طبع نبود، بادہ اش پیدا کند | شیشہ می ترک سر از ہمت صہبا کند

(۱۰) ورق ۱۹۳ ب پر ۹ شعر کی یہ غزل ہے:

بر لبم ہم چو جرس خندہ فغان می گردد | آب اگر می خورم، از دیدہ رواں می گردد

(۱۱) ورق ۲۲۳ الف پر ۹ شعر کی یہ غزل ہے:

نصیبِ ماست ز بیان بر سر زیاں دیدن | گلی نچیدن و دیدارِ باغبان دیدن

ان حاشیوں کے اضافوں کے ماسوا ورق ۱۱۸ ب، ۱۳۶ الف اور ۲۰۴ ب کے حاشیوں پر بھی کلیم کی غزلیں درج ہیں۔ مگر یہ سب نسخے کے کاتب ہی کے قلم کی نوشتہ ہیں۔

ورق ۲۰۵ ب کے حاشیے پر ایک غزل تیسرے خط میں مندرج ہے، اس کا عنوان ہے "راقمہ" اور مقطع میں ہادی تخلص ملتا ہے، جس کا یہ مطلب ہے کہ کسی ہادی تخلص کے شاعر

نے لکھی ہے۔ اس غزل کے یہاں دیوانِ کلیم میں لکھنے کی تقریب صرف اتنی ہے کہ اسی صفحے میں کلیم کی ایک غزل ہے، جس کا شعر ہے:

از ظفر خاں بود آں جمیعت طرحِ غزل باکہ دیگر زلف معنی را پریشاں می کنیم

اس شعر کے دوسرے مصرع کو ہادی نے اپنے مقطع میں درج کرلیا ہے۔ کہتا ہے

ہادی، ایں مصرع کلیم از روی حسرت گفت و رفت باکہ دیگر الخ

ایک بات یہ ذکر کے قابل ہے کہ حواشی کے یہ سب اضافے سنہری خطوط میں گھیر دیئے گئے ہیں۔ اور نسخے پر کرم خوردگی اور آب رسیدگی کے نشان بھی نظر آتے ہیں۔

دوسری بات یہ عرض کرتا چلوں کہ محمد کاظم بن محمد امین منشی، جسے کلیم نے یہ نسخہ تحفۃً دیا تھا عالمگیر نامے کا مصنف ہے، اور بقول مرآۃ العالم سنہ ۱۰۹۱ھ میں فوت ہوا ہے۔ لیکن تاریخ محمدی میں لکھا ہے کہ ایک ثقہ شخص کی تحریر سے معلوم ہوا کہ شاہجہاں آباد میں سنہ ۱۰۹۲ھ میں وفات پائی۔ خود کلیم نے ۱۵ ذیحجہ سنہ ۱۰۶۱ھ میں انتقال کیا ہے، اور "طور معنی بود روشن از کلیم" مادۂ تاریخ وفات ہے۔ تذکرۂ شیر خاں سودی میں سنہ ۱۰۶۲ھ میں انتقال لکھا ہے، مگر دوسرے تمام ماخذ اس کی تائید نہیں کرتے،

چونکہ یہ خود مصنف کا نسخہ ہے اور ایک بہت بڑے فاضل کے پاس رہ چکا ہے، اس لئے دو اہم شخصوں کی تحریروں کا حامل ہونے کے باعث بے حد قابلِ قدر ہے۔

سید صاحبؒ کی زندگی کے وہ خاص گوشے

جن سے میں متاثر ہوا

از

(عتیق الرحمٰن عثمانی)

لکھنؤ کے ایک یادگار تاریخی اجتماع میں جو مورخ اسلام علامہ سید سلیمان ندوی کے سانحۂ وفات پر اظہار غم کے لئے ۲۶، ۲۷ر دسمبر ۱۹۵۳ء کو ندوۃ العلماء کے لائبریری ہال میں منعقد ہوا تھا، قلت وقت اور بے فرصتی کی وجہ سے اس کے لئے کوئی مقالہ تیار نہیں ہو سکا تھا تاہم اس باکمال شخصیت کے حادثۂ ارتحال کے طبعی اثر اور اجتماع کے داعیٔ خاص مولانا سید ابوالحسن علی کے ارشاد کی تعمیل میں شرکت کی سعادت میسر ہوئی اور غیر ارادی طور پر ایک ایسے عنوان پر کچھ کہنے کا موقع مل گیا جس کی عام حالات میں کوئی خاص اہمیت نہیں ہو سکتی تھی

چونکہ یہ علمی اجتماع جس میں مقامی اور غیر مقامی اہلِ علم و فضل اور اربابِ کمال کی بہت بڑی تعداد شامل تھی سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی غیر معمولی علمی خدمات کی یاد ہی تازہ کرنے کے لئے انعقاد پذیر ہوا تھا اس لئے قدرتی طور موضوعِ سخن مرحوم کے کمالات و خصائل ہی ہو سکتے تھے، چنانچہ دو روزہ کے اس اجتماع میں جس کو اپنی سنجیدگی، سادگی خلوص، اثر پذیری اور عظمت کے لحاظ سے ایک بے مثال اجتماع کہا جا سکتا ہے، سید صاحب کی علمی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر خوب خوب مقالے پڑھے گئے، اور سادہ، سادہ اچھی اچھی تقریریں ہوئیں۔

میری تقریر کی اطلاع مولانا سعید احمد حیف ایڈیٹر "برہان" کو ہوئی تو انھوں نے مجھ سے دریافت کئے بغیر "برہان" کے "نظرات" میں اس کی اشاعت کا اعلان کر دیا حالانکہ

اس وقت تک نہ تو یہ تقریر قلم بند ہو سکی تھی اور نہ اس کو "برہان" میں شایع کرنے کا خیال تھا البتہ مولانا ابو الحسن علی دام فضلہم نے اس کو ضبطِ تحریر میں لانے کے لئے اصرار فرمایا تھا اور وہ اس کو "معارف" کی اشاعتِ خاص میں دینا چاہتے تھے،

مولانا سعید احمد میرے مزاج کی اشتاد کے سب سے بڑے رمز شناس واقع ہوئے ہیں اس لئے انھوں نے دباؤ ڈالنے کا غالباً یہی انداز پسند کیا اور اس طرح بدرجۂ مجبوری تقریر کے بعض اجزا قلم بند کرنے پڑے، مجھے احساس ہے کہ "برہان" میں اس کی اشاعت مولانا علی میاں کی اجازت کے بغیر نہیں ہونی چاہئے تھی لیکن اس کا بھی موقع نہیں مل سکا اور اب موصوف سے معذرت کے ساتھ تقریر کے بعض حصّے پیش کئے جا رہے ہیں جو معاصر عزیز "نشانِ منزل" بقول بٹ کے بیان گئے مطابق "الفاظ کے لحاظ سے اگرچہ مختصر ہے مگر معنی کے لحاظ سے مفصل اور حقیقی تاثرا میں ڈوبی ہوئی ہے۔" (عتیق الرحمٰن عثمانی)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفیٰ وَسَلَامٌ عَلیٰ عِبَادِہِ الَّذِینَ اصْطَفیٰ، اما بعد،

بزرگو! اور دوستو!

یہ اجتماع جو دو روز سے اس عظیم الشان اور تاریخی ہال میں ہو رہا ہے ہر حیثیت سے ایک مقدس اور یادگار اجتماع ہے، جس شخصیت کے تذکار اور جس کی یاد منانے کے لئے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں وہ ایک عظیم و جلیل شخصیت تھی جس نے کسی ستایش کی تمنا اور صلے کی پرواہ کے بغیر کم و بیش ۴۵ سال تک علم و مذہب، ادب و انشا اور ملک و ملّت کی ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔

آپ کو معلوم ہے حضرت سید صاحب سے میرا تعلق استاذی، شاگردی کا نہیں تھا، میں نے درس و تدریس کے ضابطے میں سید صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہیں کیا تھا، ایک شاگرد اپنے استاذ اور ایک مرید اپنے مرشد کی تعریف اور مدحت سرائی میں کبھی کبھی بے ارادہ کبھی مبالغے سے کام لینے لگتا ہے اور اس کے بیان کے انداز اور لب و لہجے میں غُلو کا شائبہ آسکتا ہے لیکن مرحوم سے میرا علاقہ اس طرح کی تمام مقدس اور رسمی حد بندیوں سے آزاد رہا ہے، بنابریں میں جو

کچھ عرض کروں گا قدرتی طور پر اس کا وزن زیادہ ہوگا اور اس میں حقیقت کی زیادہ سے زیادہ صحیح ترجمانی ہوگی۔

مجھے یاد آتا ہے کہ حضرت سید صاحب سے میری پہلی باقاعدہ تفصیلی ملاقات ۱۹۲۱ء میں ہوئی تھی اس سے پہلے عم محترم حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس میں بارہا ان کا ذکر سنا تھا لیکن قاعدے ضابطے کی یہ پہلی ملاقات تھی، یہ وہ وقت تھا کہ مرحوم وفد خلافت کے امیر کی حیثیت سے "دارالعلوم دیوبند" میں تشریف لائے تھے اور میں "دارالعلوم" سے فارغ ہی ہونے والا تھا، ۱۹۲۰ء-۲۱ء تحریک خلافت کے شباب کے سال تھے، ہم لوگوں نے ان دنوں "دارالعلوم" میں "جمعیۃ الطلبہ" کے نام سے ایک نفیس اور زبردست تنظیم قایم کر رکھی تھی، یہ تنظیم ہمہ گیر تھی اور اس وقت اس کا نظام پورے ملک کے تقریباً تمام قابل ذکر عربی مدرسوں میں پھیلا ہوا تھا، جمعیۃ الطلبہ اپنے نظام کار اور وقتی مقاصد کی تبلیغ کے اعتبار سے ایک بہترین انجمن سمجھی جاتی تھی اور جہاں تک حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ کے نقوشِ قدم کی پیروی کا تعلق تھا اس کی خدمات نہایت ہی روشن تھیں، یہی وجہ تھی کہ جب کبھی اس طرح کا کوئی موقر وفد ان دنوں "دارالعلوم" میں آتا تھا، دارالعلوم کے مہتمم صاحب "جمعیۃ" کی وقتی خدمات کو خاص طور اس کے سامنے سراہا کرتے تھے۔

بہر حال میں عرض کر رہا تھا کہ اس موقع پر پہلی مرتبہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تفصیل سے باتیں کرنے کا موقع ملا، موصوف سے میری یہ ملاقات جمعیۃ الطلبہ کے ذمہ دار کی حیثیت سے ہوئی تھی، اس وقت پہلا جملہ جو سید صاحب کی زبان سے نکلا یہ تھا "ہدایہ کی زنجیروں میں کب تک بندھے رہوگے" پھر کچھ وقفے کے بعد فرمایا اگر کوئی تم سے یہ کہے کہ "زمانہ" قدیم ہے تو تم اس کے خلاف اُس کے حدوث پر کیا دلیل دوگے میں نے جواب میں قرآنِ مجید کی یہ آیت پڑھی ھَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّھْرِ لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا جس کو سن کر سید صاحب خندہ زیر لب سے مسکرا دئے، ۳۲ سال پہلے کی یہ ملاقات کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے اور لیل ونہار کی اس طویل گردش کے باوجود یہ واقعہ آج بھی ذہن ودماغ میں اسی طرح جما ہوا ہے۔

حضرت سید صاحب کی شکل وصورت، وضع، قطع، چال، ڈھال، لباس کی سادگی اور

صفائی، پُر وقار فروتنی اور انکسار و تواضع میں یوں بھی کچھ کم دل آویزی نہیں تھی، فی الحقیقت اُس وقت مجھ پر موصوف کی شخصیت کا غیر معمولی اثر پڑا حالانکہ جاننے والے جانتے ہیں کہ ظاہری عقیدت اور نیازمندی کے جذبات کی مجھ میں ہمیشہ کمی رہی ہے اور یہ کمی سطحی نظر رکھنے والوں کو کبھی کبھی غلط فہمی میں مبتلا کر دیتی ہے یہاں تک کہ ان کو اس پر تمرّد کا گمان ہونے لگتا ہے، اس وقت سید صاحب کو قریب سے دیکھ کر مجھ پر جو اثر ہوا تقریب الی الفہم کے لئے اس کو اس روایت کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے جو مشہور اہل کتاب صحابی حضرت عبداللہ بن سلام کے متعلق وارد ہے، اس روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ جب وہ تورات کی پیشین گوئیوں کو منطبق کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو جیسے ہی ان کی نظر چہرۂ انور پر پڑی بے اختیار پکار اُٹھے "خدا کی قسم یہ چہرہ کسی جھوٹے کا چہرہ نہیں ہو سکتا" یہ تشبیہ اور تمثیل کے طور پر نہیں محض بات کو قریب کرنے کے لئے عرض کر رہا ہوں، اس کے بعد موصوف کو کتنی ہی بار دیکھا اور کتنی ہی ملاقاتیں ہوئیں اور ہمیشہ ان کے انداز فکر اور شیوۂ متانت سے سبق لیتا رہا، آخری ملاقات ابھی گذشتہ مئی ۱۹۵۳ء کو دہلی ہی میں ہوئی تھی جب مرحوم "ندوۃ المصنفین" کے دفتر میں تشریف لائے اور بڑے تپاک سے معانقہ کیا، ہم لوگ باتیں کرنا چاہتے تھے لیکن صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ خاموش رہنا چاہتے ہیں، ان کے شگفتہ چہرے سے افسردگی و پژمردگی ٹپک رہی تھی،

دوستو! سید صاحب جس وقت اُفقِ علم پر اُبھرے اس وقت علماء عام طور پر چھوٹی چھوٹی باتوں میں اُلجھے ہوئے تھے، ان کے یہاں اہم اور غیر اہم کی کوئی تفریق نہیں رہی تھی، معمولی معمولی مسئلوں پر ہنگامے برپا ہو رہے تھے یہاں تک کہ نماز میں آمین زور سے پڑھنے یا آہستہ پڑھنے کے مقدمات ابتدائی عدالتوں اور ہائی کورٹوں میں چل رہے تھے اور انگریز جج مسلمان عالموں سے دریافت کرتے تھے "ہم کو چار اماموں کی بات سمجھایئے" حالانکہ سب جانتے ہیں کہ آمین آہستہ پڑھنے یا زور سے پڑھنے کا تعلق جواز و عدم جواز سے نہیں صرف استحباب سے ہے، اسی کے ساتھ کافر گری کی مشین کی رفتار بھی کچھ کم تیز نہیں تھی۔

اس صورتِ حال کا نتیجہ قدرتی طور پر یہ نکلا کہ بڑے بڑے اہل علم کی صلاحیتیں اس طرح کی

مجادلانہ اور مناظرانہ کج بحثیوں اور تنگ نظریوں میں ضائع ہونے لگیں اور ہر طرف افتراقِ اُمت کے مظاہر دیکھے جانے لگے،

سید صاحب محترم اُن اربابِ عزیمت و بصیرت علما میں ایک ممتاز ترین عالم دین تھے جنہوں نے اسلام کی خدمت کے لئے ایک وسیع اور بلند معیار قایم کیا اور ایک حاذق طبیب کی طرح ملتِ گم گشتہ نبض پر ہات رکھا، ان کی تصنیفی اور علمی زندگی کے پورے چالیس سال کا وسعت قلب اور احتیاط سے جائزہ لیا جائے تو ہر مرحلے پر آپ کو اس کی شہادت ملے گی اور یہ ماننا پڑے گا کہ اس شہیدِ علم نے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کو بہترین مصرف میں صرف کیا اور قوم و ملت کا دامن صالح و سنجیدہ لٹریچر سے مالا مال کر دیا، مستشرقینِ یورپ نے ریسرچ ورک کے نام سے اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے مشن اور آپ کی ذاتِ گرامی پر جو خوفناک حملے کئے ہیں اور آئے دن کرتے رہتے ہیں اُن کا مقابلہ علم و تحقیق کے اسی رنگ اور اُسی انداز میں جس طرح سید صاحب مرحوم نے کیا وہ اپنی مثال آپ ہے اس مرحلے پر سب سے اہم اور لایقِ ذکر بات یہ ہے کہ مرحوم نے اس مسلسل زبردست علمی اور تحقیقی جنگ میں تعلیماتِ اسلامی کی حقیقی روح کی نہ صرف حفاظت کی بلکہ اس کو علم و بصیرت کی تمام رعنائیوں کے ساتھ اجاگر کرتے رہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر سید صاحب نہ صرف اپنے ہم صفیروں اور عام مسلمان مورخوں سے ممتاز نظر آتے ہیں بلکہ اپنے شہرۂ آفاق استاذ: مولانا شبلی مرحوم سے بھی چند قدم آگے بڑھ جاتے ہیں، سچ تو یہ ہے اس مختصر فرصت میں مرحوم کی زندگی کے اس گوشے پر اُچٹتی ہوئی نظر ڈالنا بھی دشوار ہے۔ باقی

العلم والعلماء

یہ بہت بڑے امام حدیث علامہ ابن عبدالبر کی شہرۂ آفاق کتاب "جامع بیان العلم وفضلہ" کا نہایت نفیس ترجمہ ہے کتاب کے مترجم مشہور ادیب اور بے مثال مترجم عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی ہیں یہ ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ارشاد کی تعمیل میں کیا گیا تھا جو اب ندوۃ المصنفین سے شائع کیا گیا ہے۔

علم و فضیلتِ علم و علما پر اس درجے کی کوئی کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی، صفحات ۳۰۰، بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت، طباعت بہت عمدہ۔ قیمت چار روپے آٹھ آنے۔ مجلد پانچ روپے آٹھ آنے۔

ادبیات

غزل

از

(جناب الم مظفر نگری)

اس بھید سے کسی کی نظر آشنا نہیں — جلوہ نما تو ہے وہ مگر خود نما نہیں

سرگشتۂ خیالِ فنا و بقا نہیں — جس دل کا زندگی میں کوئی مدعا نہیں

رتبہ شناس زندگیٔ عشق کا نہیں — وہ دل کہ جس کو شوق گناہِ وفا نہیں

اپنی حقیقتوں سے ابھی آشنا نہیں — عارف تو ہے تو عارف باطل ہوا نہیں

مقصد حیاتِ عشق کا پورا ہوا نہیں — سینے میں آدمی کے ابھی دل بنا نہیں

نیرنگی حجاب ہے پردہ اٹھا نہیں — وہم غلط میں آنکھ مری مبتلا نہیں

ابھریں گے راہِ عشق میں مٹ مٹ کے اور بھی — یہ نشانِ سجدہ سر نقشِ پا نہیں

کیوں آگیا ہے ذہنِ رسا کے فریب میں — جس کو تو کہہ رہا ہے خدا وہ خدا نہیں

پہچانتا ہوں تجھ کو تجلیِ حسنِ دوست — کیا تو ظہور جلوۂ بے رنگ کا نہیں

شبنم گلوں سے وقتِ سحر کہہ کے اُڑ گئی — وہ راز جس سے اہلِ چمن آشنا نہیں

تکلیفِ خواب دے نہ مجھے اے شبِ لحد — مدت ہوئی کہ نیند سے میں آشنا نہیں

جاتا نہیں ہے کعبۂ مقصود کی طرف — وہ راستہ کہ جس میں کوئی بت کدا نہیں

یوں ہیں خطائیں فردِ عمل میں لکھی ہوئیں — گویا کہ ان میں ایک بھی میری خطا نہیں

پیغامِ شوق لے کے جو آئی تھی اے الم
اب وہ نظر بھی دل میں خلش آزما نہیں

"ساقی"

از

(جناب شارق میرٹھی ایم۔ اے)

باایں دیوانگی وہ صاحبِ عرفان ہے ساقی
ترا دیوانہ بننے کا جسے ارمان ہے ساقی

مجھے دنیا سے کیا مطلب مجھے عقبیٰ سے کیا مطلب
تری الفت تری چاہت مرا ایمان ہے ساقی

زباں پر نام، دل میں یاد، آنکھوں میں تری صورت
ترے دیوانۂ الفت کی یہ پہچان ہے ساقی

بہت پر شوار پیچیدہ ہیں رستے دین و دنیا کے
جو تو مل جائے یہ منزل بہت آسان ہے ساقی

ترا آنا زمانہ کے لئے رحمت کا باعث ہے
جو کافر اس کا منکر ہے بہت نادان ہے ساقی

میسّر جس کی آنکھوں کو ہیں نظارے مدینے کے
اُسے کب کوثر و تسنیم کا ارمان ہے ساقی

خوشی تیری خوشی اس کی، رضا تیری رضا اس کی
ترا جو حکم ہے اللہ کا فرمان ہے ساقی

کلاہ و تاج والے اس کے در پر سر بسجدہ ہیں
زمانہ سے الگ تیرے گدا کی شان ہے ساقی

ہے میرے پاس اب کیا اور جو قرباں کروں تجھ پر
یہ دل قربان ہے ساقی یہ جاں قربان ہے ساقی

خدا وہ دن دکھائے تیرا سنگِ در ہو میرا سر
مرے ٹوٹے ہوئے دل کا یہی ارمان ہے ساقی

تصحیح

برہان بابت جنوری سنہ ۵۳ء میں "عرفان مختوم، ترجمہ گیتائے منظوم" کا پانچویں شعر کا دوسرا مصرعہ یوں پڑھا جائے گا،

ریاضِ دل پھر ہے اک دل لگی

اور نویں شعر کا دوسرا مصرعہ اس طرح پڑھیئے

ہوا بند اس پر در ما سوا

شئون علمیہ

رنگ اور اعصاب

مسٹر والٹر بینیٹ نے رائل سوسائٹی آف آرٹس کے سامنے ایک مقالہ پڑھا جس میں انھوں نے دعویٰ کیا کہ رنگ کا اثر اعصاب پر پڑتا ہے۔ اس لئے نہ صرف گھر کی آرائش میں صحیح رنگوں کا استعمال کرنا چاہئے بلکہ صنعت میں بھی اس کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ مشینوں کے تیز حرکت کرنے والے یا خطرناک حصوں کے رنگ روشن ہونے چاہئیں تاکہ حادثوں سے بچا جا سکے۔ بعض رنگ ایسے ہوتے ہیں جو آنکھ کے بار کو کم کرتے ہیں اور بعض چمک کو کم کر دیتے ہیں چنانچہ شفاخانوں میں ڈاکٹروں کو تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ نیلے یا سبز رنگ سے "شفا" میں مدد ملتی ہے۔ کارخانوں میں جو چائے خانے وغیرہ ہوتے ہیں وہ بری طرح "دل آزار" ہوتے ہیں۔ بقول مسٹر بنیٹ ان میں کارخانے یا مالکوں وغیرہ کے فوٹو نہ ہونا چاہئیں۔ کیونکہ وہاں لوگ دم لینے آتے ہیں۔ اس لئے ایسی چیزیں ان کی نگاہوں کے سامنے آنی چاہئیں کہ وہ ذرا دیر کے لئے کارخانے سے "دور" ہو جائیں۔ جب غلط رنگ استعمال کئے جاتے ہیں تو کام کرنے والے بلا سبب جانے "پریشان" ہو جاتے ہیں اس سے نہ صرف کام پر اثر پڑتا ہے بلکہ حادثے بھی زیادہ واقع ہوتے ہیں۔

جوہری ہیرا

لندن سے خبر آئی ہے کہ جوہری توانائی کو کام میں لا کر ہیرے میں سبز رنگ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ یعنی اگر کسی کے پاس ہیرے ہوں تو اس کو چاہئے کہ وہ انھیں ایسے سائنس داں کے پاس بھیج دے جس کے پاس سائیکلوٹرون ہو۔

تجربوں سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ ہیرے پر الفا ذرات کی بمباری سے اس میں نہایت خوشنما سبز رنگ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ یہ رنگ پائدار ہوتا ہے جس سے ہیرے کی قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔

بالاصوتی مشین

کپڑوں کو دھونے کے لئے جو مشینیں استعمال کی جاتی ہیں ان میں کپڑوں کو ایک بڑے بیلن میں سیل کٹ دواؤں کے ساتھ ڈال کر خوب گھمایا جاتا ہے

جس سے کپڑوں سے میل نکل جاتا ہے۔ لیکن اب یہ کام آواز کی تیز رفتار موجوں سے لیا جائے گا جن کو بالاصوتی (سوپر سونک) موجیں کہتے ہیں۔

اس ایجاد کا اعلان ہنگری میں سال گزشتہ کے ماہ اگست میں کیا گیا تھا اور اب ان مشینوں کو بڑے پیمانے پر تیار کرنے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔

ان مشینوں کو اب گھمانے کی ضرورت نہ ہوگی بلکہ بالاصوتی موجیں یہ کام انجام دیں گی جب یہ موجیں ان کپڑوں پر سے گزاری جائیں گی تو گرد و غبار اور میل سب چھٹ کر الگ ہو جائے گا۔

توقع کی جاتی ہے کہ موجودہ مشینوں کے مقابلے میں یہ مشینیں زیادہ کارگزار ہوں گی اور کپڑوں کے حق میں بھی زیادہ مہربان ثابت ہوں گی اور یہ سارا کام ۱۵ منٹ میں انجام دیں گی اور صرفہ بھی ان پر کم آئے گا

پیش گو مشین پیش گوئی اب تک نجومیوں اور جوتشیوں اور اسی قبیل کے دوسرے لوگوں سے مخصوص سمجھی جاتی ہے لیکن اب سائنس نے بھی اس میدان میں قدم رکھا ہے، بالفاظِ دیگر اگر سائنس دانوں کی بات مانی جائے تو مستقبل کی پیشین گوئی اب سائنسی طریقہ پر کی جا سکے گی۔ چنانچہ سمندر میں مد و جزر کی پیش گو مشینیں اب بھی زیر استعمال ہیں۔

پہلے یہ ہوتا تھا کہ ریاضی دانوں کو بڑے بڑے حسابات لگانا پڑتے تھے جب جا کر مد و جزر کا پتہ ملتا تھا۔ لیکن اب یہ سب کام ایک مشین سے لیا جاتا ہے جس کو مد نگار (ٹائڈ گراف) کہتے ہیں۔ ان کی مدد سے معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں دن فلاں بندرگاہ میں مد و جزر کے لحاظ سے کیا واقع ہوگا۔ اس کے لئے بجائے گھنٹوں کے اب منٹوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

راسخین یہ کہیں گے کہ مشین کو چند "واقعات" بہم پہنچائے جاتے ہیں اور وہ جواب تیار کر دیتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ لیکن نہیں اس سلسلے میں عجیب و غریب باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ چنانچہ امریکہ کے جان ہاپکنس ہسپتال میں ڈاکٹر شنٹر نے یہ دریافت کیا ہے کہ دماغی امراض کے مریضوں میں ایک خاص قسم کی دوربیت ہوتی ہے۔ ہر مریض کا دور الگ ہوتا ہے اس سے

ڈاکٹر یہ بتلا سکتے ہیں کہ کسی خاص دن اس مریض کا برتاؤ کیا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کم از کم دماغی مریض کو "جنم پتری" کی ضرورت نہ ہوگی۔ ایک تربیت یافتہ ڈاکٹر دنوں پیشتر بتلا سکے گا کہ فلاں فلاں دن اس مریض کے احساسات کیا ہوں گے۔

جانوروں پر تجربے سے معلوم ہوا کہ ان کا دور ۱۴ دن کا ہوتا ہے۔ جس کا باعث غدہ بلغمیہ ہوتا ہے۔ اور برتاؤ کے اعتبار سے دور ۳۰ دن کا ہوتا ہے جس کا سبب تھائراڈ غدہ ہوتا ہے۔ ویسے سب لوگ جانتے ہیں کہ بہ لحاظ ساخت حیوان انسان کے مقابلے میں سادہ تر ہے۔ لیکن یہ بھی تجربے میں آیا ہے کہ ایک متوازن اور ٹھنڈے مزاج والے انسان کے لئے ایک وقت آتا ہے کہ گویا وہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ رنشٹر نے حیوانوں میں ایسی 'دوریت' کا پتہ لگا کر اس کی پیمائش کر لی ہے۔ پس کیا عجب ہے کہ ایسی مشینیں ایجاد ہو جائیں جو یہ بتا سکیں کہ فلاں دن فلاں انسان آپے سے باہر ہو جائے گا۔

موسم کے لئے بھی ایسی مشینیں کام میں لائی جاتی ہیں۔ موسمی خبریں ایک مرکز پر جمع ہوتی ہیں جہاں ایسی مشین ہوتی ہے۔ جو ان تمام "خبروں" کو درج کر لیتی ہے اور پھر آئندہ کے لئے نتیجہ نکال دیتی ہے۔ ان ہی نظائر کی بنا پر ممکن ہے کہ جرائم، جذباتی تہیجات اور ازدواجی مناقشات کی پیش گوئی کرنے والی مشینیں وجود میں آجائیں۔

توقع ہے کہ ایسی مشینیں پلانشنیٹ وغیرہ کے طریقوں سے زیادہ صحیح ثابت ہوں گی۔

تبصرے

نظریہ دو قرآن پر ایک نظر | از مولانا محمد طیب مہتمم دار العلوم دیوبند۔ تقطیع متوسط، ضخامت ۱۱۲ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت درج نہیں پتہ:۔ ادارہ نشر واشاعت دار العلوم دیوبند ضلع سہارن پور۔

قرآن مجید روحانی اور اخلاقی ہدایت کی کتابِ الٰہی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ انسان کو دنیا میں زندگی کس طرح بسر کرنی چاہیئے مگر قرآن انسان کی مادی اور جسمانی زندگی کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ چنانچہ اس میں جگہ جگہ کائناتِ عالم اور کارگاہِ فطرت میں غور و فکر کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب و تشویق پائی جاتی ہے لیکن یہ سب چیزیں تکمیلِ نفس اور اتمامِ شخصیت میں صرف ایک وسیلہ و ذریعہ کا حکم رکھتی ہیں اصل مقصد یہی ہے کہ یہ سب کائنات انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے اور انسان خود خدا کے لئے پیدا کیا گیا ہے چنانچہ بحیثیت مسلمان کے ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ عجائباتِ عالم میں غور کرے۔ رموز و غوامض فطرت کی گرہ کشائی کرے اور عالم طبیعیات کے اسرار سربستہ کا انکشاف کر کے ان سے انسانی معاشرہ کو بہتر بنانے کا کام لے یہ سب چیزیں بہرحال: مقصود بالعرض ہیں مقصود بالذات صرف اوامر و نواہی الٰہی کی پابندی کر کے خلافت ربانی کا فرض انجام دینا ہے اس بنا پر قرآن مجید کی تعلیمات کے مطابق صحیح راہ عمل یہی ہے کہ انسان زندگی کے روحانی اور مادی دونوں پہلوؤں میں توازن و تناسب قایم رکھے اور جس کا جتنا حق ہے وہ اس کو دے آج دنیا جس عظیم تباہی و بربادی کے خطرہ سے دوچار ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اقبال کے لفظوں میں مغرب کے جس انسان نے سورج کی شعاعوں کو اپنی مٹھی میں پکڑ لیا ہے اس کا نہاں خانۂ دل تیرہ و تار ہے چنانچہ اب مغرب میں خود اس مادہ پرستی کے خلاف ردِ عمل شروع ہو گیا ہے اور مذہب و روحانیت کے چرچے ہر طرف ہونے لگے ہیں لیکن ہم مشرق والوں کا بعض طبعی اسباب کی بنا

پر یہ خاصہ ہو گیا ہے کہ اہل مغرب کسی تجربہ کو انتہا تک پہنچا کر اور اس کے نقصانات و خطرات سے عملی واقفیت حاصل کر کے اس کے ترک پر آمادہ نظر آنے لگتے ہیں تو اہل مشرق اس کو اپنے ہاں شروع کرنے پر مائل ہو جاتے ہیں اور ہمارے جو بعض ارباب قلم ہیں وہ اس کی دعوت لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اسی قسم کے ارباب قلم میں ایک صاحب پروفیسر غلام جیلانی برق ہیں۔ چنانچہ انھوں نے "دو قرآن" کے نام ایک کتاب لکھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قرآن کا اصل مقصد ہی یہ ہے کہ مادیات کی ترکیب و تحلیل اور تجزیہ و تالیف کے ذریعہ ایجادات و اختراعات اور تمدنی ترقیات کی جائیں اور چونکہ قرآن کا یہ مقصد مغربی اقوام ہی پورا کر رہی ہیں اس لیے (برق صاحب کے اپنے الفاظ میں) حقیقتاً مومن مغرب کی وہ ملحد اقوام ہیں جو ان مادی وسائل اور ان کی ترقیات میں ... پسماندہ ہیں" مسلم اقوام کی یہ مادی پستی و درماندگی بلاشبہ ایک عظیم قومی گناہ ضرور ہے لیکن اس سے بڑھ کر گمراہی اور قرآن میں تحریف اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان مادی ترقیات کو ہی ایمان و کفر، اور ضلالت و ہدایت کا معیار بنا لیا جائے اس بنا پر ضرورت تھی کہ اس کا جواب لکھا جائے، جناب مولانا محمد طیب صاحب نے زیر تبصرہ کتاب میں اسی ضرورت کو پورا کیا ہے جس پر وہ سب علماء کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ جواب نہایت مدلل، مسکت اور منطقیانہ ہے پھر بڑی بات یہ ہے کہ فاضل مصنف کا لب و لہجہ شروع سے آخر تک متین و سنجیدہ رہا ہے اور درمیان بحث میں کہیں بھی وہ تلخی پیدا نہیں ہونے پائی ہے جو اس طرح کے جوابات میں عام طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔ اصل جواب کی ... سے قطع نظر یوں بھی دوران بحث میں مولانا کے قلم سے بعض بڑی مفید دینی اور علمی حقیقتیں نکل گئی ہیں جن لوگوں نے "دو قرآن" نامی کتاب کا مطالعہ کیا ہے ان کے علاوہ دوسرے ارباب ذوق کے لئے بھی اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔

اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ

از مولانا صدر الدین اصلاحی تقطیع متوسط۔ ضخامت ۱۶۸ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۲/عہ پتہ:۔ مکتبۂ جماعت اسلامی (ہند) رام پور۔

حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک بہت مشہور رسالہ "الانصاف فی سبب الاختلاف" کے نام سے ہے جس میں حضرت شاہ صاحب نے اپنے خاص محققانہ اور مجتہدانہ انداز میں یہ بتایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ سعادت میں فقہی احکام و مسائل کے بیان کرنے کا طریقہ کیا تھا اور اس کے بعد پھر جو اختلافات پیدا ہوئے تو اس کے اسباب کیا تھے؟ حضرت شاہ صاحب نے عہدِ اختلاف کو کئی دوروں پر تقسیم کیا ہے اور ہر دور میں اختلاف کے الگ الگ وجوہ بیان فرما کر اس کے نظائر و شواہد پیش کئے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ ان اختلافات کے عام نتائج کیا ہوتے اس ضمن میں اصول فقہ، علم حدیث، تاریخ و سیر اور اجتہاد و تقلید سے متعلق بعض بڑی اہم اور بصیرت افروز بحثیں آگئی ہیں زیر تبصرہ کتاب حضرت شاہ صاحب کے اسی رسالہ کا اردو زبان میں نہایت سلیس۔ بامحاورہ عام فہم و دل نشین ترجمہ ہے۔ لائق مترجم کی یہ کوشش اس لحاظ سے بڑی قابل قدر ہے کہ اس ذریعہ اردو خواں طبقہ کو بھی علومِ ولی اللہی سے استفادہ کا موقع مل گیا۔

حقیقت نفاق از مولانا صدر الدین اصلاحی تقطیع متوسط ضخامت ۵۲ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت ۸/ پتہ :۔ مکتبہ جماعت اسلامی ہند رام پور۔

لائق مصنف نے اس رسالہ میں نفاق کی حقیقت اس کی قسمیں اور نفاق کے مظاہر و مراپا پر گفتگو کرنے کے بعد یہ بتایا ہے کہ مسلمانوں کو ان لوگوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیے "مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں منافق ہر سوسائٹی ہر پارٹی اور ہر گروہ میں کھلے دشمن سے بھی زیادہ خطرناک اور تباہ کن ہوتا ہے اور اسی وجہ سے قرآن میں جگہ جگہ بڑے شدومد کے ساتھ منافقین کی مذمت بیان کی گئی اور مسلمانوں کو ان کے فتنہ سے ہوشیار رہنے کی تاکید کی گئی ہے اس حد تک مصنف نے جو کچھ لکھا ہے درست اور صحیح ہے لیکن جماعت اسلامی کے سرگرم کارکن ہونے کی وجہ سے انھوں نے نفاق کا دامن اتنا وسیع کر دیا ہے کہ نفاق اور عصیان میں کوئی فرق نہیں رہا ہے۔ موصوف کو معلوم ہونا چاہیے کہ نفاق نام ہی اقرار باللسان اور اعتقادِ جنان میں عدمِ مطابقت کا ہے اور قرآن مجید میں جن منافقوں کا ذکر ہے اور جن کی مذمت کی گئی ہے وہ یہی ہیں جو اگرچہ ظاہری اعمال و افعال میں عام مسلمانوں جیسے

تھے مگر درحقیقت وہ نورِ ایمان اور اعتقادِ جازم سے محروم تھے۔ اس بنا پر منافق کی دو قسمیں منافق اعتقادی اور منافق عملی بیان کرنا اور پھر منافق عملی کے لئے وہی احکام ثابت کرنا جو منافق اعتقادی کے لئے ہیں مذہب خوارج کے مطابق ہو تو ہو۔ اہلِ سنت والجماعت کے موافق ہرگز نہیں ہے نفاق کی تعریف اور اس کی قسموں کا دامن بہرحال اتنا وسیع تو نہیں ہونا چاہئے کہ مغفرت و بخشش و خداوندی کا دامن تنگ ہو جائے حالانکہ اس کی بندہ نوازیوں اور بے پناہ کرم پاشیوں کا عالم تو یہ ہے کہ

رحمتِ حق بہانہ می جوید رحمتِ حق بہا نمی جوید

رازِ حیات از جناب لطافت علی صاحب ہما للت پوری۔ تقطیع متوسط ضخامت ۱۷۶ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ پتہ:۔ (۱) سرشار صاحب کسمنڈوی، ادارالاشاعت تعمیر ادب حیدرگنج لکھنؤ (۲) کتب خانہ اشرفیہ متصل مولوی مسافرخانہ بندر روڈ۔ کراچی

جناب ہماؔ شاعر ہونے کے ساتھ مذہبی اور اصلاحی جذبہ بھی رکھتے ہیں اور غالباً حضرت مولانا تھانویؒ کے سلسلہ بیعت سے وابستہ بھی ہیں اس لئے انھوں نے اپنی شاعری سے وعظ و نصیحت پند و تذکیر کا کام لیا ہے اس مجموعہ میں موصوف کی جتنی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر یہی رنگ ظاہر ہے۔ تاہم بحیثیت شاعر کے ان کے کلام میں روانی، سلاست، درد و گداز اور سوز و اثر وہ تمام اوصاف موجود ہیں جو ایک اچھے شاعر کے کلام میں ہونے چاہئیں، اس لئے اس مجموعہ کا مطالعہ ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہوگا۔

پیارے رسول از جناب افضل حسین صاحب ام۔ اے۔ ال۔ ٹی تقطیع متوسط ضخامت ۸۱ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت ۵ پتہ:۔ مکتبہ جماعت اسلامی مہذ رام پور۔

جماعت اسلامی بچوں کے لئے جو نصاب تیار کر رہی ہے یہ رسالہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس میں بچوں کی عام فہم اور سلیس زبان میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض ابتدائی واقعات اور آپ کے اخلاقی کمالات بچوں کی استعداد ذہنی کے مطابق بیان کئے گئے ہیں رسالہ اپنے مقصد میں کامیاب ہے عام اسلامی مدارس و مکاتب بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

بُرہان

جلد نمبر ۳۲ شمارہ نمبر ۳

مارچ ۱۹۵۴ء مطابق رجب المرجب ۱۳۷۳ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

فَأَيْنَ تَذْهَبُونَ

جس فوجی امداد کا آج کل ہر جگہ چرچا ہے۔ کہنے کو وہ صرف ایک سیاسی معاملہ ہے لیکن غور کیجئے اس کے اثرات خالص دینی مذہبی۔ تہذیبی، تمدنی۔ اور سیاسی حیثیت سے کس درجہ دور رس اور خطرناک ہو سکتے ہیں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اپنے آپ کو طاقتور بنانے کے لئے کسی سے ہتھیاروں کی یا کسی اور قسم کی مدد طلب کرنا اسلامی تصور حیات کے بالکل خلاف ہے اسلامی فکر کا پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان خدا سے اپنا تعلق زیادہ سے زیادہ استوار کرتا ہے اور پھر اپنے اوپر اعتماد کر کے خود اپنی دنیا آپ بناتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے الید العلیا خیر من الید السفلی اونچا ہاتھ نیچے ہاتھ سے بہتر ہے اور "السوال ذل" سوال کرنا ذلت کی بات ہے۔ اس بنا پر ایک مسلمان کسی حالت میں بھی کسی شخص یا کسی قوم سے بھیک مانگنے کا ننگ گوارا نہیں کر سکتا۔ عربی کا مقولہ ہے تجوع الحرۃ ولا تاکل بثدیھا ایک شریف عورت بھوکی رہ سکتی ہے لیکن کسی کی آیا نہیں بن سکتی۔ ایک مسلمان اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ زندگی میں سب سے بڑا ہتھیار ایمان باللہ اور اعتماد علی النفس ہے۔ چنانچہ صرف یہی ایک ہتھیار تھا جس کے بل بوتہ پر عرب کے مفلس و بے سروسامان بادیہ نشینوں نے کسی خارجی مدد کے بغیر قیصرو کسریٰ کی حکومتوں کا تختہ الٹ دیا اور ایران و روم کے شاہی محلات پر اپنی سطوت و حکومت کا پرچم لہرایا۔ اسلامی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے۔ ایک جنگ کے موقع پر ایک عیسائی حکومت نے حضرت علیؓ کو فوجی امداد کی پیش کش کی تو اسے کس بری طرح نفرت و حقارت کے ساتھ خلیفہ چہارم نے ٹھکرا دیا۔ پھر اس کے بالمقابل تاریخ اس کی بھی شاہد ہے کہ جب اندلس کے مسلمان بادشاہ چچا بھتیجہ کے خلاف اور بھتیجہ چچا کے خلاف پڑوس کی عیسائی حکومتوں سے فوجی مدد لینے لگے تو ان کا انجام کیا ہوا۔ پہلے عیسائی حکومتوں نے ایک بادشاہ کی مدد کر کے اس کے حریف کو ختم کیا اور جب وہ ختم ہو گیا تو جس کی مدد کی تھی اس کو بھی تنہا اور مدافعت کا ناقابل پر کر ختم کر دیا اور

اس طرح سرے سے اسلامی حکومت کا نام و نشان ہی مٹا دیا۔

دین اور مذہب کے دائرہ سے ہٹ کر سوچیے تو یوں بھی اگر کوئی قوم عزم صمیم، یقین محکم اور خلوص کے ساتھ کھڑی ہو جائے تو کیا کچھ نہیں کر سکتی۔ ہٹلر نے چند سالوں میں جنگ عظیم اول کی پامال شدہ جرمنی کو فوجی اعتبار سے دنیا کے لئے ایک خطرۂ عظیم بنا دیا۔ اس نے یہ سب کچھ اپنے بل بوتہ پر کیا تھا یا کسی سے طاقت و قوت کی بھیک مانگ کر کیا تھا؟ پھر اس سلسلہ میں خود ہندستان کا جو ذاتی تاریخی تجربہ ہے کیا وہ بھی آنکھ کھولنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ جو لوگ سات سمندر پار سے سوداگر بن کر آئے تھے آخر وہی اس ملک کے حکمراں بن گئے اور یہاں اپنی سلطنت و حکومت کا تخت بچھا کر بیٹھ گئے۔ کل ایک سوداگر ایک حکمراں بن سکتا تھا تو کون کہہ سکتا ہے کہ آج کا مربی و معلم حربیات مستقبل کا حکمراں نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ تہذیبی اور تمدنی نقطۂ نظر سے دیکھئے! آج کل کا یہ عام مشاہدہ ہے اور عرب ممالک خاص طور پر اس کے شاہد ہیں کہ جہاں یہ مدد پہنچتی ہے وہاں کا قومی تمدن اور کلچر غائب ہو جاتا ہے اور مدد دینے والی قوم کی تہذیب ہی پھلتی پھولتی اور فروغ پاتی ہے۔ مدد لینے والے میں طبعی طور پر احساسِ کمتری پیدا ہوتا ہے اور وہ کچھ شعوری اور کچھ غیر شعوری طور پر مدد کرنے والے کے رنگ میں جذب ہوتا چلا جاتا ہے اور اسی کی خو، بو اختیار کر لیتا ہے اس بنا پر فوجی امداد کا معاملہ خالص کوئی سیاسی معاملہ نہیں ہے بلکہ دین و مذہب، تہذیب و تمدن، اور قومی روایات و کلچر کے نقطۂ نظر سے بھی ایک نہایت اہم اور لائقِ غور و خوض معاملہ ہے اور نہایت افسوس اس کا ہے کہ یہ دستِ سوال اس ملک کی طرف سے دراز ہوا ہے جس کی فضا میں:

ترانا داں امید غمگساریہا ز افرنگست

دلِ شاہیں نہ لرزد بہر آں مرغے کہ در چنگست

کی صدائے تہدید و تنبیہ اب بھی گونجتی ہوئی سنی جا سکتی ہے۔

پھر غالباً اربابِ بست و کشاد نے اس حقیقت پر بھی توجہ نہیں کی کہ دنیا کی ایک نہایت عظیم الشان اور بے حد ترقی یافتہ قوم کے افراد جب اس ملک میں غایت درجہ احساسِ برتری کے ساتھ آئیں گے اور ان کے سامنے زانوے تلمذ تہ کرنے کی وجہ سے خود یہاں کے لوگوں میں جو احساس کمتری و فردمانگی پیدا ہو گا تو ان دونوں کے ٹکراؤ سے ملک کے خود اندرونی حالات کتنے خطرناک اور تباہ کن ہو سکتے ہیں۔ یہ نفسیاتی تصادم ایک بہت بڑے انقلاب کا پیش خیمہ بھی بن سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ امداد اس بات کی علامت ہے کہ امریکہ سے

لے کر لاہور تک سب ملک ایک رشتۂ اتحاد سے منسلک و مربوط ہو جائیں گے۔ جی ہاں! ضرور ہو جائیں گے مگر ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ ایک فیاض و سخی انسان وسیع دسترخوان بچھا کر شہر کے غریبوں کو ایک جگہ جمع کر دیتا اور ان کو ایک ہی رشتہ سے وابستہ کر دیتا ہے۔ یہ سب غریب خواہ کچھ کہیں لیکن ایک غیرت مند انسان ہرگز اتحاد پر ان کو مبارک باد نہیں دے سکتا۔ بلکہ اس کے برخلاف وہ تو یہ کہے گا۔

لحا اللہ صعلوکا اذا جنّ لیلہٗ — عصافی المشاش آلفا کل مجزری

یعد الغنیٰ من نفسہٖ کل لیلۃ — اصاب قراھا من صدیق میسّر

اس فقیر پر خدا کی لعنت جو رات کے وقت ہر ہر مذبح خانے میں جا کر وہاں کی ہڈیوں کو چوڑتا ہے اور جس کا حال یہ ہے کہ اگر کسی رات اس کے مالدار دوست کے ہاں اس کی دعوت ہوتی ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ میں مالدار ہو گیا۔

لیکن آہ! کس سے کہیں اور کیوں کر کہیں کہ کسی ایک ملک کی تخصیص نہیں۔ یہ ہمہ رنگ زمین دام پورے عالم اسلام میں پھیلا ہوا ہے۔ کوئی اس میں آج پھنسا اور کوئی کل گرفتار ہوا۔ اقتصادی زبوں حالی۔ معاشی پستی سیاسی انتشار و ضعف۔ ذاتی اغراض و مقاصد جو عالم اسلام کے ہر گوشہ میں کارفرما ہے اس کی وجہ سے اس دام سے نکلنا آسان نہیں ہے۔ اگر کوئی اس سے بچ سکتا ہے تو صرف وہی ایک مرد مومن جس کو شہ عرب و عجم کی طرف سے گدا ہونے کے باوجود دماغِ سکندری ملا ہوا ور ظاہر ہے کہ اب ایسے گدا کہاں اور کتنے ہیں۔ صد حیف کہ پوری دنیائے اسلام ایک نہایت شدید خطرہ کو لبیک کہنے کے لئے تیار کھڑی ہے اور کوئی موثر آواز نہیں جو للکار کر اُس سے پوچھے

"فاین تذھبون"

"قرون وسطیٰ کے بعض تاریخی واقعات کو مسخ کرنے والی ایک کتاب"

پرتھوی راج راسو

از

جناب قاضی محمد شبیر الدین صاحب پنڈت ایم اے (علیگ)
(وائس پرنسپل اسلامیہ ہائر سیکنڈری سکول ضلع جھابوا)

پرتھوی راج راسو ۲ ۱/۲ ہزار صفحات کی ایک ضخیم رزمیہ نظم ہے جو ۱۰۰۵۰۰ اشلوکوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں ۶۹ سمئے یا ابواب ہیں۔ اسی کی روایات پر یقین کر کے اب تک مورخین اس عہد کے واقعات کو مستند مانتے رہے لیکن عصر حاضر کی تحقیقات راسو کی روایات کو فرضی و جعلی تصور کرتی ہیں۔ چند بردائی راسو کے مطابق لاہور میں پیدا ہوا۔ یہ بھاٹ ذات کا جگات نامی قبیلہ کا ایک فرد تھا۔

رائے بہادر ڈاکٹر شیام سندر داس جی کا کہنا یہ ہے کہ راجہ پرتھوی راج کے دربار میں چند کوی نام کا کوئی شاعر تھا تو ضرور اور اس نے راسو بھی لکھا لیکن اب وہ اپنی اصلی حالت پر نہیں ہے اس میں بہت سے رد و بدل ہوئے اور آخر میں رانا پرتاپ سنگھ کے لڑکے امر سنگھ کے حکم سے ان سب کو یک جا کر دیا گیا۔ اس وقت "منیہ سنگھ" نامی کوی نے اپنی طرف سے اس میں بہت سی فرضی داستانیں اضافہ کر دیں۔ اس کی تائید مہا مہوپادھیائے پنڈت ہر پرشاد شاستری بھی کرتے ہیں۔ پنڈت جی موصوف نے ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۳ء تک بغرض تحقیق راجپوتانہ کے تین چکر لگائے۔ وہ ناگور جا کر چند کوی نسل کے ایک نامی گرامی بھاٹ نانو رام سے ملے۔ ناگور چند کوی کو بطور جاگیر دیا گیا تھا وہاں اس کے خاندان کے لوگ اب تک موجود ہیں۔ نانو رام نے پنڈت جی موصوف کو بتایا کہ چند بردائی نے

صرف تین چار ہزار اشلوک لکھے تھے۔ اس کے بعد اس کے لڑکے جلن چند نے آخری دس باب لکھ کر راسو کو ختم کر دیا تھا۔ بعد کے لوگوں نے اس میں اضافے کئے۔ اکبر نے راسو کو سنا تھا اور اس کی ہمت افزائی سے اس زمانہ میں بہت سے راسو لکھے گئے۔ نانو رام کا دعویٰ ہے کہ اس کے پاس اصلی راسو کی نقل موجود ہے لیکن پنڈت جی موصوف اس سے ہو بہو جس کی جو نقل ہمراہ لائے تھے وہ بالکل اوٹ پٹانگ اور ردی نکلی۔

مہامہوپادھیائے پنڈت گوری شنکر ہیرا چند اوجھا راسو کو سترھویں صدی کا ایک نہایت لغو اور جعلی دستاویز قرار دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ "اس میں چوہانوں، چالوکیوں، پرتہار اور پرماروں کی پیدائش چوہانوں کی بنشاولی (شجرہ)، پرتھوی راج کی ماں، بہن، لڑکے، رانیاں نیز بہت سے واقعات اور اُن کے سنین سب کے سب غلط اور فرضی ہیں۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ تصنیف پرانی نہیں ہے۔" آگے لکھتے ہیں کہ "بعض لوگ یہ کہہ کر مغالطہ میں ڈالتے ہیں کہ راسو میں بعد کو اضافے ہوتے رہے ورنہ پہلے یہ بھاری بھرکم کتاب نہیں تھی حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب ایک ہی وقت میں ترتیب دی گئی ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ راجہ کردلی کے درباری شاعر پنڈت جدو ناتھ جو چند کوی کی نسل سے ہیں اس میں ۱۰۰۵۰۰ اشلوکوں کا ہونا شروع ہی سے تسلیم کرتے ہیں۔"

بہرحال چند کوی نے جو کچھ لکھا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ "چوہان راجپوت آبو پہاڑ پر کئے گئے یگیہ کی وجہ سے آگ سے پیدا ہوئے، راجہ پرتھوی راج اجمیر کے راجہ سومیسور کے لڑکے اور انوجی کے پوتے تھے۔ سومیسور کو دہلی کے راجہ اننگ پال کی لڑکی کملا منسوب تھی اسی سے پرتھوی راج نے جنم لیا۔ اننگ پال کی دوسری لڑکی سندری قنوج کے راجہ جے چند کے والد وجے پال کو منسوب تھی۔ اننگ پال نے اپنے نواسے پرتھوی راج کو اپنا متبنیٰ کیا۔ جے چند اور پرتھوی راج میں کشیدگی اسی وجہ سے پیدا ہوئی بعد کو راج سوئیہ یگیہ اور سنجوگتا کے سوئمبر کی وجہ سے دشمنی میں اضافہ ہو گیا۔ پرتھوی راج اور محمد غوری میں گیارہ لڑائیاں ہوئیں۔ محمد غوری کو دو مرتبہ گرفتار کر کے چھوڑ دیا گیا۔ آخر میں محمد غوری کو قنوج و گجرات کے راجاؤں نے پرتھوی راج پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ محمد غوری

پرتھوی راج کو گرفتار کر کے غزنی لے گیا اور وہاں لے جا کر قید کر دیا۔ چند بردائی بھیس بدل کر غزنی پہونچا اور پرتھوی راج سے ملاقات کی۔ آخر میں پرتھوی راج کے تیر سے محمد غوری مارا گیا اور پھر دونوں ایک دوسرے کو مار کر مر گئے“۔ درمیان میں جگہ جگہ اور بھی بہت سی فرضی داستانیں ہیں۔ محمد غوری اور پرتھوی راج میں دشمنی کا اصل سبب یہ بتایا ہے کہ محمد غوری کے دربار میں حسین شاہ نام کا ایک سردار تھا اس کی بیوی ”چترریکھا“ نہایت حسین تھی جس کو محمد غوری اپنے عقد میں لینا چاہتا تھا اس پر یہ دونوں غزنی سے بھاگ کر پرتھوی راج کی شرن (پناہ) میں آ گئے۔ محمد غوری نے ان دونوں کی واپسی کا مطالبہ کیا لیکن پرتھوی راج نے پناہ گزیں کو واپس کر دینا اپنی توہین سمجھا وغیرہ وغیرہ

اب آیئے ذرا اس کے واقعات پر ایک تحقیقی نظر ڈالیں۔

راسو پر تحقیقی نظر

ڈاکٹر بولر نے سنسکرت کی کتابوں کی تلاش میں کشمیر کا سفر کیا تھا وہاں انھیں سنسکرت کی ایک کتاب ہاتھ لگی۔ کتاب کا نام ”پرتھوی راج وجے“ ہے جس کو جیانک کوی نے تصنیف کیا ہے۔ اس کتاب پر کلہن کی راج ترنگنی کے مفسر جون راج المتوفی سنہ ۱۴۲۳ء سمبت کے حواشی درج ہیں۔ پرتھوی راج وجے میں جو کچھ لکھا ہے وہ چند بردائی کے راسو کے بالکل خلاف ہے۔

(۱) اس کے لکھے ہوئے واقعات کی تصدیق ان تمام کتبہ جات سے ہوتی ہے جو ۱۰۳۰ سے ۱۲۲۶ سمبت بکرمی تک پائے گئے۔ اس کتاب میں جو شجرے درج ہیں ان کی صحت مالوہ اور گجرات کے کتبہ جات سے ہوتی ہے۔

(۲) پرتھوی راج وجے کے مطابق سومیسور کا بیاہ چیدی کے راجہ اچل راج عرف تیجل کی لڑکی ”کرپوردیوی“ سے ہوا تھا اس کی تصدیق ہانسی میں پائے گئے ایک کتبہ سے نیز ”ہمیر مہاکاویہ“ اور ”سرجن چرتر“ سے ہوتی ہے۔ ہمیر مہاکاویہ کو نین چندر نے پندرھویں صدی بکرمی میں ترتیب دیا۔ سرجن چرتر میں بوندی کے راجہ سرجن سین کے سوانح حیات درج ہیں یہ سترھویں صدی بکرمی میں لکھی گئی۔

صرف تین چار ہزار اشلوک لکھے تھے۔ اس کے بعد اس کے لڑکے جَل چند نے آخری دس باب لکھ کر راسو کو ختم کر دیا تھا۔ بعد کے لوگوں نے اس میں اضافے کئے۔ اکبر نے راسو کو سنا تھا اور اس کی ہمت افزائی سے اس زمانہ میں بہت سے راسو لکھے گئے۔ نانو رام کا دعویٰ ہے کہ اس کے پاس اصلی راسو کی نقل موجود ہے لیکن پنڈت جی موصوف اس سے جو بستے کی جو نقل ہمراہ لائے تھے وہ بالکل اوٹ پٹانگ اور ردی نکلی۔

مہامہوپادھیائے پنڈت گوری شنکر ہیرا چند اوجھا راسو کو سترھویں صدی کا ایک نہایت لغو اور جعلی دستاویز قرار دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ "اس میں چوہانوں، چالوکیوں، پرتہار اور پرماروں کی پیدائش چوہانوں کی بنشاولی (شجرہ)، پرتھوی راج کی ماں، بہن، لڑکے، رانیاں نیز بہت سے واقعات اور اُن کے سنین سب کے سب غلط اور فرضی ہیں۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ تصنیف پرانی نہیں ہے۔" آگے لکھتے ہیں کہ "بعض لوگ یہ کہہ کر مغالطہ میں ڈالتے ہیں کہ راسو میں بعد کو اضافے ہوتے رہے ورنہ پہلے یہ بھاری بھرکم کتاب نہیں تھی حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب ایک ہی وقت میں ترتیب دی گئی ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ راجہ کرولی کے درباری شاعر پنڈت جدو ناتھ جو چند کوی کی نسل سے ہیں اس میں ...۱۰۰۰۵ اشلوکوں کا ہونا شروع ہی سے تسلیم کرتے ہیں۔"

بہر حال چند کوی نے جو کچھ لکھا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ "چوہان راجپوت آبو پہاڑ پر کئے گئے، یگیہ کی وجہ سے آگ سے پیدا ہوئے، راجہ پرتھوی راج اجمیر کے راجہ سومیسور کے لڑکے اور انوجی کے پوتے تھے۔ سومیسور کو دہلی کے راجہ اننگ پال کی لڑکی کملا منسوب تھی اسی سے پرتھوی راج نے جنم لیا۔ اننگ پال کی دوسری لڑکی سندری قنوج کے راجہ جے چند کے والد وجے پال کو منسوب تھی۔ اننگ پال نے اپنے نواسے پرتھوی راج کو اپنا متبنیٰ کیا۔ جے چند اور پرتھوی راج میں کشیدگی اسی وجہ سے پیدا ہوئی بعد کو راج سوئے یگیہ اور سنجوگتا کے سویمبر کی وجہ سے دشمنی میں اضافہ ہو گیا۔ پرتھوی راج اور محمد غوری میں گیارہ لڑائیاں ہوئیں۔ محمد غوری کو دو مرتبہ گرفتار کر کے چھوڑ دیا گیا۔ آخر میں محمد غوری کو قنوج و گجرات کے راجاؤں نے پرتھوی راج پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ محمد غوری

پرتھوی راج کو گرفتار کر کے غزنی لے گیا اور وہاں لے جا کر قید کر دیا۔ چندبردائی بھیس بدل کر غزنی پہونچا اور پرتھوی راج سے ملاقات کی۔ آخر میں پرتھوی راج کے تیر سے محمد غوری مارا گیا اور پھر دونوں ایک دوسرے کو مار کر مر گئے۔" درمیان میں جگہ جگہ اور بھی بہت سی فرضی داستانیں ہیں۔ محمد غوری اور پرتھوی راج میں دشمنی کا اصل سبب یہ بتایا ہے کہ محمد غوری کے دربار میں حسین شاہ نام کا ایک سردار تھا اس کی بیوی "چتر ریکھا" نہایت حسین تھی جس کو محمد غوری اپنے عقد میں لینا چاہتا تھا اس پر یہ دونوں غزنی سے بھاگ کر پرتھوی راج کی شرن (پناہ) میں آگئے۔ محمد غوری نے ان دونوں کی واپسی کا مطالبہ کیا لیکن پرتھوی راج نے پناہ گزیں کو واپس کر دینا اپنی توہین سمجھا وغیرہ وغیرہ

اب آیئے ذرا اس کے واقعات پر ایک تحقیقی نظر ڈالیں۔

راسو پر تحقیقی نظر ڈاکٹر بولر نے سنسکرت کی کتابوں کی تلاش میں کشمیر کا سفر کیا تھا وہاں انھیں سنسکرت کی ایک کتاب ہاتھ لگی۔ کتاب کا نام "پرتھوی راج وجے" ہے جس کو جیانک کوی نے تصنیف کیا ہے۔ اس کتاب پر کلہن کی راج ترنگنی کے مفسر جون راج المتوفی سنہ ۱۵۴۳ھ سمبت کے حواشی درج ہیں۔ پرتھوی راج وجے میں جو کچھ لکھا ہے وہ چندبردائی کے راسو کے بالکل خلاف ہے۔

(۱) اس کے لکھے ہوئے واقعات کی تصدیق ان تمام کتبہ جات سے ہوتی ہے جو ۱۰۳۰ سے ۱۲۲۶ سمبت بکرمی تک پائے گئے۔ اس کتاب میں جو شجرے درج ہیں اُن کی صحت مالوہ اور گجرات کے کتبہ جات سے ہوتی ہے۔

(۲) پرتھوی راج وجے کے مطابق سومیسور کا بیاہ چیدی کے راجہ اچل راج عرف تیجل کی لڑکی "کرپور دیوی" سے ہوا تھا اس کی تصدیق ہانسی میں پائے گئے ایک کتبہ سے نیز "ہمیر مہا کادیہ" اور "سرجن چرتر" سے ہوتی ہے۔ ہمیر مہا کادیہ کو نین چندر نے پندرھویں صدی بکرمی میں ترتیب دیا۔ سرجن چرتر میں بوندی کے راجہ سرجن سین کے سوانح حیات درج ہیں۔ وہ سترھویں صدی بکرمی میں لکھی گئی۔

(۳) پرتھوی راج دجے میں راجہ سومیسور کے صرف دو لڑکوں کے نام آئے ہیں ایک ہرراج اور دوسرا پرتھوی راج۔ پرتھوی راج گدی کا مالک ہوا لیکن چونکہ وہ نابالغ تھا اس لئے اس کی ماں کرپور دیوی "کادمب بام" وزیر کی مدد سے ریاست کا کام ایک عرصہ تک چلاتی رہی۔ اس کتاب میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ اننگ پال نے پرتھوی راج کو گود لیا یا پرتھوی راج کا سنجوگتا سے بیاہ ہوا۔

(۴) ۱۲۲۶ سمبت کے بجولیا (واقع راجپوتانہ) والے کتبہ سے ثابت ہوتا ہے کہ سومیسور کے بڑے بھائی بیلدیو یا دگرہ راج چہارم نے دلی اور ہانسی کو بزورِ شمشیر فتح کر کے اجمیر میں ملا لیا۔ طبقاتِ اکبری سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ فارسی مورخوں نے پرتھوی راج کو اجمیر کا راجہ مانا ہے۔ دلی کا راجہ پرتھوی راج کا لڑکا گووند راج تھا اور ترائن کی پہلی لڑائی میں محمد غوری اسی کے بھالے سے زخمی ہوا تھا۔

راسو کے بموجب راجپوتوں کے ۳۶ خاندان ہیں جن میں سے چالوکیہ (سولنکی)، چوہان، پرتھار اور پرمار اگنی کنڈ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس روایت کے بخلاف چالوکیوں کا "اگنی کل" کے بجائے چندر بنشی ہونا ثابت ہوتا ہے اس کی تصدیق تیرھویں صدی بکرمی کے ایک فرمان سے ہوتی ہے جو کسی چالوکیہ (سولنکی) راجہ کا ہے۔ اجمیر میں "ڈھائی دن کے جھونپڑے" کی ایک تحریر سے، ہمیر مہا کاویہ سے نیز پرتھوی راج وجے ناٹک سے چوہانوں کا سورج بنشی ہونا مسلّم ہے۔ پرتھار اپنے کو رگھو بنشی بتاتے ہیں صرف پرمار اپنا نکاس اگنی کنڈ سے سمجھتے ہیں۔

(۶) اسی طرح ۳۶ خاندانوں کا لقب "راجپوت" بھی محل نظر ہے کیوں کہ ادبی و تاریخی روایات کی بنا پر یہ لقب مہارانا "کمبھا" کے زمانہ سے یعنی پندرھویں صدی سے شروع ہوتا ہے ورنہ اس سے پیشتر راجپوتوں کو ٹھاکر، راول، رائے ورانا وغیرہ ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔

(۷) راسو کی بدولت اردو و ہندی کے تذکرہ نگار بھی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ انھوں نے اس کتاب کو بارھویں صدی عیسوی کا سمجھ کر زبان کے ارتقائی منازل کو سمجھنے کی کوشش کی۔ راسو میں ۱۰ فیصدی فارسی الفاظ کا ذخیرہ ہے جب کہ اس عہد کی دوسری کتابیں اس تناسب کی حامل نہیں مثال کے طور پر ہیم چندر (۱۱۵۰ تا ۱۲۳۰ سمبت بکرمی)، سوم پربھ سوری (۱۲۴۱ سمبت)

ودیا دھر (۱۲۵۰ سمبت) رتن پت نالھ کوی (۱۲۱۲ سمبت) ، مدھوکر کوی (۱۲۲۴ تا ۱۲۴۳ سمبت) کے کلام کو دیکھئے اور اس کا مقابلہ راسو کی زبان سے کیجئے زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ مختصر یہ کہ بارہویں صدی سے پندرہویں صدی بکرمی تک زبان کے جو نمونے دوسری کتابوں میں ملتے ہیں اُن سے مقابلہ کرنے پر راسو کی زبان سولہویں صدی بکرمی کی ثابت ہوتی ہے۔

(۴) اگر چند بردائی نام کے کسی شاعر نے "پرتھوی راج راسو" کو رائے پتھورا کے زمانہ میں لکھا ہوتا تو درج ذیل تاریخی واقعات کی غلطیاں اس سے ہرگز سرزد نہ ہوتیں مثلاً

(الف) راسو کے ۲۱ ویں باب کے مطابق پرتھوی راج کی بہن پرتھا (پرتھوی بائی) کا بیاہ راناسمر سنگھ کے ساتھ ہوا تھا جو دوسری لڑائی میں محمد غوری کے ہاتھ سے مارا گیا۔ یہ روایت سر تاسر غلط ہے کیوں کہ پرتھوی راج کی موت ۱۲۴۸ سمبت بکرمی میں ہوئی اس وقت سمر سنگھ کا دادا جلیتر سنگھ اور باپ تیج سنگھ دونوں بقید حیات تھے۔ جلیتر سنگھ کا ۱۳۰۹ سمبت اور تیج سنگھ کا ۱۳۲۴ سمبت تک زندہ رہنا ثابت ہے۔ سمر سنگھ کے عہد کے آٹھ سنگین کتبہ جات میں سے ایک ۱۳۳۰ سمبت اور دوسرا ۱۳۵۸ سمبت کا ہے ان کی رو سے پرتھوی راج کی موت کے ۱۰۹ برس بعد سمر سنگھ کا زمانہ ہے اس صورت میں اس کی شادی پرتھا سے کیوں کر ہو سکتی تھی۔

(ب) راسو کے مطابق گجرات کے راجہ بھیم نے پرتھوی راج کے والد سومیسور کو قتل کیا جس کا بدلہ پرتھوی راج نے راجہ بھیم کو مار کر لیا۔ لیکن اصل واقعہ یہ ہے کہ راجہ بھیم ۱۲۳۵ سمبت بکرمی میں گدی پر بیٹھا اس وقت وہ صغیر سن تھا۔ سومیسور کی موت ۱۲۳۶ سمبت میں ہوئی اس صورت میں وہ سومیسور کو کیسے قتل کر سکتا تھا۔ راجہ بھیم کے عہد کے کتبہ جات ۱۲۶۵ تا ۱۲۹۶ سمبت بکرمی دستیاب ہو چکے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ پرتھوی راج کے ۵۰ سال بعد تک زندہ رہا۔ پھر پرتھوی راج نے اس کو کیسے مارا۔

(ج) راسو کے اندر سب سے زیادہ عجیب بات محمد غوری کی گرفتاری اور رہائی ہے۔ محمد غوری کو آبو کے پرمار راجہ سلکھ نامی نے ۱۱۳۶ سمبت میں گرفتار کر لیا حالانکہ اس وقت محمد غوری پیدا بھی

نہیں ہوا تھا۔ وہ ۱۲۳۰ء سمبت میں غزنی کا حاکم بنایا گیا۔ اس کے علاوہ آبو کی تاریخ میں سلکھ نام کا کوئی راجہ کسی زمانہ میں نہیں ہوا۔

(د) راسو کی روایت کے بموجب پرتھوی راج نے گیارہ برس کی عمر سے لے کر ۳۶ برس کی عمر تک چودہ شادیاں کیں۔ ان شادیوں کی حقیقت بھی شیخ چلی کی کہانیوں سے زائد نہیں۔ اس کا پہلا بیاہ منڈاور کے پرتھار راجہ ناہر رائے کی لڑکی سے ہونا بتایا گیا ہے۔ اس خاندان کے شجرۂ نسب کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ناہر رائے کا دورِ حکومت ۸۳۷ء سے پہلے تھا اور اس خاندان کا اقتدار بارہویں صدی سے بہت پہلے ختم ہو چکا تھا۔

پرتھوی راج کا دوسرا بیاہ ۱۳ سال کی عمر میں آبو کے راجہ جبنیت کی بہن "اچھنی" سے ہوا تھا حالانکہ آبو کی تاریخ میں نہ تو راجہ جبنیت ہی کا پتہ چلتا ہے اور نہ اس کے خاندان کا۔

(ہ) اسی ۱۱۳۹ انند سمبت مطابق ۱۲۳۰ بکرمی سمبت میں پرتھوی راج کا سمندر شکھر کے یادو راجہ وجے پال کی لڑکی پدماوت سے شادی کرنا یا جے چندر والیٔ قنوج کے اشومیدھ یگیہ کی کہانی یا سنجوگتا کا سوئمبر یہ سب باتیں تاریخی حقیقت کے خلاف ہیں سمبت ۱۲۴۰ء میں گوالیار کے تومر راجہ بیرم دیو کے درباری شاعر "نین چندر یا نے چند" نے ہمیر مہا کاویہ میں پرتھوی راج کی اور "رمبھا منجری" میں جے چندر کی بڑی تعریف کی ہے لیکن دونوں کتابوں میں سے کسی میں بھی پرتھوی راج اور جے چندر کی آپس کی کشمکش کا نہ کہیں ذکر ہے اور نہ اشومیدھ یگیہ اور سنجوگتا کے سوئمبر کا کہیں حال لکھا ہے۔ "پرتھوی راج وجے" اور "پربندھ کوش" بھی جے چندر اور پرتھوی راج کے دشمنی کے واقعات تیز سوئمبر کے ذکر سے خالی ہیں۔

(و) راسو کی مذکورہ بالا بے سروپا باتوں کے علاوہ دو باتیں سب سے زیادہ مزے دار ہیں جو آٹھویں اور پندرھویں باب میں ملتی ہیں۔ ان میں سے پہلی یہ ہے کہ راول سمر سنگھ کا بڑا بیٹا کمبھا باپ سے ناراض ہو کر سلطان بیدر کے پاس چلا گیا۔ دوسری یہ کہ راجہ پرتھوی راج کے باپ سومیشور اور خود پرتھوی راج نے مغلوں سے جنگ کی۔ جس میں مغل نامی سردار گرفتار

کر لیا گیا اور اس کا بیٹا بازید خاں مارا گیا۔ یا جس وقت پرتھوی راج انجھنی کو بیاہ کر مع جہیز اجمیر کو لوٹ رہا تھا تو راستہ میں میواڑ کے مغلوں سے اس کی جنگ ہوئی ظاہر ہے کہ بیدر کی سلطنت ۱۳۴۷ء میں قایم ہوئی اور مغلوں کا نام تو شاید اس زمانہ میں کسی نے سنا بھی نہ تھا۔

دسنا ۶ غرض کہ راسو میں نہ تو واقعات ہی تاریخی معیار پر صحیح اترتے ہیں اور نہ اُن کے سنین چندبردائی نے پرتھوی راج کی پیدائش ۱۱۱۵ سمبت، متبنیٰ کئے جانے کی تاریخ ۱۱۲۲ سمبت سنجوگتا کو قنوج سے لانے کا سنہ ۱۱۵۱ سمبت اور محمد غوری سے پہلی لڑائی ۱۱۵۸ سمبت میں ہونا بتائی ہے۔ لیکن اب تک جو فرمان یا کتبہ جات ملے ہیں اور جن میں پرتھوی راج، جے چند اور پرمرد دیو یعنی مہوبہ کے راجہ پرمال کا نام آتا ہے وہ بالترتیب یہ ہیں۔ پرتھوی راج کے ۴ جو ۱۲۲۴ تا ۱۲۴۴ سمبت تک کے ہیں۔ جے چند کے ۱۲ ہیں جو ۱۲۲۴ سے ۱۲۴۳ سمبت کے اور پرمردِ دیو کے ۶ ہیں جو ۱۲۲۳ سے ۱۲۵۸ سمبت تک کے ہیں۔ ان میں سے ایک کتبہ ۱۲۳۹ سمبت کا ہے جس میں پرتھوی راج اور راجہ پرمرد دیو کی لڑائی کا ذکر ہے۔ اِن فرامین و کتبہ جات کے سمبت فارسی مورخین کی دی ہوئی تاریخوں سے ملتے جلتے ہیں مثلاً فارسی مورخین نے محمد غوری اور پرتھوی راج کی پہلی لڑائی کا ہونا ۵۸۷ ہجری یعنی ۱۲۴۸ سمبت مطابق ۱۱۹۱ عیسوی میں بتایا ہے اس لئے مذکورہ بالا کتبہ جات وغیرہ کے سمبتوں کی صحت میں کسی شک و شبہ کی گنجایش نہیں پھر بھی راسو کے دیئے ہوئے سمبتوں کو صحیح ثابت کرنے کے لئے پنڈت موہن لال وشنو لال پانڈیہ اور رائے بہادر پنڈت شیام سندر داس نے ناکام کوشش کی ہے۔ انھوں نے راسو کے سنین کو بکرمی سمبت کے بجائے انند سمبت مانا اور اس طرح ۹۱ سال کے فرق سے فائدہ اٹھانا چاہا لیکن وہ اپنے مفروضہ میں ناکام رہے۔ مثال کے طور پر ایک تاریخی واقعہ کو لیجئے۔ راسو کے مطابق پرتھوی راج کی پیدائش ۱۱۱۵ سمبت میں ہوئی۔ اس کو ذرا دیر کے لئے انند سمبت مان لیجئے۔ اس کو بکرمی سمبت بنانے کے لئے ۹۱ سال اس میں اور جوڑ دیجئے تو ۱۲۰۶ بکرمی سمبت بنا لیکن یہ وہ سنہ ہے جب کہ پرتھوی راج کے والد ابھی صغیر سن تھے اس طرح اُن کی شادی یا پرتھوی راج کی پیدائش

ابھی بہت دور کی بات تھی۔

ہم مانتے ہیں کہ پرتھوی راج راسو ایک علمی و ادبی کتاب ہے نہ کہ تاریخی۔ لیکن ادبی کتابوں میں بھی تو صحیح واقعات اور اُن کی سنین میں رد و بدل بغیر کسی مقصد کے نہیں کیا جاتا جیانک کوی کی "پرتھوی راج وجے" نامی کتاب بھی تو ایک علمی و ادبی کتاب ہے پھر اس میں تاریخی واقعات اور اُن کے سنین صحیح صحیح کیوں درج کئے گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ راسو نامی کتاب راجہ پرتھوی راج کے کسی ہم عصر کوی کی تصنیف نہیں ہے ورنہ اس کے تحریر کردہ واقعات اور اُن کے سنین میں کچھ تو صحت و مطابقت ہوتی۔ پرتھوی راج وجے کے مصنف جیانک نے راجہ پرتھوی راج کے درباری شاعر کا نام "پرتھوی بھٹ" بتایا ہے۔ چند کا کہیں نام تک نہیں لیا۔ البتہ پانچویں باب میں ایک اشلوک آتا ہے ؎

तनयश्चन्द्र राजस्य चंद्र राज इवाभवत्।   संग्रहं यस्य वृत्तानां सुवृत्तानामिव व्यधात्॥

اس اشلوک کی بنا پر رائے بہادر شری یُت پنڈت گوری شنکر ہیرا چند اوجھا کا یہ خیال ہے کہ بجائے چند بردائی کے "چندرک" نام کا کوئی کوی راجہ پرتھوی راج کے دربار میں نہیں رہا اور اگر رہا ہے تو جیانک کوی کے کشمیر لوٹ جانے کے بعد آیا ہوگا۔ بہر حال ظن غالب یہ ہے کہ چند بردائی راجہ پرتھوی راج کا ہم عصر کوی نہیں ہے۔ بعد میں کسی دوسرے کوی نے جو راجہ پرتھوی راج کے بھائی ہر راج یا اُس کے لڑکے گوبند راج کے خاندان میں کبھی رہا ہے اُن کے مورث اعلیٰ راجہ پرتھوی راج کی بہادری کے من گھڑت قصے لکھ کر راسو کی پُر فریب عالی شان عمارت تیار کر دی۔ واللہ اعلم بالصواب

ماخذ

(۱) پرتھوی راج وجے مہاکاویہ از جیانک کشمیری

(۲) ہمیر مہاکاویہ از نے چندر سور

(۳) ہمیر چھاکا دیہ مؤلفہ پنڈت نیلکنٹھ خبار وں ۱۸۹۶ء

(۴) ہمیر راسو مؤلفہ رائے بہادر ڈاکٹر شیام سندر داس

(۵) رمبھا منجری از نے چندر سور

(۶) پربندھ کوش و پربندھ چنتامن از میر و تنگ

(۷) پرتھوی راج راسو مؤلفہ ہری ہر ناتھ ٹنڈن ایم۔اے

(۸) بیلدیو راسو مؤلفہ ستیہ جیون ورما ایم۔اے

(۹) ہندی ساہتیہ کا اتہاس از پنڈت رام چندر شکل

(۱۰) بھاشا اور ساہتیہ از رائے بہادر ڈاکٹر شیام سندر داس

(۱۱) تاریخ ہند جلد اول از جے چندر ودیا النکار الہ آباد

تاریخی حقایق

بعض شاہانِ ہند کے حالات

از

مولانا محمد ظفیر الدین صاحب استاذ دار العلوم معینیہ سانحہ (مونگیر)

(۲)

سلطان شہاب الدین غوری کے متعلق مورخین نے لکھا ہے کہ اس کو علماء سے بڑی عقیدت تھی اور دین سے گہرا تعلق تھا، امام فخر الدین رازی کے متعلق بیان ہے کہ یہ محل شاہی میں تشریف لاتے اور وعظ فرماتے چنانچہ ایک دفعہ آپ نے سلطان کو دورانِ وعظ میں خطاب کرکے فرمایا

"اے بادشاہ! نہ تیری یہ حکومت باقی رہے گی، اور نہ رازی کی یہ تلبیس رہے گی، اور ہم سب کو اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لوٹنا ہے، سلطان پر ان فقروں کا یہ اثر ہوا، کہ بے ساختہ رونے لگا، اور آنسا روئے کہ دیکھنے والوں کو رحم آتا تھا" [1]

جس سلطان کا دل خشیتِ الٰہی سے اس قدر معمور ہو، بھلا بتلایا جائے کہ وہ اپنی پبلک اور ملک کے حق میں کتنا اچھا بادشاہ ہوگا، اور اس کا اثر پورے ملک پر کیسا خوشگوار پڑتا ہوگا، ہمارے اس زمانہ کے معمولی مالدار کبر و نخوت سے سر ٹیڑھا کرکے چلتے ہیں، اور ان کے سامنے خدا کا نام لیا جائے، تو غصہ سے ان کی رگیں پھولنے لگتی ہیں،

سلطان غوری کے جسمانی اولاد میں صرف ایک لڑکی تھی، کوئی لڑکا نہ تھا، مگر اس کے شوق کا عالم یہ تھا

---

[1] مسلمانوں کا عروج و زوال ص۲۲

"غلام خریدتا، اور خاص طور پر ان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرتا تھا، اس سلسلہ میں اس کے چالیس غلام ایسے تھے، جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بہترین تربیت سے بہرہ مند تھے سلطان انھی کو اپنی جسمانی یادگار سمجھتا تھا"[۱]

سلطان مکارم اخلاق کا پیکر کہا جا سکتا ہے؛ اس نے ایسا کام کیا جو کام تاریخ میں اس سے پہلے شاید ہی کسی نے کیا ہو۔

سلطان شمس الدین التمش میں بہت خوبیوں کے ساتھ ایک بڑی خوبی یہ تھی، کہ وہ وعظ سننے کا بڑا مشتاق تھا اور ہفتہ میں ایک دن ایسی مجلس منعقد کرتا، جس میں لوگوں کو اس کی ذات پر تنقید کی پوری آزادی ہوتی،

"سیر العارفین کی روایت ہے کہ جمعہ کی نماز کے بعد سلطان اپنے محل میں ایک اجتماع منعقد کرتا تھا جس میں اکابر و اشراف و مشائخ شریک ہوتے تھے، اس اجتماع میں شرکاء بزم پوری آزادی سے بادشاہ اسلام کے فرائض و واجبات پر اظہار خیال کرتے، اور بادشاہ ان سب کو بڑی توجہ اور دلچسپی سے سنتا تھا"[۲]

فرمایا جائے اب کوئی بادشاہ، امیر اور مالدار اس زحمت کے لئے تیار ہو گا، اپنے اوپر آج کل کوئی بڑا آدمی تنقید پسند کرتا ہے؟ التمش کا یہ طریقہ بہت مناسب اور مفید تھا خود اس کے لئے بھی اور پبلک کے لئے بھی، ہمارے اس زمانہ کے ارباب حکومت کو بھی یہ طریقہ اختیار کرنا چاہئے،

اس سلطان کے بارے میں لکھا ہے کہ ذکرِ الٰہی میں پوری پوری رات بیدار رہتا، برائے نام سوتا تھا، بابا فرید کا بیان ہے،

"اعتقاد کا بڑا مضبوط تھا، رات رات بھر جاگا رہتا، کوئی اسے نیند میں غافل نہیں دیکھ سکتا تھا، جب دیکھئے عالم تحیر میں کھڑا ہے، اگر تھوڑی دیر سوتا تو پھر خود بیدار ہوتا، بستر سے اٹھتا، پانی لیتا اور وضو کر کے مصلیٰ پر کھڑا ہو جاتا، رات میں کسی خدمت گار کو نہیں جگاتا تھا، اور کہتا کہ آرام

---

[۱] مسلمانوں کا عروج و زوال ص۲۲ [۲] ایضاً ص۲۳

کرنے والوں کو کیوں زحمت دوں[1]

اب تو اس زمانہ کے علماء کرام میں بھی یہ اہتمام بہت کم رہ گیا ہے، نوجوان علماء کرام کی حالت اس سلسلہ میں اور بھی ناگفتہ بہ ہے، اور خاندانی پیرادر پیرزادوں کی حالت، الاماں الحفیظ، ان کا ظاہر جتنا اچھا، ان کی پوشاک جتنی زرق برق، عموماً ان کا باطن اسی قدر تاریک، گندہ اور آلائشوں سے معمور ہوتا ہے، ہاں کچھ لوگ ضرور ایسے ہیں جن میں سوز و گداز، اور بے چینی اور تڑپ ہے، ممالکِ اسلامیہ کے اربابِ حکومت کے لئے اس واقعہ میں بڑا مؤثر سبق ہے، کاش وہ اسے غور سے پڑھیں، ہمارے پڑوسی ملک پاکستان کے اربابِ حکومت کو خصوصیت کے ساتھ اس واقعہ سے سبق لینا چاہیئے، جو فرائض تک کو ادا نہیں کرتے،

سلطان التمش کو خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے بڑی عقیدت تھی، اور یہ سب عشقِ الٰہی کا نتیجہ تھا، اس سلسلہ کے ایک واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کو مرنے کے بعد اپنی نجات کی بڑی فکر تھی، قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے،

> "ایک رات سلطان مجھ دعاگو کے پاس آیا، اور آتے ہی مرے پاؤں پکڑ لئے، میں نے کہا، کیا کوئی تکلیف ہے؟ اگر کوئی حاجت ہے تو بیان کیجئے، سلطان نے جواب دیا، حاجت تو اس خدا کے فضل و کرم سے جس نے مجھ کو یہ مملکت اور سلطنت دی ہے، کوئی نہیں ہے، مجھ کو صرف یہ بتا دیجئے، کہ قیامت کے روز مرا حشر کس گروہ کے ساتھ ہوگا؟"[2]

نجات کی فکر بڑی فکر ہے، جس کو آخرت کا اس قدر کھٹکا ہو، اس کے قلب کا حال کیا پوچھنا، اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے التمش واقعی سلطانِ وقت تھا، ایسے ہی سلطان کی دنیا کو ضرورت ہے، جس ملک کے بادشاہ کا یہ حال ہو، کھلی بات ہے، اس ملک پر اپنے بادشاہ کا کچھ نہ کچھ ضرور اثر ہوگا، کیوں کہ مشہور ہے، "الناس علی دین ملوکھم"

خواجہ قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا، اور جنازہ لایا گیا، تو خواجہ ابو سعیدؒ نے کہا

---

[1] مسلمانوں کا عروج و زوال ص۲۳ [2] ایضاً ص۲۳۲

کہ حضرت خواجہ کی وصیت ہے،

"میرے جنازہ کی نماز صرف وہ شخص پڑھائے، جس نے کبھی زنا نہ کیا ہو، اور عصر کی سنتیں اور تکبیر اولی ترک نہ کی ہوں"

اسی مجمع میں سلطان التمش بھی موجود تھا، اب لوگ انتظار میں رہے کہ ایسا شخص مجمع سے نکلے اور نماز جنازہ پڑھائے، سلطان خود بھی اسی انتظار میں رہا، مگر اس میں ناکامیابی ہوئی پھر کیا ہوا؟

"لیکن آخر جب کسی شخص نے نماز جنازہ میں امامت کرنے کی جرأت نہ کی، تو سلطان خود آگے بڑھا اور بولا، میں اپنی نمازوں کی تشہیر اور نمائش پسند نہیں کرتا، لیکن حضرت خواجہ صاحبؒ کی وصیت کی تعمیل بہرحال ضروری ہے، یہ کہہ کر سلطان نے نماز پڑھائی اور جنازہ کو کاندھا دیتا ہوا قبرستان لے گیا"[1]

اس زمانہ میں ایسے سلطان قوم وملک کو کہاں نصیب ہوں گے؟ اب متقی، پرہیزگار اور باخدا سلطان اور وزیر عنقا ہے، ہاں ظالم وجابر، فاسق وفاجر اور گناہ گار کی کمی نہیں ہم تو دن رات سنتے ہیں کہ صوبہ اور مرکز کے فلاں وزیر بدکاری میں مبتلا ہیں، عیاش ہیں، اور اسی عیاشی کی خاطر بڑی بڑی بے انصافیاں کرتے ہیں، تو بتایا جائے جب بڑوں اور حکمرانوں کا یہ حال ہوگا، تو قوم اور ملک کے دوسرے افراد کا کیا کہنا،

ممالکِ اسلامیہ کے صدر اور وزراء کی دینی حالت جیسی کچھ ہے، وہ کسی باخبر سے مخفی نہیں، پتہ نہیں ان حکمرانوں کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہے بھی، یا نہیں۔

سلطان التمش ہی کا واقعہ ہے کہ اس نے لڑکوں کے ہونے کے باوجود صرف اس لئے بیٹی کو ولی عہد بنایا کہ بیٹے حکومت کے اہل نہیں تھے، بیٹی کو جس وقت وہ ولی عہد بنا رہا تھا اس وقت اس سے اس کا سبب دریافت کیا تو اس نے کہا

---

[1] مسلمانوں کا عروج وزوال ص۲۳۳

"میں اپنے بیٹوں کے عادات و اطوار سے خوب واقف ہوں، اس وقت بھی جب وہ میرے دست نگر ہیں دن رات شراب خواری اور عیاشی میں مصروف رہتے ہیں، میں ان کو اس قابل نہیں سمجھتا، کہ سلطنت کا بار اٹھا سکیں، بخلاف اس کے رضیہ اگرچہ عورت ہے لیکن فہم و فراست کے اعتبار سے حقیقتاً مرد ہے، اور اسی وجہ سے میں اسے بیٹوں پر ہر طرح ترجیح دیتا ہوں"[1]

اب اس کا خیال کون کرتا ہے، اب کسی کو عہدہ دینے کے لئے صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ بڑا آدمی ہے یا نہیں کسی بڑے باپ کا بیٹا ہے یا نہیں، صلاحیت کی جانچ کون کرتا ہے، ہم اپنے ملک میں آئے دن دیکھتے ہیں کہ ملک و قوم کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں دی جاتی ہے، جو اپنی پارٹی کا حامی ہے انجمن یا جماعت میں چندہ زیادہ دیتا ہے، اور صحیح و غلط دونوں کی حامی بھرتا ہے،

سلطان التمش کا چھوٹا بیٹا ناصر الدین جو رضیہ کے بعد دو بادشاہوں کے حکومت کرنے کے بعد بادشاہ بنا، اس کے متعلق نظام الدین احمد مؤلف طبقات اکبری کا بیان ہے

"سلطان ناصر الدین ہر سال دو قرآن شریف اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا، اور انکی کا ہدیہ، سلطان کے ذاتی خورد و نوش میں صرف ہوتا تھا، ایک مرتبہ بادشاہ کے لکھے ہوئے قرآن مجید کو ایک امیر نے معمول سے زیادہ قیمت دے کر ہدیہ لیا، تو بادشاہ نے حکم دیا، کہ آئندہ سے اس کے لکھے ہوئے نسخہائے قرآن مجید کو پوشیدہ طریقہ پر یعنی اس کا نام بتائے بغیر رائج الوقت قیمت پر ہدیہ کیا جائے، بادشاہ کے گھر میں اس کی بیوی کے سوا کوئی لونڈی یا خادمہ کام کرنے کو نہ تھی، ایک روز بیوی نے امور خانگی سے تنگ آکر ایک لونڈی خریدنے کی فرمائش کی تو بادشاہ نے جواب دیا" بیت المال بندگانِ خدا کا حق ہے، میں اس کا مجاز نہیں ہوں کہ اس میں سے کچھ روپیے کر اپنے ذاتی آرام کے لئے لونڈی خریدوں، دنیا کی تکلیفوں پر صبر کرو خدا آخرت میں اس کا بدلہ دے گا"[2]

"اکل حلال" کا یہ اہتمام کیا جاتا ہے یہ بادشاہِ وقت ہے اور اس طرح عسرت کی زندگی

---

[1] مسلمانوں کا عروج و زوال ص ۲۲۵ [2] ایضاً ص ۲۲۶

بسر کرتا ہے، پھر اس کا گوشت و پوست اور خون جو حلال روزی سے تیار ہوا ہے، اس سے کبھی کوئی کمینہ اور پست خصلت پیدا ہو سکتی ہے؟ اور بادشاہ کی اس طرزِ زندگی کا اثر کیا عوام اور پبلک پر کچھ نہ ہوگا؟ حق یہ ہے کہ انھی جیسے لوگوں نے خدمتِ خلق انجام دی، اور صحیح خدمت انجام دی، اس میں بڑی برکت ہوئی، ملک اور قوم کے اخلاق و اعمال متاثر ہوئے،

ہمارے اس زمانہ کے صدر جمہوریہ دس ہزار کا ماہانہ وظیفہ لیتے ہیں اور ہزاروں روپے ان کی ذات پر دوسرے راستہ سے خرچ ہوتے ہیں، جی چاہے تو ان کو چور دروازہ کہہ لیجئے، کیا باایں ہمہ آپ ان کو مخلص کہیں گے، اپنا خیال تو یہ ہے کہ ہمارے دور کے بادشاہ، صدر جمہوریہ، وزیر اعظم اور دوسرے وزرا، اور حکام ملک اور قوم کی خدمت نہیں کرتے، بلکہ ملک اور قوم ان لوگوں کی، ان کے خاندانوں کی، اور ان کے جاہ و حشمت کی خدمت کرتے ہیں

ہمارا "آزاد بھارت" جہاں وہ لوگ حکمراں ہیں، جنہوں نے کل تک اپنے اخلاص اور خدمتِ ملک کا ڈھنڈورا پیٹا تھا، ان کا حال یہ ہے کہ اگر حساب لگایا جائے، تو ہر صوبہ اور مرکز میں چچا بھتیجا مل کر ملک کی نصف دولت اپنے پیٹ میں ڈال لیتے ہیں، اور نصف دولت پورے ملک پر صرف ہوتی ہے، بھتہ اور تنخواہ میں کمی کا سوال اٹھا دیجئے تو بول اٹھیں گے، پھر ہمارا وقار باقی نہ رہے گا، گویا ڈبل ڈبل مشاہرہ پر اپنے وقار کی بنیاد کھڑی کئے ہوئے ہیں،

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آسکتا نہیں محوِ حیرت ہوں، کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

غیاث الدین بلبن کا واقعہ لکھا ہے، کہ اس میں کمزور کے ساتھ ہمدردی کا بڑا صحیح جذبہ تھا، فرشتہ کا بیان ہے

"طبیعت میں غم زدہ لوگوں کے ساتھ ہمدردی کرنے کا جذبہ اس قدر تھا کہ علاوہ نماز جنازہ میں شریک ہونے کے میت کے گھر پر جاتا تھا، اور مرحوم کے پس ماندگان کو صبر اور راضی برضا رہنے کی تلقین کرتا تھا اور یتیم بچوں کی پرورش کے لئے گراں بہا وظیفے مقرر کرتا تھا، راستہ میں چلتے چلتے اگر کہیں مجلس وعظ نظر آتی تھی تو فوراً گھوڑے سے اتر کر مجلس میں شریک ہوتا، اور وعظ

میں خدا اور رسول کے احکام بغور سن کر زار، زار، روتا تھا۔[1]

اب یہ بات تو ہمارے علماء کرام میں بھی جو خاص دینی طبقہ کہا جاتا ہے، باقی نہیں رہی، مالدار عہدہ دار اور صاحبِ جاہ و حشمت کے یہاں تو ہمدردی کے لئے جا سکتے ہیں، مگر بے کسوں، غریبوں اور یتیموں کی ہمدردی کون کرتا ہے؟ یہ غریب طبقہ ان بزرگانِ دین کی نگاہوں میں بھی "انسانیت" سے خارج ہے، الا ماشاء اللہ کچھ لوگ ایسے ضرور طبقہ علماء میں رہ گئے ہیں جو ہر ایک کو ایک نگاہ سے دیکھتے ہیں، مگر ان کی تعداد بہت کم ہے،

اور خضوع و خشوع کے مسئلہ میں تو اور پیچھے ہیں، مسلمانوں کے دل سخت ہو گئے، ان کے دل میں جذبہ اب تو بالکل باقی نہ رہا، کچھ جاہل تو ایسے مل جائیں گے، جن کے دل "احکامِ دین" کے سلسلہ میں نرم ہیں، ورنہ ہمارے علماء کرام کا طبقہ خدا جانتا ہے، یہ تو نہ معلوم اپنے کو کیا سمجھ بیٹھے ہیں، اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ کل کے کل ایسے ہیں میں نے اپنی آنکھوں سے کچھ علماء کو دیکھا ہے، دین کے معمولی معمولی واقعہ میں زار، زار روتے ہیں، اور ان کا قلب اتنا صاف ہے کہ ان کی چند روزہ صحبت انسان کو سنوار سکتی ہے، نوجوان علماء میں اس کی بڑی کمی ہے، اللہ تعالیٰ ہی کوئی سبیل پیدا کرے، تو ممکن ہے، ورنہ ظاہری طور پر دنیا اندھیری ہوتی جا رہی ہے،

سلطان بلبن نے اپنے بیٹوں کو ایک مرتبہ جمع کر کے کہا، کہ بادشاہوں کے اکثر افعال شرک کی حد تک پہنچ جاتے ہیں اور سنتِ نبوی کے خلاف ہوتے ہیں مگر چار چیزوں کا خاص طور پر بادشاہوں کو لحاظ رکھنا چاہیئے،

"اوّل یہ کہ بادشاہ کو چاہیئے اپنی حشمت اور دبدبہ کو مناسب محل اور موقع پر استعمال کرے، اور خلق کی بھلائی اور خدا ترسی کے علاوہ کوئی اور بات اس کے پیشِ نظر نہ ہو، دوسری بات یہ ہے کہ کسی طرح کی بدکاری کو ملک میں رائج نہ ہونے دے، اور ہمیشہ فاسقوں اور بے غیرتوں کو ذلیل اور رسوا رکھے، تیسرے یہ کہ سلطنت کے کام ہمیشہ عقل مندوں اور شائستہ لوگوں

---

[1] مسلمانوں کا عروج و زوال صفحہ ۲۴

کے سپرد کرے، مخلوق کی باگ، دیانت دار، خدا ترس، لوگوں کے ہاتھ میں دے، بد عقیدہ لوگوں کو اپنے ملک میں قدم نہ جمانے دے، چوتھی بات یہ ہے کہ انصاف میں پوری کوشش کرے اور ماتحتوں کے کاموں کو برابر عدل کی ترازو میں تولتا رہے، تاکہ ملک میں ظلم اور جبر کا نام بھی نہ سنائی دے"[1]

یہ اصولِ جہاں بانی اس لائق ہیں کہ آج بھی ان پر عمل کرنے کی بڑی ضرورت ہے، دنیا کے حکمراں طبقہ کو خاص طور پر ان اصول کو پڑھنا چاہئے، اور دن رات اس پر گامزن رہنا چاہئے، خواہ وہ کسی ملک کا حکمراں طبقہ ہو، اور کسی عقیدہ اور دھرم کا ماننے والا ہو،

ضرورت ہے کہ ملک کی مرکزی حکومت ان نصیحتوں کو سونے کے پانی سے لکھوا کر ہر ایک وزیر، سفیر، اور لیڈر کے پاس بھجوا دے، اور ان پر عمل کرنے کی سخت تاکید کرے، سلطان بلبن کا عمل چونکہ انہی اصول پر تھا اس لئے قدرتی طور پر ان کی وفات کا یہ اثر ہوا، کہ پورا ملک ماتم کدہ بن گیا، ملک الامراء فخر الدین پر یہ اثر ہوا، کہ

"بلبن کی وفات سے چھ ماہ تک وہ زمین پر ہی سوتے رہے دہلی میں کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جس نے مرحوم کے لئے صدقہ اور خیرات کر کے ان کی روح کو ثواب نہ پہنچایا ہو"[2]

خاندانِ خلجی کا پہلا سلطان، جلال الدین بڑا رحم دل بادشاہ گذرا ہے ساتھ ہی عادل بردبار اور خدا ترس بھی تھا ایک دفعہ ملک چھجو نے بغاوت کی سلطان نے مقابلہ کیا ملک چھجو نے شکست کھائی خود چھجو اور اس کے دوسرے لوگ گرفتار ہوئے، جلال الدین نے سب کو آزاد کر دیا، بلکہ انعام و اکرام سے نوازا بھی، امراء نے جب کہا کہ ملک چھجو اور اس کے سب ساتھی واجب القتل ہیں، ایسے لوگوں کے ساتھ رعایت اور کرم و نوازش کا معاملہ آئین جہانداری کے خلاف ہے" یہ سن کر سلطان نے جواب دیا۔

"تم جو کچھ کہتے ہو درست اور تدبیر جہاں داری کے موافق ہے، مگر اس کو کیا کروں، کہ ستر سال میں نے حالتِ اسلام میں گذارے، اور ایک مسلمان کا بھی خون نہیں کیا، اب جب کہ بڈھا ہو چکا ہوں اور عمر کا آخری حصہ گذار رہا ہوں، کسی مسلمان کا خون کرنا نہیں چاہتا"[3]

---

[1] مسلمانوں کا عروج و زوال صفحہ ۲۴۲ [2] ایضاً صفحہ ۲۴۳ [3] ایضاً صفحہ ۲۴۶

ایک بادشاہ کا یہ جذبہ قابل صد ستائش ہے، رحمدلی اور شریف طبیعت ہونے کی ایک زبردست مثال قائم کرگیا، اور یہ رحمدلی کچھ مسلمانوں ہی کے ساتھ خاص نہ تھی، بلکہ ہر انسان سے اس کو محبت تھی، ہندو کو بھی اتنا ہی چاہتا تھا، جس قدر مسلمان کو، ۶۹۰ھ میں سلطان نے قلعہ رنتھمبور کو فتح کرنے کے لئے لشکر کشی کی، راجہ قلعہ بند ہوگیا، چند دنوں کے بعد سلطان مع لشکر کے واپس چلا آیا اور کہنے لگا

"یہ قلعہ اتنا اہم نہیں ہے، کہ اس کو فتح کرنے کے لئے ایک جان کی قربانی بھی پیش کی جاسکے، اور بالفرض اگر میں نے یہ قلعہ فتح کر بھی لیا، اور خدا کے بندوں کو قتل کرادیا، تو کل جب عورتیں بیوہ ہوکر اور بچے یتیم ہوکر مرے سامنے آئیں گے، اور مری نظر ان پر پڑے گی تو مرا کیا حال ہوگا، قلعہ کی فتح کی ساری لذت مجھ پر زہر سے زیادہ تلخ ہوجائے گی"[1]

آج کل یہ روایت ان ممالک کے حکمرانوں کو خصوصیت سے پڑھنی چاہئے، جو رات دن خوں ریزی اور قتل و قتال میں مبتلا رہتے ہیں، امریکہ کے باور اور نکسن آنکھیں کھول کر پڑھیں، جو لاکھوں عورتوں کو بیوہ اور لاکھوں بچوں کو یتیم کرنے کے بعد بھی اسی فکر میں ہیں، کہ ایک اور جنگ عظیم دنیا میں چھڑ جائے،

سلطان جلال الدین کا خدا بھلا کرے، اس نے بڑی اچھی بات کہی، قلعہ کی فتح کے لئے انسان کے خون سے ہاتھ رنگنا بڑی زیادتی ہے، کاش ہمارے اس دور کے ارباب سیاست و حکومت میں یہ جذبہ پیدا ہوجائے،

سلطان کو ایک مرتبہ خیال آیا، کہ مرے کارنامے اتنے شاندار ہیں پھر مجھ کو کیوں "المجاهد فی سبیل اللہ" کے لقب سے خطبہ میں نہ یاد کیا جائے، خود اس کی تدبیر سوچی، اور ایسا پروگرام بنایا کہ مجھ سے دربار میں کچھ لوگ اس کی اجازت طلب کریں، جب یہ پروگرام طے ہوچکا تو دفعتاً اس کے دل پر آیا، شیطان نے مجھے دھوکہ دیا، دربار میں آیا، تو حسب پروگرام دربار میں قاضی

---

[1] مسلمانوں کے عروج و زوال ص [illegible]

فخرالدین کے ذریعہ قوم کی طرف سے بادشاہ سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ ہمیں اجازت دی جائے کہ حضور کو "المجاھد فی سبیل اللہ" کے لقب سے یاد کر سکیں، سلطان نے یہ سن کر کہا

"مجھے معلوم ہے، آپ لوگ میرے کہنے کے مطابق ملکہ جہاں کے ایماء سے یہ کہہ رہے ہیں لیکن اسی وقت مجھ کو خیال آیا تھا کہ میں نے دشمنان خدا سے جتنی لڑائیاں لڑی ہیں، ان میں سے کوئی جنگ بھی ایسی نہیں ہے، جو میں نے غرضِ دنیاوی شائبہ کے بغیر، محض خدا کے لئے لڑی ہو، اس خیال کے آتے ہی میں اپنی خواہش پر پشیمان ہوا، اور اب میں نے اپنے ارادہ سے رجوع کر لیا ہے"[1]

اس واقعہ سے سلطان کے قلب کی صفائی کا اندازہ ہوتا ہے، کہ کس قدر صاف تھا، اپنے ایک قلبی چور کا راز برسر دربار فاش کر دیا، اور اپنی غلطی کے اظہار پر ذرہ برابر پس و پیش نہ کیا، سچائی اسی کا نام ہے، انسان شیطانی وسوسہ سے دوچار ہوتا ہے، مگر مسلمان وہ ہے کہ جوں ہی اس کا راز اس پر کھلا توبہ کی، اور شیطانی وسوسہ کا پردہ چاک کر دیا، اس واقعہ میں ہمارے دور کے امراء اور دوسرے لوگوں کے لئے عبرت و بصیرت کا سبق ہے،

سلطان علاء الدین خلجی نے ایک مرتبہ قاضی مغیث سے متعدد سوالات کئے، قاضی صاحب نے ہر ایک سوال کا جواب شریعت کے مطابق اور بادشاہ کے خلاف دیا، قاضی صاحب کو یقین تھا کہ اب مرا قتل ہونا قریب ہے مگر خلاف توقع علاء الدین نے انعام و اکرام سے نوازا، قاضی صاحب کو خطاب کر کے بولا،

"اگرچہ میں علم سے بالکل بے بہرہ ہوں، اور فرائض و نوافل کے مسائل سے نابلد ہوں لیکن مسلمان ہوں، اور مسلمان زادہ ہوں، میں جانتا ہوں کہ آپ نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل صحیح ہے"[2]

یہ احساس بھی غنیمت ہے، اب ہمارے اس زمانہ میں کسے اس کا احساس ہے، اب کوئی

---

[1] مسلمانوں کا عروج و زوال ص۲۴۷ [2] ایضاً ص۲۵۵

باثر امیر اپنی مخالفت برداشت کرنے کو تیار نہیں، گو یہ مخالفت حق ہو، مگر مسلمانوں کو غیظ و غضب آنے سے پہلے سوچنا چاہئے، میں مسلمان ہوں اور مسلمان کی زندگی دنیا میں بھی آزاد نہیں، وہ ہر قدم پر اسلامی قانون کا پابند ہے۔

دولت کی ناہمواری اور مالداروں کے نخوت و غرور کو ختم کرنے کے لئے علاء الدین خلجی نے کافی کوشش کی، اس نے چاہا کہ امیر اور مالدار بھی محنت کریں، تاکہ غریبوں کو ان کی قدر معلوم ہو، فرشتہ کا بیان ہے۔

"علاء الدین نے چاہا کہ سلطنت میں چند ضابطے ایسے جاری کئے جائیں جس سے کم زور اور طاقت ور لوگوں میں بالکل مساوات ہو جائے، اور گاؤں کے مکھیوں اور چودھریوں کو جو فوقیت رعایا پر حاصل ہے وہ باقی نہ رہے"[1]

غیاث الدین تغلق کے متعلق فرشتہ کا بیان ہے

"یہ بادشاہ بڑا حلیم اور بردبار تھا، سخاوت اور عقل بھی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، علاوہ بریں پاک باز اور نیک طینت بھی تھا، پانچوں وقت کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتا تھا، اور صبح سے شام تک دیوان عام میں بیٹھ کر رعایا کی پرسش اور ملکی و مالی مشکلات کو حل کرنے میں اپنا سارا وقت صرف کرتا تھا، ...... اپنی رعایا میں جس شخص کو پریشان حال دیکھتا اس کا حال پوچھتا اور اس کی تکلیف رفع کرنے کی کوشش کرتا تھا، جو امر خلق کی تکلیف کا باعث ہو سکتا تھا، اس سے احتراز کرتا، اور جو شخص مخلص نظر آتا، اس کی حوصلہ افزائی کرتا تھا"[2]

اب یہ خوبیاں حکمراں طبقہ میں عنقا ہیں، آجکے حکمراں طبقہ کی زندگی کا تجزیہ کیجئے تو برائیوں کے سوا نیکی کا نام و نشان ملنا مشکل ہے، پرائیوٹ زندگی بڑی گندی، بیہودگیوں میں آلودہ اور نیکیوں سے کوسوں دور نظر آئے گی، اب مالدار کی حوصلہ افزائی تو ممکن ہے مگر پریشاں حال پر

---

[1] مسلمانوں کا عروج و زوال ص ۲۶۲ [2] ایضاً ص ۲۷۳

رحم وکرم خواب وخیال سے زیادہ نہیں، چالباز اور جھوٹوں کے ساتھ تو حکمراں احسان اور حسن سلوک کر سکتے ہیں، مگر مخلص کی جگہ ان کی نظر میں جیل یا کوئی نہایت تکلیف دہ جگہ ہی ہو سکتی ہے، گو اس سے بھی انکار نہیں کہ اللہ کے بندے آج بھی کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں، مگر یہ شاذ ونادر ہی۔

سلطان محمد بن تغلق جو بڑی خوبیوں کا بادشاہ گذرا ہے، اور جو اپنی سخاوت اور فیاضی میں بہت مشہور ہے، اس کی دینی شغف کا اندازہ اس اقتباس سے لگائیے،

"نماز، روزہ کے علاوہ مستحبات ونوافل اور وظائف واوراد تک کا اہتمام اور ان کی پابندی کرتا اور ممنوع اور نشہ آور چیزوں سے اور ہر اس فعل سے کہ جس پر معصیت کا اطلاق ہو سکتا ہے پرہیز کرتا تھا۔"

یہ تو اپنا ذاتی حال تھا، اور تبلیغ کا یہ حال تھا جیسا کہ ابن بطوطہ کا بیان ہے۔

"سلطان کا حکم تھا کہ جو شخص جماعت کے ساتھ نماز نہ پڑھے اس کو سزا دی جائے اس نے بہت سے لوگوں کو اس کام پر مقرر کیا، کہ جو شخص جماعت کے وقت بازار میں ملے اس کو پکڑ کر لائیں، سلطان کا حکم تھا کہ ہر شخص نماز اور اسلام کے احکام سیکھے، چنانچہ لوگ بازاروں میں نماز کے مسائل یاد کرتے پھرتے، اور انھیں کاغذوں پر لکھواتے تھے"[1]

اس بادشاہ پر خدا کی رحمتیں ہوں، کہ اس نے اپنی عبدیت کو خوب سمجھا، اور اپنے فرائض کو جیسا چاہئے ادا کیا، اس واقعہ میں مسلمان کلمہ گو حکمرانوں کے لئے عبرت وبصیرت کے تابناک اسباق ہیں، کاش موجودہ مسلمان اس بات کو سمجھیں اور ان پر عمل پیرا ہوں۔

ہمارے ہندو بھائی انگریزوں کی تعلیم سے متاثر ہو کر کہیں گے کہ تب تو یہ بادشاہ متعصب رہا ہوگا، مگر حاشا وکلا ایسی بات نہیں، جو دیندار ہوتا ہے، وہ عادل اور خدا ترس ہوتا ہے اور اس کی نظر میں سارے رعایا برابر ہوتے ہیں، چنانچہ یہ بادشاہ بھی بڑا منصف اور عدل گستر تھا،

---

[1] مسلمانوں کا عروج وزوال ص ۲۷۶

ابن بطوطہ کا بیان ہے

"میں نے سلطان محمد بن تغلق سے زیادہ منصف اور عدل گستر کوئی نہیں دیکھا، ایک مرتبہ ایک "ہندو امیر" نے دعویٰ کیا، کہ بادشاہ نے اس کے بھائی کو بلا وجہ مار ڈالا ہے، قاضی کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا، تو بادشاہ بغیر کسی ہتھیار کے قاضی کے سامنے عام ملزموں کی طرح حاضر ہوا، اور قاضی کو سلام کیا، اور تعظیم بجا لایا، پہلے سے حکم تھا کہ بادشاہ عدالت میں حاضر ہو تو قاضی اس کی تعظیم کے لئے کھڑا نہ ہو، مقدمہ سنایا گیا، آخر قاضی نے فیصلہ کیا، کہ بادشاہ پر جرم ثابت ہے اسے چاہیئے کہ مدعی یعنی ہندو امیر کو راضی کرے، ورنہ اس سے قصاص لیا جائیگا، چنانچہ سلطان نے امیر کو رضامند کر لیا، اور قاضی نے اسے بری کر دیا"[1]

اس سے بھی عجیب تر واقعہ سنیئے،

"ایک امیر کے لڑکے نے دعویٰ کیا کہ بادشاہ نے اس کو بلا سبب مارا ہے، قاضی کے سامنے معاملہ گیا تو اس نے حکم دیا کہ بادشاہ یا تو لڑکے کو راضی کرے ورنہ قصاص دے، ابن بطوطہ خود اپنی آنکھوں دیکھی کہتا ہے کہ میں نے دیکھا کہ بادشاہ نے لڑکے کو دربار میں بلا کر اس کے ہاتھ میں چھڑی دی اور کہا اپنا بدلہ لے لے اور اس کو اپنے سر کی قسم دلائی، کہ جیسا میں نے تجھ کو مارا ہے تو بھی مجھے مار۔ چنانچہ لڑکے نے ہاتھ میں چھڑی لے کر اکیس چھڑی بادشاہ کے ماریں یہاں تک کہ ایک دفعہ اس کی کلاہ بھی سر سے گر پڑی"[2]

کیوں اب ہمارے زمانہ میں حکمرانوں میں یہ عدل گستری پائی جاتی ہے؟ اے کاش حکمراں طبقہ ان واقعات کو پڑھتا اور سبق حاصل کرتا، آزاد بھارت اور پاکستان میں لاکھوں ہزاروں مسلم ہندو قتل کر دیئے گئے مگر کسی نے کوئی خبر تک نہ لی، قاتل کی نکسیر تک نہ پھوٹی، کہا جاتا ہے وزراء نے مل کر بعض منصف اور عدل گستر کو قتل کروا ڈالا، مگر مقدمہ تک چلنے کی نوبت نہ آئی، روس جو اشتراکیت کا حامی ہے اس نے اپنے ملک کے ایک مدبر کو بات کی بات میں مار ڈالا مگر سمجھا یہی گیا کہ انصاف ہے۔

کیا اب اس دور میں اپنے جرم کا اعتراف کون کرتا ہے؟

---

[1] مسلمانوں کا عروج و زوال ۲۶۶ [2] ایضاً

حیات شیخ عبدالحق

از

(ابو المآثر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی)

فاضل گرامی جناب خلیق احمد صاحب نظامی ہم سب کے شکریہ کے مستحق اور قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے حیات شیخ عبدالحق لکھ کر اردو لٹریچر میں بہت اہم اضافہ فرمایا، ان کی اس کتاب کو پڑھ کر میں بے حد محظوظ ہوا، اور میں سمجھتا ہوں کہ کوئی شخص یہ کتاب پڑھ کر ان کی تلاش وجستجو اور محنت وکاوش کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا

اس اعتراف کے ساتھ ساتھ فاضل مصنف سے معافی چاہتے ہوئے اتنا اور بھی عرض کروں گا کہ ان تمام خوبیوں کے باوجود کسی موقع پر توجہ نہ ہونے یا مواد نہ ملنے کی وجہ سے کچھ فروگذاشتیں بھی ہوگئی ہیں، جن کی نسبت میں امید کرتا ہوں کہ دوسرے ایڈیشن میں باقی نہ رہیں گی۔

اس وقت اس سلسلہ میں میرے سامنے جو چند باتیں ہیں ان کو اس لئے سپرد قلم کرتا ہوں کہ جب تک دوسرے ایڈیشن کی نوبت نہیں آتی اس وقت تک اگر انھیں چند سطروں کو چھاپ کر حیات شیخ عبدالحق کا ضمیمہ بنا دیا جائے تو فی الجملہ ان فروگذاشتوں کی تلافی ہوجائے گی۔

اس کتاب میں سب سے بڑی کمی جو مجھے نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں شیخ محدث کے تلامذہ ومسترشدین کا کوئی باب یا عنوان نہیں ہے، حالانکہ حیاتِ شیخ کا یہ ایک نہایت سنہرا ورق ہے، جس کا اس لاجواب تصنیف میں موجود ہونا اس کی زیب وزینت کے لئے بھی ضروری تھا، نیز اس کے بغیر کتاب کا موضوع بھی تشنہ نظر آتا ہے۔

مگر ہم کو فاضل مصنف کی معذوری کا پورا احساس ہے، شیخ محدث کے معاصر یا قریب العہد تذکروں کی نایابی یا کم یابی کی وجہ سے اس باب کے لئے خاطر خواہ مواد فراہم نہیں ہوسکا، کتنے

تعجب کی بات ہے کہ شیخ محدث بیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد اٹھارہ برس تک روانگی حجاز سے پہلے اور باون ۵۲ برس تک واپسی کے بعد مسند درس وارشاد پر متمکن رہے اور ہنگامہ تعلیم وارشاد برپا رکھا، اس طویل مدت میں خدا ہی بہتر جانتا ہے کتنے خوش نصیبوں نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہوگا، اور کتنوں نے روحانی برکتیں حاصل کی ہوں گی، مگر آج ذرائع تحقیق وتفتیش کے فقدان کی وجہ محدود ے چند ناموں سے زیادہ دستیاب نہیں ہو سکے مجھ کو اس وقت جو نام مستحضر ہیں ان کو پیش کرتا ہوں۔

(۱) شیخ نور الحق صاحبزادہ شیخ محدث کا نام ان کے تلامذہ میں سرفہرست ہے، اولاد شیخ محدث کے عنوان کے ماتحت نظامی صاحب ان کا ذکر کر چکے ہیں، اعادہ کی ضرورت نہیں ہے، ہاں اتنا اضافہ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نور الحق کے فیض صحبت سے جس طرح ان کی اولاد نے علم حدیث میں کمال پیدا کیا دوسرے فضلائے وقت بھی اس دولت سے مالامال ہوئے، ازاں جملہ میر سید مبارک بلگرامی محدث ہیں جن کو آزاد بلگرامی مآثر الکرام میں قطب المحدثین کے لقب سے یاد کرتے ہیں، طالب علمی کے زمانہ میں وہ جب تک دہلی میں رہے، برابر شیخ نور الحق کے مکان میں سکونت پذیر اور شب وروز استفادہ میں مصروف رہے۔ نواب صدیق حسن تقصار میں لکھتے ہیں۔

ازاول تا آخر بخانہ شیخ نور الحق بن شیخ عبد الحق دہلوی سکونت ورزید وعلم حدیث ازاں جناب اخذ کرد ودریں فن اشرف مہارتے عالی بہم رسانید وتمام عمر در خدمت کلام نبوی فنا ساختند

شروع سے اخیر تک شیخ نور الحق کے مکان پر مقیم رہے اور ان سے علم حدیث حاصل کیا۔ اور اس فن میں بڑی مہارت پیدا کی، اور ساری عمر حدیث کی خدمت میں بسر کی۔

سید مبارک محدث کے حالات معلوم کرنے کے لئے مآثر الکرام و تقصار کا مطالعہ کرنا چاہیے ان کا سن وفات ۱۱۱۵ھ اور مزار بلگرام میں ہے۔ سید مبارک سے علم حدیث کی تحصیل وتکمیل

سید عبد الجلیل بلگرامی المتوفی ۱۱۳۸ھ نے اور شاہ طیب بن سید نعمت بلگرامی المتوفی ۱۱۵۲ھ نے کی، آزاد بلگرامی سید عبد الجلیل کے ذکر میں لکھتے ہیں اخذ الحدیث عن قطب المحدثین منبع المجد الطوامی مولانا السید مبارک الحسینی الواسطی البلگرامی المتوفی سنۃ خمسۃ عشر ومائۃ والف وھو اخذ عن الشیخ نور الحق وھو عن ابیہ الشیخ عبد الحق الدھلوی (سبحۃ المرجان ص۸۸) اور شاہ طیب بلگرامی کے ذکر میں فرماتے ہیں، "کہ حدیث از قطب المحدثین سید مبارک سند کرد" (مآثر الکرام)

شیخ نور الحق کے حلقۂ درس میں جو فضلا شریک ہوتے اور ان سے سندِ فضیلت حاصل کی ان میں حضرت شاہ پیر محمد لکھنوی المتوفی ۱۰۸۵ھ کو خاص امتیاز حاصل ہے اس لئے کہ حضرت ملا نظام الدین سہالوی سے لے کر آج تک کے تمام علمائے فرنگی محل اور سلسلہ نظامیہ کی دوسری شاخوں کے تمام علمائے ہند علوم درسیہ میں شاہ پیر محمد رحمۃ اللہ کے شاگرد و تلمیذ ہیں اور ان کے واسطہ سے سب کا سلسلہ حضرت شیخ عبد الحق دہلوی سے مل جاتا ہے (ملاحظہ ہو باقیات صالحات مصنفہ مولانا عبد الباری اور دیگر رسائل علمائے فرنگی محل)

(۲) شیخ ہاشم فرزند شیخ دہلوی

(۳) رضی الدین ابو المناقب شیخ علی محمد فرزند شیخ دہلوی

(۴) شیخ ابو البرکات ولی الدین عبد النبی

(۵) شیخ ابو السعادت کمال الدین ابو الرضا بابارتن، شیخ دہلوی کے نواسے (یا پوتے)

یہ سب حضرات شیخ دہلوی کے اجازت یافتہ تھے، رسالہ مثبت الشیخ عبد الحق الدہلوی کے ساتھ میں نے اس اجازت نامہ کی نقل دیکھی ہے جس میں ان سب حضرات کے نام بہت بلند مدحیہ الفاظ کے ساتھ درج ہیں، اور حدیث کی جو کتابیں ان لوگوں نے شیخ دہلوی کے پاس پڑھی ہیں ان کے نام بھی درج ہیں۔

(۶) مولانا محمد حیدر دہلوی، مذکورہ بالا اجازت نامہ کے ساتھ ایک مستقل اجازت نامہ

مولانا محمد حیدر بن مولانا صادق بن مولانا حاجی علی کے نام سے بھی ہے جس کے آخر میں ۲۲ ذی القعدہ ۱۱۳۰ھ کی تاریخ ہے۔ اس رسالہ کے آخر میں ایک اور اجازت نامہ ہے جس میں مولانا حیدر نے شیخ مولانا احمد بن شاہ محمد بن ابراہیم کو حدیث کی سند اور روایت کی اجازت دی ہے، اور اس پر مولانا حیدر نے اپنا دستخط اس طرح کیا ہے، محمد حیدر بن محمد صادق بن میر محمد علی الدہلوی مولدا الہمدانی اصلا والجعفری نسباً۔

(۷) شیخ محمد حسین نقشبندی، اس رسالہ کے سرورق پر ایک تحریر شیخ احمد ابو الخیر مکی کی ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ مولف (شیخ عبدالحق دہلوی) سے شیخ محمد حسین نقشبندی اور ان سے شیخ حسن عجیمی المونی روایت کرتے ہیں اور میں متعدد طرق سے بواسطہ شیخ عبدالحق روایت کرتا ہوں جن میں سب سے عمدہ اور صحیح طریق وہ ہے جو میرے شیوخ کی ان اسنادوں سے ہے جو شیخ حسن عجیمی سے متصل ہوتی ہیں۔

(۸) اسی رسالہ کے سرورق پر یہ بھی ہے کہ شیخ صالح زوادی نے کتاب لامم کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ شیخ محمد فاسی شیخ عبدالحفیظ عجیمی سے اور وہ محمد بن[1] عبدالغفور سندی سے اور وہ شیخ عبدالقادر مفتی سے اور وہ مولف (شیخ عبدالحق دہلوی) سے روایت کرتے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا، شیخ عبدالقادر مفتی سے مراد شیخ عبدالقادر مفتی مکہ المتوفی ۱۱۳۶ھ معلوم ہوتے ہیں ان کا سماع یا لقاء شیخ دہلوی سے مستبعد ہے، غالباً ان کے اور شیخ کے درمیان ایک واسطہ چھوٹ گیا ہے۔

(۹) خواجہ حیدر بن خواجہ فیروز کشمیری رحمۃ اللہ علیہ، عالم عامل، عارف کامل اور استاد علمائے کشمیر تھے، آپ نے ابتدا میں ابو الفقرا النصیب مسکین کی خدمت میں قرآن پاک یاد کیا اور ابتدائی علوم حاصل کئے، فنون کی تحصیل مولانا جوہر ناتھ کے پاس کی، آخر میں حضرت شیخ محدث کے ہاتھ پر بیعت کی اور علوم حدیث کی تحصیل کرکے ان علوم کی اجازت بھی ان سے پائی، اسرار الابرار میں ہے۔ "در آخر مرید شیخ عبدالحق دہلوی شدہ و تحصیل علوم حدیث پیش او کردہ رخصت دراں

---

[1] اصل میں یوں ہی ہے مگر صحیح محمد ہاشم بن عبدالغفور ہے ۱۲ حبیب الرحمٰن

علوم از و یافتہ"۔

خواجہ حیدر کا بیان ہے کہ جس زمانہ میں میں حضرت شیخ کے پاس تحصیل علم میں مصروف تھا ایک دن شیخ نے مجھ سے فرمایا کہ تم رات دن تحصیل علم میں لگے رہتے ہو قرآن پاک کب پڑھتے ہو، پھر ایک دن فرمانے لگے کہ میرا جی چاہتا ہے شب برات کو تم سے ایک ختم نماز میں، سنوں چنانچہ شب برات کو میں حاضر خدمت ہوا، شیخ نے مجھ کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا، میں نے آگے بڑھ کر تحریمہ باندھا، شیخ نے بھی میری اقتدا میں تحریمہ باندھا، اس کے بعد میں نے پڑھنا شروع کیا اور اسی رات میں پورا قرآن سنا دیا کسی ایک جگہ بھی لقمہ دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی، صبح کو شیخ نے فرمایا کہ بسیار خوب خواندی و ضبط بنہایت داری (تم نے بہت اچھا پڑھا اور خوب یاد رکھا ہے) لیکن اگر تھوڑا علم مخارج اور قواعد قرأت بھی حاصل کر لو تو بہتر ہو اس کے بعد میں نے شیخ سے علم مخارج اور اصول قرأت کی تحصیل کی۔ (اسرار الابرار)

خواجہ حیدر قرآن یاد کرنے کے بعد مدۃ العمر ہر سال پورا قرآن تراویح میں پڑھتے رہے، یہ کبھی فوت نہیں ہوا الا یہ کہ ایک سال سفر کی وجہ سے چھوٹ گیا تو دوسرے سال اس کی قضا کی۔

۱۰۵۷ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ بابا داؤد مشکوتی مصنف اسرار الابرار ان کے شاگرد ہیں خواجہ حیدر کا ذکر حدائق الحنفیہ اور تذکرہ علمائے ہند میں بھی ہے۔

(۱۰) مولانا سلیمان احمد آبادی ——— آپ کی نسبت تذکرہ علمائے ہند میں لکھا ہے

از خدمت شیخ عبدالحق دہلوی کسب فیوض نمودہ، فاضل متبحر گشت، تصانیف عالیہ ازو یادگار اند (تذکرہ علمائے ہند صـ۱۲)

شیخ عبدالحق دہلوی کی خدمت میں فیوض حاصل کئے، اور متبحر فاضل ہوئے، متعدد اونچی تصنیفات ان کی یادگار ہیں۔

ان کا سال وفات معلوم نہیں۔ ان سے ان کے لڑکے مولانا احمد احمد آبادی نے علم حدیث اور دوسرے علوم کی اجازت لی، مولانا احمد یکتائے روزگار عالم تھے، تمام علوم میں ان کو دسترس حاصل تھی، اور اکثر علوم میں ان کی تصنیفات پائی جاتی ہیں، ازاں جملہ علم کلام میں ان کی کتاب [illegible]

ہے، زیادہ تر مولانا محمد شریف کے پاس تحصیل علم کی، اور علوم عقلیہ مولانا ولی محمد خان سے، تصوف میاں شیخ فرید سے اور علم ریاضی شاہ قباد مخاطب دیانت خاں سے حاصل کیا۔ مولانا احمد نے ۱۱۲۲ھ میں وفات پائی، آپ کا اور آپ کے والد بزرگوار مولانا سلیمان کا مزار احمد آباد میں ہے (تذکرہ علمائے ہند ص۱۲۰۱۳) مولانا احمد بن سلیمان۔ شیخ فتح محمد بن شیخ عیسیٰ برہان پوری کے بھانجے ہیں اور شیخ نے مفتاح الصلوٰۃ انھیں کے لئے تصنیف فرمائی تھی جیسا کہ خود ہی مفتاح الصلوٰۃ کے خاتمہ میں اس کی تصریح فرمائی ہے۔

مولانا احمد سے اکثر علوم ظاہر مولانا شیخ نورالدین احمد آبادی نے حاصل کئے، تذکرہ علمائے ہند میں ہے، تحصیل اکثر علوم ظاہر از آخوند مولانا احمد بن آخوند مولانا سلیمان نمودہ (ص۲۴۷) سبحۃ المرجان میں بھی مولانا احمد سے مولانا نورالدین کے تلمذ کا ذکر ہے۔ مولانا نورالدین بلند پایہ محدث تھے انھوں نے صحیح بخاری کی شرح لکھی ہے۔ جس کا نام نور القاری ہے اس کتاب کا قلمی نسخہ کبھڑوچ کے محکمۂ قضاۃ کے کتب خانہ میں موجود ہے، مولانا نورالدین نے ۱۱۵۵ھ میں وفات پائی۔

مولانا نورالدین کے علوم و معارف کے وارث ان کے فرزند شیخ محمد صالح عرف پیر بابا تھے، انھوں نے شاہزادہ محمد معظم کی فرمائش پر رسالہ چہل حدیث کا فارسی ترجمہ تحفۃ العرفان کے نام سے لکھا ہے، اس رسالہ کا قلمی نسخہ بھی مذکورہ بالا کتب خانہ میں ہے (معارف ص۱ جلد ۶۲) پیر بابا کی وفات ۱۱۴۷ھ میں ان کے والد کی حیات میں ہوئی (تذکرہ علمائے ہند ص۲۱۵)

(۱۱) ملا عبدالحکیم سیالکوٹی المتوفی ۱۰۶۷ھ نے بھی شیخ محدث سے استفادہ کیا ہے اور شیخ نے ان کو اپنی کتابوں کی روایت کی اجازت دی ہے، اور ان سے ان کے لڑکے عبداللہ لبیب[۲] نے ان کتابوں کی روایت کی، عبداللہ لبیب سے عبداللہ بن سعد اللہ[۳]

---

[۱] تاریخ محمدی قلمی نسخہ رام پور میں ان کا ذکر ہے، ۱۱۸۰ھ میں وفات ہوئی [۲] عبداللہ لبیب فرزند ملا عبدالحکیم کی عالمگیر بہت قدر کرتے تھے، ان کی تصنیفات میں تلویح کا حاشیہ تذریح ہے (حدائق الحنفیہ) اور صاحب تذکرہ علمائے ہند نے لکھا ہے کہ بگر دآوری علوم از پدر فائق برآمدہ (ص۲۲۵) [۳] عبداللہ بن ملا سعد اللہ لاہوری نزیل مدینہ منورہ شیخ ابوطاہر کردی کے والد بزرگوار شیخ ابراہیم کردی کے بھی استاد و شیخ تھے (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

لاہوری المتوفی ۱۰۸۳ھ نے اور ان سے حضرت شاہ ولی اللہ کے شیخ الحدیث ابو طاہر کردی نے روایت کی ہے، حضرت شاہ صاحب شیخ ابوطاہر کے اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"ازاں جملہ شیخ عبداللہ لاہوری وکتب ملا عبدالحکیم سیالکوٹی از وے روایت کند عن الشیخ عبد اللہ اللبیب عن مولانا عبد الحکیم وکتب شیخ عبدالحق دہلوی بہمیں واسطہ از مولانا عبدالحکیم روایت کند و وے از شیخ عبدالحق اجازت روایت (انسان العین ص۱۰)

(۱۳) سید شاہ طیب ظفر آبادی، سادات سیوانہ کی نسل سے تھے، حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی خدمت میں علوم دینیہ کی تحصیل و تکمیل کی۔ اور بڑا فیض حاصل کیا فراغ کے بعد ایک مدت تک درس و تدریس کا مشغلہ جاری رکھا۔ اس کے بعد خدا طلبی کی دھن پیدا ہوئی اور شیخ کامل کی تلاش میں پھرتے پھرتے جھوسی پہنچے اور وہاں حضرت شیخ تاج الدین جھوسوی کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے، اور چند دنوں میں خلافت سے بہرہ ور ہوتے، تھوڑے عرصہ تک جھوسی اور بنارس کے اطراف میں قیام رہا، پھر ظفر آباد آکر محلہ مخدوم پور میں سکونت اختیار کرلی، اور وہیں انتقال فرمایا، مزار ظفر آباد (ضلع جونپور) میں ہے (تجلی نور ص۳۴ حصہ دوم) مصنف بحر ذخار کے جد اعلیٰ شیخ محمد محمود قلندر ان کے ارشد خلفاء میں ہیں (تحفۃ الابرار ورق ۳۳) اور تجلی نور میں شیخ دانیال بنارسی کو بھی ان کا خلیفہ بتایا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے، شیخ دانیال بنارسی المتوفی ۱۰۱۵ھ حضرت شیخ عبدالسلام قلندر جونپوری عرف شاہ علن المتوفی ۹۷۶ھ کے خلیفہ تھے کمافی النفحات العنبریہ (ص۱۱) اور بقول صاحب تحفۃ الابرار شیخ سلطان محمود المتوفی ۹۹۷ھ (جو شیخ مبارک خیر محمدی چشتی المتوفی ۹۸۳ھ کے مرید اور شاہ اڈھن جونپوری المتوفی ۹۷۶ھ اور شاہ عبدالسلام مذکور کے خلیفہ تھے کمافی النفحات) کے خلیفہ تھے، ملا عزیز اللہ کا بیان ہے کہ ہمارے والد شیخ حسین (المتوفی ۱۰۰۸ھ) ان کی صحبت سے بہرہ ور ہوتے تھے، وہ (شاہ طیب

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور انھوں نے العبد الصالح المحمر الصوفی کے اوصاف کے ساتھ ان کا نام لیا ہے، شیخ عبداللہ لاہوری نے مدینہ منورہ میں ۱۱۰۵ھ میں وفات پائی (الامم ص۵) اور شیخ ابراہیم کردی نے ۱۱۰۲ھ میں (انسان العین ص۵) اور خاتمہ امم میں ہے کہ ۱۱۰۱ھ میں یا ۱۱۰۲ھ میں ۱۲ منہ ۔ لہ المتوفی ۱۱۴۵ھ کمافی انسان العین ۱۲ منہ ۔ ۲ المتوفی ۱۰۳۰ھ (مناقب العارفین قلمی) ۳ المتوفی ۹۸۶ھ علی مافی النفحات العنبریہ ۱۲ منہ

بہت معمر اور اجلۂ مشائخ میں سے تھے، ان کو بہت سے اہل اللہ کی زیارت کا شرف حاصل تھا، اب ان کے خلیفہ شیخ الشیوخ شیخ بڈھن ظفرآبادی ہیں جن کا سن شریف اس وقت (یعنی ۱۰۲۵ھ) میں اسی سے زیادہ ہے، میں ان کی زیارت سے بارہا مشرف ہوا ہوں (تحفۃ الابرار قلمی ورق ۲۱)

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۰۲۵ھ سے پہلے شاہ طیب کا انتقال ہو چکا تھا قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ میر سید طیب کی وفات، گیارہویں صدی کے اوائل یا دسویں کے اواخر میں ہوئی ہے

(۱۳) مخدوم دیوان عبد الرشید جونپوری مصنف مناظرہ رشیدیہ، آپ کا ذکر آزاد بلگرامی نے سبحۃ المرجان میں کیا ہے، نیز تذکرہ علمائے ہند وحدائق الحنفیہ ومناقب العارفین وگنج رشیدی ونفحات العنبریہ وغیرہ متعدد کتب میں آپ کے حالات مذکور ہیں، آپ ملا محمود جونپوری کے معاصر وہم سبق اور استاذ الملک ملا محمد افضل جونپوری اور ملا شمس نور بردونوی کے شاگرد رشید تھے اور حضرت مخدوم طیب بنارسی کے چشتی سلسلہ میں خلیفہ تھے، دوسرے بزرگوں سے اجازت و خلافت حاصل تھی، ۱۰۸۳ھ میں آپ کی وفات ہوئی، سال ولادت سنہ [illegible]ھ ہے۔

تذکرہ علمائے حنفیہ میں مذکور ہے

دیوان صاحب نے سند حدیث شریف کی حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی، وقت پڑھنے حدیث شریف کے شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میاں نور الحق! دیوان صاحب حدیث شریف پڑھتے ہیں ہم سنتے ہیں، تم بھی سنتے جانا، دیوان صاحب نے کتب صحاح ستہ شیخ رحمۃ اللہ علیہ کو سنایا اس کے بعد شیخ نے آپ کو سند حدیث شریف کی دی، اس کے بعد دیوان صاحب دہلی سے جونپور تشریف لائے (ص ۱۵۹)

اور نفحات العنبریہ میں ہے کہ "اجازت حدیث آپ کو حضرت شیخ نور الحق بن حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی سے حاصل تھی" (ص ۱۴۲)

(۱۴) مخدوم شاہ طیب بنارسی، منڈواڈیہ (بنارس) میں آپ کا مزار زیارت گاہ خلائق ہے، آپ حضرت تاج الدین جھوسوی کے خلیفۂ ارشد اور مولانا خواجہ کلاں کے مرید تھے، آپ کے

مفصل حالات حضرت شاہ یٰسین صاحب نے مناقب العارفین میں لکھے ہیں، آپ کی وفات ۱۱۲۲ھ میں ہوئی۔

شاہ یٰسین صاحب فرماتے ہیں

وتیکہ برائے زیارت پیراں، شیخ بجانب حضرت دہلی رفتہ بود، شیخ الاسلام قدوۃ الانام استاد المفسرین امام المحدثین حاجی الحرمین الشریفین بندگی میاں شیخ عبدالحق الدہلوی البخاری کہ دراں وقت مقتدائے سلسلہ علیہ قادریہ بود ملاقات واقع شد و وے را شیخ کامل ومکمل یافت وسلسلہ اش صحیح ودرست دید اجازت ایں سلسلہ شریفہ از وے گرفت وخرقہ قادریہ از دست وے پوشید

جس وقت مخدوم صاحب پیران سلسلہ کی زیارت کے لئے دہلی گئے تو وہاں شیخ الاسلام قدوۃ الانام استاد المفسرین امام المحدثین حاجی الحرمین الشریفین بندگی میاں شیخ عبدالحق دہلوی بخاری سے ملاقات ہوئی جو اس وقت سلسلہ عالیہ قادریہ کے پیشوا تھے، ان کو شیخ کامل ومکمل اور ان کے سلسلہ کو درست پایا اس لئے اس سلسلہ کی اجازت ان سے لی اور ان کے ہاتھ سے خرقہ قادریہ پہنا۔

مناقب العارفین میں یہ بھی ہے کہ حضرت تاج الدین جھوسوی کی وفات کے بعد (یعنی ۱۰۳۰ھ کے بعد) مخدوم صاحب دہلی گئے تھے۔

(۱۵) عارف کامل مولانا شاہ عبدالجلیل الہ آبادی خلیفہ حضرت شیخ محمد صادق گنگوہی بھی حضرت شیخ محدث دہلوی کے شاگرد رشید تھے (انوار العاشقین ص۱۰۱)

اس وقت جو نام میری یاد میں تھے ان کو میں نے پیش کر دیا مجھے امید ہے کہ کافی جستجو سے مزید نام بھی مل سکتے ہیں۔

اولاد شیخ محدث

یہ عنوان حیات شیخ عبدالحق میں موجود ہے مگر اس میں اضافہ کی ابھی بہت زیادہ گنجائش

ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ مصنف نے استیعاب کا ارادہ نہیں کیا ہے ورنہ وہ خود اس میں اضافہ کر سکتے تھے، تاہم اس ذیل میں حضرت حافظ محمد محسن قدس سرہ کا نام نہ آنے کی وجہ سے ہم کو بڑی کمی محسوس ہو رہی ہے۔

(۱) حضرت حافظ محمد محسن رحمۃ اللہ علیہ، اور حضرت شیخ محدث کے درمیان کتنے واسطے ہیں ــــــــ اس کی تحقیق تو نہیں ہو سکی، لیکن وہ بالاجماع حضرت شیخ کی اولاد میں تھے، اور کم از کم درمیانی واسطے تین ہوں گے، حافظ صاحب جامع علوم عقلیہ و نقلیہ تھے، اور دہلی میں آپ کے وقت میں علماء فضلائے شہر میں سے کسی کو آپ کے ساتھ برابری کی جرأت نہ تھی، جیساکہ صاحب حدائق الحنفیہ کا بیان ہے۔

باطنی سلسلہ میں آپ عروۃ الوثقی خواجہ محمد معصوم (المتوفی سنہ ۱۰۸۰ھ) کے خلیفہ ارشد تھے، اور خواجہ محمد معصوم حضرت مجدد الف ثانی کے خلف الصدق و خلیفۂ اعظم تھے، حضرت میرزا مظہر جانجاناں قدس سرہ فرماتے تھے کہ جس وقت حضرت سید نور محمد کے پیر حضرت حافظ محمد محسن خواجہ صاحب (خواجہ محمد معصوم) کی خدمت میں استفادہ کے لئے حاضر ہوئے تو خواجہ صاحب نے فرمایا کہ آپ کے بزرگوں نے ہمارے بزرگوں کا (ابتدا میں) انکار کیا تھا، آپ انکار کے ساتھ آئے ہیں یا اقرار کے ساتھ، حافظ صاحب نے کہا کہ بجہت استغفار از انکار (انکار سے عذر خواہی کے لئے حاضر ہوا ہوں) اس کے بعد خواجہ صاحب کی صحبت میں رہ کر درجہ کمال و تکمیل کو پہونچے (مقامات مظہری ص۷۴) اور بقول صاحب حدائق الحنفیہ ورع و تقویٰ و زہد و ریاضت میں یگانۂ روزگار ہو کر خلافت کا خرقہ حاصل کیا (ص۴۴۴)

حضرت حافظ صاحب کے کمالات اور ان کے مرتبہ کی بلندی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ وہ حضرت سید نور محمد بدایونی (حضرت میرزا مظہر جان جاناں کے پیر و مرشد) کے پیر تھے جیسا کہ میرزا صاحب کی زبانی آپ ابھی سن چکے، اور خود سید صاحب بھی ان کا نام یوں لیتے تھے پیر خود حضرت حافظ محمد محسن (ہمارے پیر حضرت حافظ محمد محسن) (مقامات مظہری ص۹)

حضرت شاہ غلام علی دہلوی، سید صاحب کے حال میں لکھتے ہیں

دبخدمت حضرت حافظ محمد محسن کہ ازاولاد شیخ عبدالحق محدث وخلفاء حضرت ایشاں محمد معصوم اند رحمۃ اللہ علیہم رسیدہ سالہا تحصیل فیوض صحبت کردہ بحالات بلند ومقامات ارجمند مشرف شدہ اند (مقامات مظہری ص۸)	اور حضرت حافظ محمد محسن (جو شیخ عبدالحق محدث کی اولاد میں اور حضرت خواجہ محمد معصوم کے خلفاء میں تھے) کی خدمت میں برسوں رہ کر صحبت کے فیوض حاصل کئے اور بلند حالات ومقامات سے مشرف ہوئے۔

خود سید صاحب فرماتے ہیں کہ میں ایک دن اپنے پیر حضرت حافظ محمد محسن کے مزار کی زیارت کو گیا، مراقبہ کیا تو معلوم ہوا کہ بدن شریف اور کفن بالکل درست ہے، ہاں پیر کے تلوے کے چمڑے اور اس جگہ کے کفن پر مٹی کا اثر ہو گیا ہے، وجہ پوچھی تو فرمایا کہ تم کو معلوم ہو گا کہ ایک اجنبی کا پتھر وضو کی جگہ ہم نے اس ارادہ سے رکھ لیا تھا کہ جب اس کا مالک آجائے گا تو اس کو دے دیں گے، اتفاق سے ایک بار اس پر ہم نے قدم رکھ دیا تھا، اسی کام کی نحوست سے مٹی کا یہ اثر ہو گیا ہے (مقامات مظہری ص۹)

حضرت حافظ صاحب کی وفات ۱۱۷۴ھ میں ہوئی، (حدائق ص۴۴۴ وتذکرہ علمائے ہند ص۲۱۲) مزار حضرت شیخ محدث کے قبرستان میں ہے (مزارات اولیائے دہلی)

ان مختصر حالات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت شیخ محدث کی اولاد میں حضرت حافظ محمد محسن کی شخصیت بڑی اہم شخصیت ہے، حضرت میرزا مظہر جانجاناں اور حضرت شاہ غلام علی قدس سرہما کے سلسلہ سے ہند و بیرون ہند میں جتنے حضرات صوفیہ وابستہ ہیں، حافظ صاحب ان سب کے شیخ الشیوخ ہیں، اور اس لحاظ سے اولاد شیخ عبدالحق میں ان کا نام کسی طرح نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں ہے، اسی طرح چند اور نمایاں ہستیاں بھی ہیں جن کا ذکر اس سلسلہ میں مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۲) حضرت شیخ محمد احسان رحمۃ اللہ علیہ، خلیفہ حضرت میرزا مظہر قدس سرہ، آپ کی نسبت شاہ غلام علی صاحب فرماتے ہیں۔

از قدمائے اصحاب و کمّل خلفائے حضرت ایشاں از اولاد حضرت حافظ محمد محسن در نسب بشیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہم میرسند (مقامات مظہری ص۱)

حضرت میرزا مظہر جان جاناں کے قدیم اصحاب اور کامل ترین خلفا میں اور حضرت حافظ محمد محسن کی اولاد سے تھے، نسب میں شیخ عبدالحق سے ملتے ہیں۔

(۳) شیخ غلام حسن رحمۃ اللہ علیہ، خلیفہ حضرت میرزا مظہر قدس سرہ، آپ کی نسبت مقامات مظہری میں مذکور ہے کہ شیخ محمد احسان کے بھائیوں میں تھے، حضرت میرزا صاحب قدس سرہ کے زبدۂ احباب اور مخصوص اصحاب میں آپ کا شمار ہے (ص۲)

(۴) شیخ مقرب اللہ، اب ہم ایک ایسی ہستی کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو جسمانی حیثیت سے ان کی اولاد میں شمار ہوتی ہے اور علمی حیثیت سے ان کے مسند کی وارث ہے، شیخ مقرب اللہ کا سلسلۂ نسب یہ ہے، شیخ مقرب اللہ بن جاراللہ بن نوراللہ بن نورالحق بن شیخ عبدالحق میرزا محمد بدخشی نے آپ کو العلامۃ المتفنن (مختلف فنون کے ماہر علامہ) کے اوصاف کے ساتھ ذکر کر کے لکھا ہے کہ آپ نے دہلی میں رمضان ۱۱۳۳ھ میں وفات پائی، اس وقت آپ کی عمر تقریباً ساٹھ برس تھی اس کے بعد لکھا ہے

وھو اول من قرأت علیہ الحدیث (تاریخ محمدی) [1]

وہ پہلے شخص ہیں جن کے پاس میں نے حدیث پڑھی

(۵) مولانا مفتی اکرام الدین المتخلص بہ حیرانؔ سلسلۂ نسب یہ ہے، اکرام الدین بن مولوی نظام الدین بن مولوی محب الحق بن شیخ نورالحق ثانی بن شیخ محب اللہ بن شیخ نوراللہ بن شیخ نورالحق بن شیخ عبدالحق۔

[1] "معارف" اگست ۱۹۴۷ء

دہلی میں ۱۱۹۱ھ میں پیدا ہوئے، علوم عقلیہ و نقلیہ اپنے والد اور مولوی حافظ محمد کاظم، و مولوی فائق علی (شاگرد بحر العلوم مولانا عبد العلی) و مولوی مدن و مولوی سدن و مولوی خواجہ احمد جالندھری سے حاصل کئے

آپ کے والد مولوی نظام الدین میرزا جہاندار شاہ جواں بخت کے استاد اور اتالیق تھے، آپ کے دادا مولوی محب الحق اور ان کے والد شیخ نور الحق ثانی اور اپنے زمانہ میں خود مفتی اکرام الدین پانی پت کے عہدۂ قضا اور دہلی کی مسند افتار پر متمکن رہے۔

نواب سید علی حسن خاں لکھتے ہیں کہ ان کی جلالت شان کے لحاظ سے شاعری ان کے مرتبہ سے بہت فروتر چیز ہے تاہم موزونی طبیعت کی بنا پر نکتہ سنج شاعر تھے، ایک ہزار بیت سے زیادہ پر مشتمل ایک دیوان ان کی یادگار ہے (صبح گلشن ص۱۴۵)

اساتذۂ شیخ محدث

اس عنوان کے تحت ہم کو یہ گذارش کرنا ہے کہ ہندوستان میں حضرت شیخ نے جن دانش مندوں سے علم حاصل کیا ہے ان کے نام تو معلوم نہیں ہو سکے، لیکن حجاز میں شیخ عبدالوہاب متقی کے سوا دیگر علمائے وقت کے سامنے بھی شیخ محدث نے زانوئے تلمذتہ کیا ہے اور ان سے حدیث کی سند لی ہے، جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں،

دبا جازت نامۂ عام و شامل و کامل تمامہ کتب احادیث و سائر علوم دینیہ از علمائے کرام آں عالی مقام .... مشرف و فائز گشتہ (تالیف ص۱)

شیخ عبدالوہاب متقی کے ساتھ ان علمائے کرام کا تذکرہ بھی ہونا چاہیے تھا، ہم کو ان میں سے ایک محدث کا نام پہلے پہل حدائق الحنفیہ کے ذریعہ معلوم ہوا ہے، اس لئے اس جگہ پہلے حدائق کی عبارت نقل کرتے ہیں۔

(۱) شیخ علی بن جار اللہ قرشی خالدی مخزومی مکی، خالد بن ولید کی اولاد میں مکہ معظمہ میں رہتے تھے

اپنے وقت کے فقیہ فاضل، محدث کامل، مفتی وخطیب مکہ تھے، آپ ہی تھے جو اس وقت صحیح بخاری کا جیسا کہ چاہئے درس علی الاطلاق دے سکتے تھے، فصاحت وبلاغت اور سلاست طبع ونظافت تقریر وتحریر اور حسن خلق میں دستگاہ کامل رکھتے تھے علاوہ اس کے درویشوں کی محبت اور اعتقاد مشائخ اور قلت طعام اور ریاضت نفس میں بھی آپ کو بہرۂ وافر حاصل تھا، تمام روز حصائے حرم شریف پر بیٹھ کر امور دینیہ ومقاصد علمیہ کو انجام دیتے، اور افتار وتدریس میں مصروف رہتے تھے، اکابر وشرفار کی تزویج وخطبہ خوانی میں بھی آپ ہی سے لوگ تبرک چاہتے تھے، صرف آپ اور آپ کے والد بزرگوار حنفی المذہب تھے، اور سب قوم آپ کی شافعی تھی، آپ کو فتوے کے کتاب دیکھنے کی کچھ احتیاج نہ ہوتی تھی۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے کتب احادیث خصوصاً صحیح بخاری آپ ہی سے پڑھی اور احادیث کی سند حاصل کی، کئی دفعہ صحیح بخاری کے مذاکرہ کے وقت شیخ عبدالحق سے فرماتے تھے کہ بجز اجو تم نے مجھ سے حاصل کیا ہے اس سے فائدہ لینا میرا زیادہ ہے شیخ علی بن جاء اللہ کو شیخ علی متقی سے نہایت اعتقاد تھا اور انھوں نے آپ کو اپنا خرقہ بھی مرحمت فرمایا تھا۔ آپ شیخ عبدالوہاب سے بھی بڑی محبت رکھتے تھے (حدائق الحنفیہ ص۴۰۲)

غالباً یہ حالات مصنف حدائق نے زاد المتقین سے لئے ہیں، زاد المتقین میرے پاس نہیں ہے۔ مصنف حیات شیخ عبدالحق نے جابجا زاد المتقین کے حوالے دیئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تصنیف کے وقت وہ کتاب ان کے پیش نظر تھی، پھر تعجب ہے کہ اس باب میں انھوں نے اس سے کیوں مدد نہیں لی۔

فقیر راقم الحروف کے مطالعہ سے حضرت شیخ عبدالحق کا ایک قلمی رسالہ گذرا ہے، جس کا نام اس کے سرورق پر ثبت الشیخ عبدالحق الدہلوی لکھا ہوا تھا، میرا خیال ہے کہ وہ وہی رسالہ ہے جس کا نام شیخ نے فہرس توالیف میں اجازۃ الحدیث فی القدیم والحدیث لکھا ہے اس میں خود شیخ نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ مجھ کو زبانی تو بہت سے علماء سے سند حاصل ہے،

مگر چار بزرگوں نے تحریری سند عنایت فرمائی ہے ان میں مرتبہ کے لحاظ سے اول اور برکت میں سب سے زیادہ اور کرامت میں سب سے افضل شیخ عبدالوہاب متقی ہیں، ان کے بعد قاضی علی بن جار اللہ پھر شیخ ابو الحرم مدنی اور ان کے بعد شیخ حمید الدین سندھی، قاضی علی بن جار اللہ نے شیخ دہلوی کو جو اجازت نامہ مرحمت فرمایا ہے اس کی نقل بھی اس رسالہ میں موجود ہے، اس اجازت نامہ میں بھی ان کا یہ فقرہ موجود ہے کہ جتنا استفادہ شیخ نے مجھ سے کیا ہے، اس سے زیادہ میں نے شیخ سے استفادہ کیا ہے، یہ اجازت نامہ قاضی علی نے ۹۹۹ھ میں شیخ کو دیا ہے قاضی نے خود اپنا نام و نسب یوں لکھا ہے علی بن محمد جار اللہ بن محمد امین بن ظهیرة القرشی المکی المخزومی

اور حضرت شیخ نے ان کا نام اس طرح لیا ہے اعلم العلماء و اعظم الفقهاء فی وقته فی ذلك المقام القاضی علی بن جار اللہ بن ظهیرة القرشی المکی المخزومی الحنفی

شیخ دہلوی کے تیسرے شیخ الحدیث ابو الحرم مدنی ہیں، شیخ دہلوی ان کا نام یوں لیتے ہیں اکبر فقهاء مدینة الرسول علما و سنا و برکة شیخ الشیوخ الشیخ احمد ابو الحرم شیخ ابو الحرم نے حدیث کی سند شیخ دہلوی کو یکم شعبان ۹۹۸ھ میں عنایت فرمائی ہے ان کا اجازت نامہ اس رسالہ میں منقول ہے، شیخ ابو الحرم نے اجازت نامہ میں اپنا یوں ذکر کیا ہے احمد بن محمد بن محمد ابو الحرم المدنی

شیخ محدث کے چوتھے شیخ حمید الدین سندھی ہیں، یہ بزرگ قاضی عبداللہ سندھی کے لڑکے اور شیخ رحمت اللہ سندھی مصنف لباب المناسك و المنسك الکبیر مسمی بجمع المناسك و نفع الناسك وغیرہما (المتوفی ۹۹۳ھ) کے بھائی تھے۔ شذرات الذہب میں ان کی نسبت مذکور ہے کان ایضاً من اهل العلم و الصلاح حسن الاخلاق کثیر التواضع ظاهر الفضل جلیل القدر یعنی وہ اہل علم و صلاح خوش اخلاق کثیر التواضع اور نمایاں صاحب فضل اور عظیم المرتبہ تھے، یہ بھی لکھا ہے کہ ان سے شیخ ابن علان کے پوتے شیخ محمد علی نے بھی علم حدیث حاصل کیا، اور تذکرہ علمائے ہند میں ہے۔

"شیخ حمید برادر شیخ رحمت اللہ سندھی ولد قاضی عبداللہ بن قاضی ابراہیم ساکن در ہیلہ بجاندوالا موصوف ددر علوم عقلی و نقلی حظ وافی و در علم حدیث و تفسیر ید طولیٰ داشت ہمراہ خان اعظم کوکہ بمکہ معظمہ رفتہ مقتدائے اہل حدیث شد (ص ۳۶۳)

شیخ دہلوی نے ان کو ان القاب سے یاد کیا ہے، الشیخ العالم العامل تذکرۃ السلف المعول علیہ وبقیۃ المشائخ المحدثین مولانا الشیخ حمید الدین ابن القاضی عبداللہ السندی المدنی، شیخ حمید الدین کا اجازت نامہ بھی اس رسالہ میں شامل ہے اس کے بعد تین چار باتیں اور بھی گذارش کرنی ہیں۔

(۱) حیات شیخ عبدالحق میں ایک عنوان ہے" دسویں صدی ہجری میں علم حدیث ہندوستان میں" اس کے ماتحت فاضل مصنف نے بہت قیمتی معلومات پیش کئے ہیں، مگران کے اس فقرہ سے ہم کو اختلاف ہے کہ" دسویں صدی ہجری میں یو۔پی، دہلی پنجاب کے سارے علاقہ میں صرف دو محدثین کے نام نظر آتے ہیں، حاجی ابراہیم قادری اور مولانا اسمٰعیل لاہوری (حیات شیخ عبدالحق ص ۲۱)

ہم نے خاص اس نقطۂ نظر سے تاریخ وکتب تذکرہ کا پورا جائزہ تو نہیں لیا ہے، پھر بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ دسویں صدی میں اس پورے علاقہ کے اندر محدثین کی تعداد اس سے بہت زیادہ تھی، جتنی فاضل مصنف بیان کر رہے ہیں، مجھے اس وقت تلاش اور جستجو کی فرصت نہیں ہے تاہم چند نام جو پہلے سے میرے ذہن میں ہیں ان کو اس دعوے کے ثبوت میں پیش کر رہا ہوں

(۱) سید رفیع الدین محدث ساکن آگرہ، ان کا ذکر تذکرہ علمائے ہند ص ۶۵ حدائق الحنفیہ ص ۳۷۷ اور تقصار ص ۱۷۱ میں ہے حدیث میں حافظ سخاوی کے شاگرد تھے، صاحب حدائق نے لکھا ہے کہ حافظ سخاوی نے پچاس سے زائد کتابوں کی سند ان کو پہلے ہی لکھ کر بھیج دی تھی، اس کے بعد آپ ان کی خدمت میں پہنچے اور بالمشافہہ حدیث کو ان سے سنا اور مدت تک تلمذ کیا، آپ کی وفات ۹۵۴ھ میں ہوئی، مزار آگرہ میں ہے۔ (باقی)

افغانوں میں اشاعتِ اسلام کی ابتدا اور اُس کے اسباب

از

(مولوی عبدالرزاق صاحب مرحوم)

مولوی عبدالرزاق صاحب مرحوم مؤلف البرامکہ و نظام الملک طوسی وغیرہ ہماری بزمِ علم کے ایک جانے پہچانے مترجم و مورخ تھے عرصہ ہوا مرحوم نے افغانوں کی قولی اور نسلی تاریخ سے متعلق مآثرِ جلالی وغیرہ مشہور افغانی تاریخوں سے مدد لے کر ایک مفید کتاب مرتب کی تھی جو ابھی تک طبع نہیں ہو سکی، زیرِ نظر مضمون اسی کتاب کا ایک باب ہے۔ "برہان"

گذشتہ اوراق میں بحوالۂ مخزنِ افغانی آپ یہ پڑھ چکے ہیں کہ جب حجاز کے بنی اسرائیل میں اسلام پھیل گیا تو حضرت خالد بن ولید قریشی نے غور کے اسرائیلوں کو دعوت نامہ بھیجا اور مدینہ منورہ میں ایک وفد حاضر ہوا، جس کا سردار قیس عبدالرشید تھا، چنانچہ قیس کا واقعہ جس تفصیل سے پُرجوش الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اُس کی شان مثل ایک حدیثِ نبوی کے ہے اور جس قدر واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ سب ایک فخریہ داستان ہے جس کو تاریخِ اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیوں کہ عہدِ رسالت اور خلافت کی صحیح تاریخ مکمل ہے اور ایک ایک دن کا روزنامچہ موجود ہے جس میں یہ واقعہ کنایۃً بھی درج نہیں ہے[1] ایسی حالت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قیس کو "ملک" کا خطاب عطا فرمانا اور عبدالرشید نام رکھنا اور بہ حوالۂ وحی یہ ارشاد ہونا کہ عبدالرشید کی ذات کشتی کے اس تختہ کے مشابہ ہے جو بنائے کشتی ہوتی ہے اور جس کو بہ لفظ "بطان" یاد کیا گیا ہے

---

[1] مطابق تنقیح نمبر ۲ - حرف ب -

(اور یہی لفظ "پٹھان" کا مادہ اشتقاق بیان کیا جاتا ہے) یہ ایک مصنوعی حدیث ہے۔ خدا اس کو آتش جہنم سے بچائے جو اس حدیث کا راوی ہے۔

خالد بن ولید کا یہودی ہونا محض افترا ہے اور قیس کا نام "عبدالرشید" رکھا جانا یہ بھی غلط ہے یہ نام عرب میں ٹکسال باہر ہے اور تیسری صدی سے قبل یہ نام تاریخوں میں نہیں ملتا۔ اب ہم حضرت خالد قریشی کے حالات نقل کرتے ہیں جس کی خاص ضرورت ہے۔

خالد بن الولید قریشی

کتب سیر میں یہ صراحت درج ہے کہ حضرت خالدؓ بن الولید ۸ھ میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور فتح مکہ (۸ھ) میں بلا شبہ وہ شریک تھے اور ایک دستہ فوج کے افسر تھے۔ اس مہم[1] کے فراغ کے بعد حضرت خالد اشاعت اسلام کے لئے ہمدان روانہ کئے گئے، یہ ایک یمنی قبیلہ تھا، جس میں وہ عرصہ تک مقیم رہ کر اسلام کی اشاعت کرتے رہے۔ بعد ازاں ۱۰ھ میں وفد بنی الحارث کے ہمراہ روانہ کئے گئے۔ ان واقعات کے علاوہ اشاعت اسلام کی غرض سے کسی دوسرے مقام پر اُن کا جانا ثابت نہیں ہے اور نہ افغانوں میں حضرت خالد کے ذریعہ اُسے اسلام کی اشاعت ہوئی ہے اور نہ ان کی دختر سے قیس عبدالرشید کا نکاح ہوا ہے کیوں کہ عرب رشتہ ازدواج میں حد سے زیادہ محتاط ہیں اور غیر کفو میں انھوں نے کبھی رشتۂ ازدواج قائم نہیں کیا۔ حیات افغانی کی یہ روایت محض غلط[2] ہے مورخین کے بیان کے مطابق وہ دوسرے خالد ہیں جو افغانوں کے مورث اور اشاعت اسلام کے بانی قرار دئے گئے ہیں۔ واقعات کی صحت کے لئے حضرت خالد قریشی کا شجرۂ نسب پیش کیا جاتا ہے

---

[1] ملاحظہ ہو طبقات ابن سعد واقعات ۸ھ، حضرت خالد کا مشرف بہ اسلام ہونا،

[2] زاد المعاد۔ خدمات وفود

[3] ملاحظہ ہو صفحہ ۱۱۲۔ حیات افغانی

یہ سلسلۂ پدری ہے۔ جس میں جلیل الشان اصحاب پیدا ہوئے اور خالدؓ کی والدہ لبابۃ الصغریٰ ہیں جو حارث بن حرب ہلالیہ کی دختر ہیں اور لبابۃ الکبریٰ کی سگی بہن ہیں، جو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی زوجہ ہیں، اور دوسری بہن حضرت میمونہ ازواجِ مطہرات نبی کریم میں داخل ہیں یہ قریش کا اعلیٰ طبقہ ہے۔

مدینہ میں دوسرا خالد بن عقبہ بن ابی معیط اور تیسرا خالد ولید بن عتبہ تھا اور یہ دونوں دشمنِ اسلام یہودی تھے، جن کے حق میں نبی کریم نے بددعا کی تھی۔

خالد قریشی کے علاوہ ایک دوسرا خالد تھا جس کی نسل سے افغانستان میں تین بڑے خاندان عالم وجود میں آئے اور پھر ان سے سیکڑوں قبیلے پیدا ہوئے، لیکن اس واقعہ کا تعلق فتوحاتِ خلافتِ راشدہ سے ہے جس کی مختصر کیفیت حسب ذیل ہے۔

[1] الاصابہ فی تمیز الصحابہ - ابن حجر - مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۶ء

فتوحاتِ سیستان و مُکران عہدِ خلافتِ فاروقی

ہندوستان میں اسلامی فتوحات[1] کا زمانہ امیر المومنین فاروقِ اعظم کے عہدِ سعادت سے شروع ہوتا ہے۔ ممالکِ عجم میں جب نہاوند فتح ہوگیا اور اسلامی قوت مستحکم ہوگئی تو ۲۳ھ/۶۴۳ء میں امیر المومنین نے عمرو بن العاص تمیمی والیِ بصرہ کو حکم دیا کہ "وہ سجستان (سیستان و نیمروز) پر فوج کشی کرے" اور اعانت کے لئے اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ کو روانہ کیا، چنانچہ اسلامی لشکر راستہ صاف کرتا ہوا زرنج (دارالحکومت سجستان) تک پہنچ گیا۔ اور ایک مقابلہ کے بعد سجستان پر قبضہ ہو گیا۔ سیستان کا رقبہ بہت بڑا تھا۔ اس کے فتح ہونے سے قندھار اور سندھ اور ممالک ترکستان (بلخ و بخارا) تک راستہ صاف ہو گیا۔ زرنج سے ملتان تک دو مہینے کی مسافت ہے۔ اس مہم کے بعد حکم بن عمر تغلبی کے نام فتح مُکران[2] کا فرمان صادر ہوا۔ جن کی اعانت کے لئے حضرت عمرؓ نے شہاب بن مخارق، سہیل بن عدی اور عبداللہ بن عبداللہ کو روانہ کیا، چنانچہ لشکر اسلام نہر دُوین تک پہنچا۔ مُکرانی نہر کے کنارے جمع ہوئے، راسل شاہ مُکران نے سندھ کے راجہ رتبیل سے مدد طلب کی، اُس نے ایک بڑا لشکر بھیجا۔ اب متفقہ قوت سے نہر عبور کر کے مُکرانیوں نے صف آرائی کی اور ایک زبردست مقابلہ کے بعد راسل کو شکست ہوئی۔ حکم نے مُکران پر قبضہ کر لیا۔ بہ تعداد کثیر مالِ غنیمت ملا، جس کا خمس مدینہ بھیجا گیا۔ اس مہم میں چند ہاتھی بھی گرفتار ہوئے تھے اُن کی نسبت حکم ہوا کہ "فروخت کر دئے جائیں اور زرِ ثمن مجاہدین پر تقسیم کر دیا جائے۔" صُحار عبدی نامۂ فتح لے کر مدینہ روانہ کئے گئے۔ سپہ سالار کا ارادہ آگے بڑھنے کا تھا، مگر حضرت عمرؓ نے قاصد سے ملک کے

---

[1] تاریخ الکامل۔ ابن اثیر۔ جلد ۳۔ صفحہ ۱۷۔ ۱۸ و ناسخ التواریخ جلد ۴ صفحہ ۲۶۴

[2] مُکران۔ موجودہ بلوچستان کے ایک حصہ کا نام ہے جو خانِ قلات کا ایک مقبوضہ ہے۔ مُکران کا علاقہ حدود ایران سے ہمیشہ خارج رہا ہے جو کرمان کا والی ہوتا تھا وہی مُکران کا خراج وصول کرتا تھا قدیم مُکران کا علاقہ کرمان اور سندھ کے مابین تھا۔ چنانچہ کرمان، سیستان اور مُکران گورنمنٹ ایران کے سرحدی اضلاع تھے دولت ساسانیہ کی کمزوری سے اس زمانہ میں یہ علاقہ مرزبانوں (صوبہ دار یا اعلیٰ تعلقہ دار) کے قبضہ میں تھا مُکران سے منصورہ (سندھ) کا ۱۰۷۴ میل کا فاصلہ ہے خلافت فاروقی کی فتوحات کی یہ آخیر حد تھی (طبری و یاقوت وغیرہ)

طبعی حالات دریافت کیے چونکہ صُحار تمام ملک کو اچھی طرح دیکھ چکے تھے لہذا انھوں نے بڑی فصاحت سے ملکی حالات کا بیان کیا اور وہ الفاظ حسب ذیل ہیں:-

"یا امیر المومنین ارضٌ سہلہا جبلٌ وماءُھا وشلٌ وتمرھا دقلٌ وعدوھا بطلٌ وخیرھا قلیلٌ وشرُّھا طویلٌ والکثیر فیھا قلیلٌ والقلیل فیھا ضائع وما وراءھا شرٌّ منھا۔"

حضورِ عالی! اس ملک کی نرم زمین بھی پہاڑ کی طرح سخت ہے، پانی کی قلت ہے کھجوریں خراب ہیں، دشمن دلیر ہے، خوبیاں کمتر اور برائیاں اکثر ہیں اس ملک میں جرار لشکر بھیجا جائے تب بھی کم ہے اور قلیل فوج کو بھیجا تو اس کو برباد کرنا ہے (کیوں کہ رسد کا انتظام کرنا بہت مشکل ہے)، اور آگے بڑھ کر (سندھ کا علاقہ مراد ہے) تو اس ملک کی حالت اور بھی خراب ہے"

یہ حالات سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ صُحار! اظہارِ واقعات میں قافیہ بندی اور شاعری کی کیا ضرورت ہے؟ صحار نے عرض کیا کہ امیر المومنین! جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ واقعات ہیں۔ یہ سُن کر آپ خاموش ہو گئے اور جب ملک کی طبعی حالت معلوم ہو گئی تو حکم دیا کہ مکران (بلوچستان) سے آگے فوجیں ہرگز نہ بڑھیں"۔

اس حکم کے مطابق جانب ہندوستان پیش قدمی رک گئی لیکن افغانستان اور سندھ کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔ اور سندھیوں پر مسلمانوں کی ہیبت چھاگئی لیکن فتح مکران کے بعد ہی چہار شنبہ ۲۶ ذی الحجہ میں $\frac{۲۳ھ}{۶۴۴ء}$ میں فاروق اعظم کا وصال ہو گیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے۔ اس عہد یعنی $\frac{۳۱ھ}{۶۵۱ء}$ میں ایشیائی فتوحات کے لئے امیر عبداللہ بن عامر کا انتخاب ہوا۔ اس سپہ سالار نے سب سے اول عہد شکن خراسانیوں پر فوج روانہ کی اور خود اس کا اہتمام کیا اور اپنے نائب احنف بن قیس کو آگے بڑھایا جس نے نیشاپور، قہستان

[1] گزیدہ حمداللہ مطبوعہ لندن ۱۹۱۰ء صفحہ ۲۷۔

سرخس، ہرات، بادغیس، غور، مرورود، طالقان اور غرجستان[1] (غور کی آبادیاں) پر قبضہ کر لیا حاکم طوس نے اطاعت قبول کی اور پورا صوبہ خراسان کا سیستان کے ڈانڈے تک خلافت اسلامی کا باج گزار بن گیا اور قیس بن ہاشم خراسان کا والی (گورنر) مقرر ہوا۔ سجستان پر بھی قبضہ ہو گیا اور عبدالرحمن بن سمرہ یہاں کا حاکم مقرر ہوا، جس نے اپنے عہد حکومت میں کابلستان اور زابلستان تک فتح کر لیا اور ہماری رائے میں یہی زمانہ ہے جب غور کے قبائل نے مذہب اسلام قبول کیا ہے۔

امیر معاویہ کے عہد میں عبدالرحمن بن سمرہ نے کابل پر فوج کشی کی اور ۶۱ھ میں واقعہ کربلا پیش آیا اور اس کے ایک سال بعد ۶۲ھ میں یزید بن معاویہ[2] نے سلم بن زیاد بن امیہ کو خراسان و سجستان کا والی مقرر کیا اُس وقت تک یہ ملک اگرچہ فتح ہو چکا تھا مگر یہ پہاڑی قومیں بغاوت سے باز نہ آتی تھیں لہٰذا سلم نے غور، بادغیس اور کابل پر فوجیں روانہ کیں اور ان قوموں کو مطیع بنایا اور خالد بن عبداللہ کو کابل کا عامل مقرر کیا۔

مورخین کی رائے ہے کہ یہ خالد یا تو حضرت خالد بن ولید کی نسل سے تھا یا خاندان ابوجہل سے تھا لیکن حکومت نے جب خالد کو معزول کر دیا[3] تو وہ عرب کو واپس نہیں گیا اور کوہ سلیمان میں آباد ہو گیا۔ چنانچہ مورخ فرشتہ[4] لکھتا ہے کہ

"چوں خالد بن عبداللہ از حکومت کابل معزول گشت مراجعت بہ عراقِ عرب شاق و دشوار تر دانستہ از بیم حاکم مجدد با عیال و اطفال و جماعتے از مردم عرب بہ رہنمونی اعیانِ کابل بہ کوہ کہ مابین ملتان و پشاور است، رفتہ متمکن شد و دختر خود را بہ حبالۂ نکاح یکے افغاناں معتبر کہ مسلمان شدہ بود در آورد۔ و از آں دختر فرزنداں بہ وجود آمدہ از ایشاں دو کس بہ مزید شہرت امتیاز

---

[1] جو علاقہ دریائے مرغاب پر غور کرکے متصل واقع ہے وہ غرجستان کہلاتا ہے۔ ۴۰۳ھ میں محمود غزنوی کے سپہ سالار التونتاش اور ارسلاں جاذب نے اس پر مستقل قبضہ کیا تھا۔[2] کامل بن اثیر جلد ۳۔ صفحہ ۱۷
[3] مقدمہ تاریخ فرشتہ جلد اول [4] ایضاً

یافتند یکے لودی و دیگر سور و طائفہ افغانانِ لودی و سور ازاں جماعت اند۔"

افسوس ہے کہ کسی مورخ نے خالد بن عبداللہ کا نسب نامہ اور آگے تک نہیں لکھا ورنہ خالد کے نسب کا قطعی فیصلہ ہو جاتا۔ لیکن نواب عبدالسلام خاں صاحب کا یہ فیصلہ ہے کہ یہ خالد حضرت عبداللہ بن سلام کے بیٹے تھے اور عبداللہ بن سلام یہودانِ خیبر کے سردار تھے اور بنی اسرائیل میں ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہ تھا اور اسلام لانے سے ان کے حقوق بھی بڑھ گئے تھے۔

یہ قیاس صحیح معلوم ہوتا ہے اور محض ہم نام ہونے کی وجہ سے عام روایت کی بنا پر افغانوں میں خالد بن عبداللہ کے بجائے خالد بن ولید قریشی کا نام لیا گیا ہے اور اس قیاس کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ مصنف حیاتِ افغانی نے لکھا ہے کہ خالد کی بیٹی سارہ سے قیس عبدالرشید نے شادی کی تھی۔ فرشتہ نے جو روایت لکھی ہے اس میں صرف یہ الفاظ ہیں

"خالد، دختر خود را بہ حبالۂ نکاح یکے از افغانانِ معتبر کہ مسلمان شدہ بود در آورد۔"

اب واقعہ کی صورت یہ قرار پاتی ہے کہ قیس عبدالرشید کے عقد میں خالد بن عبداللہ کی دختر تھی جس کی شادی اسرائیلیوں ہی میں ہوئی۔

ان واقعات کی بنیاد پر قیس عبدالرشید علاقہ غور میں افغانوں میں پہلا مبلغ تھا جس کی تصدیق حاکم کی ایک ضمنی روایت سے ہوتی ہے

"قیس[1] درآں (اشاعت اسلام) چنداں مساعی جمیلہ مبذول داشت کہ قبل از فوتِ او کہ در[2] سال چہلم از ہجری واقع شد جمیع رعایائے او بہ دینِ اسلام در آمدہ بودند۔ ہشتاد و ہفت سال عمر کرد۔ و[3] سہ پسر از وے ماند۔ ہنوز نام وے بہ نیکی مذکور می شود و امرائے افغان کوشش می کنند کہ نسب خود را بہ وے رسانند۔"

---

[1] مسودات نواب عبدالسلام [3] عبدالرشید کے یہ تین بیٹے خالد بن عبداللہ کی دختر سے پیدا ہوئے تھے جو سربن، غور غشت اور بٹن تھے اور ان تینوں کی نسلوں نے غیر معمولی ترقی کی۔ ابو الفضل نے ان لڑکوں کو افغان کی اولاد قرار دیا ہے۔ مخزن افغانی کی روایت کے مطابق افغان بھی ایک مورث اعلیٰ تھا جس کا عبرانی نام شجرہ میں درج نہیں ہے۔ بلکہ صرف "افغان" لکھا ہے لہذا افغان مذکور کو خالد بن عبداللہ سمجھنا چاہیے

اس روایت سے ظاہر ہے کہ عبد الرشید کا ۴۰ھ میں انتقال ہوا۔ چنانچہ ماہ صیام ۴۰ھ میں امیر المومنین علی کرم اللہ وجہ کو عبد الرحمٰن بن ملجم نے شہید کیا۔ یہ خلافت کا اخیر سال تھا۔ اور اس کے قبل افغانستان میں تبلیغِ اسلام کی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ چنانچہ غوریوں کی نسبت طبقات ناصری کی روایت ہے کہ یہ قبائل خلافت چہارم میں اسلام لائے۔ اس عہد میں شنسب غور کا حکمراں تھا مورخ کی اصل عبارت حسب ذیل ہے۔

"شنسب در عہد خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ بر دست علی کرم اللہ وجہ ایمان آورد واز وے عہد و لوائے بستند و ہر کہ از خاندان ایشان بر تخت نشستے آں عہد را کہ امیر المومنین نوشتہ بود بدو دادندے و اد قبول کردے انگہ پادشاہ شدے و ایشاں از جملہ موالی علی بودند و محبت ائمہ و اہل بیت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم در اعتقاد ایشاں راسخ بود۔"

افغانی مورخ قیس عبد الرشید اور شنسب کو بنی عم قرار دیتے ہیں، یہ صحیح نہیں ہے۔ شنسب کا نسب نامہ شداد بن ضحاک پر ختم ہوتا ہے اور قیس اسرائیلی ہے البتہ یہ واقعہ مسلمہ ہے کہ یہ دونوں خاندان قبولِ اسلام میں قریب العہد ہیں۔ یعنی قیس پہلے مسلمان ہوا اور شنسب ۳۵ھ میں اسلام لایا جو خلافت عثمانی کا اخیر سال اور خلافت جناب امیر کا پہلا سال تھا۔

خالد بن عبد اللہ کی اولاد نے افغانستان میں بڑی ترقی کی اور جب غور میں اس جرگہ کی مردم شماری بڑھ گئی تو یہ قبیلے ۱۴۳ھ میں کرماچ، پشاور، کوہاٹ اور بنوں میں آکر آباد ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خراسان سے افغانستان تک اسلام پھیل گیا۔

خالد کی اولاد کے شجرے اس مقام پر نقل کرنا خارج از بحث ہے جو حضرات تاریخی نقطہ نظر سے دیکھنا چاہتے ہوں وہ کتاب حیات افغانی ملاحظہ فرمائیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور یہ ممکن ہے کہ خالد قریشی کی جو دختر سارہ عبد الرشید سے منسوب ہونا بیان کیا جاتا ہے وہ خالد بن عبد اللہ کی بیٹی ہو گی۔ اسی طرح تاریخ فرشتہ میں بھی اجمال ہے صرف یہ الفاظ ہیں کہ "دختر خود را بہ نکاح یکے از افغانان معتبر کہ مسلمان شدہ بود در آورد۔" ؎ طبقات ناصری طبقہ ۱۷۔ صفحہ ۲۸ و ۲۹۔ اور قبول اسلام سے قبل غور وغیرہ کے باشندے بدھ مذہب تھے۔

سیّد صاحب کی زندگی کے وہ خاص گوشے

جن سے میں متاثر ہوا

(عتیق الرحمٰن عثمانی)

(۲)

میں اس مرحلے پر مرحوم کی بڑی بڑی مصنفات کا نہیں ایک چھوٹی سی تالیف کا ذکر کروں گا
حضرات! "خطبات مدراس" کی حیثیت سید صاحب کی محققانہ اور مبصرانہ ضخیم
تالیفات کے سمندر کے مقابلے میں ایک قطرے سے زیادہ نہیں ہے لیکن غور کیجئے اس قطرے
میں علم و تحقیق کے کتنے دریا سمائے ہوئے ہیں، یہ موتی کتنا آب دار اور تابناک ہے اور علم نبوت
کے آفتاب کی کرنیں اس پر کس شان اور کس انداز سے پڑ رہی ہیں، ۱۵۶ صفحات کا یہ کتابچہ
صرف آٹھ خطبوں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ ہے جو غالباً ۲۵ء میں اسلام، پیغمبر اسلام اور آنحضرت
کے پیغام پر مدراس کے "لالی ہال" میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے دیے گئے تھے، ان خطبوں کو
جتنی بار پڑھا جاتا ہے مرحوم کی حیرت انگیز علمی بصیرت اور انداز فکر و تحقیق کی داد دینے کو جی
چاہتا ہے ــــــ یہ ظاہر ہے کہ ان اٹھائیس برسوں میں وقت کے تقاضے کہیں سے کہیں پہنچ
گئے ہیں زمانے کی گردش کا رنگ کچھ اور ہی ہو گیا ہے طریق فکر اور اسلوب بیان کے سانچے
یکسر بدل چکے ہیں یہاں تک کہ دلائل و براہین کا جو قالب اب سے ۳۰ - ۴۰ سال پہلے دل پذیر
اور موثر سمجھا جاتا تھا آج بے جان اور افسردہ ہو کر رہ گیا ہے اور دنیا اب وحی و نبوت اور الٰہیات
کے مسائل کو الگ دوسرے ہی ڈھنگ سے سوچنے کی عادی ہو گئی ہے لیکن تیس سال پہلے کے
لکھے ہوئے ان مقالوں کے اسلوب اور طرز استدلال پر گہری نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی
دل نشینی و دل پذیری اور شادابی و شگفتگی آج بھی اسی طرح باقی ہے اور جہاں تک سیرت نبوی

کی خصوصیات اور اسلام کی بنیادی تعلیمات کو یورپ کے ذہن ودماغ سے قریب کرنے اور اُسی لب ولہجہ میں سمجھانے کا تعلق ہے۔ لاریب کوئی دوسرا اندازِ بیان اس سے زیادہ اثر انگیز نہیں ہو سکتا۔[۵۱]

جو شخص بھی خطبات مدراس" اس تشریح کی روشنی میں پڑھے گا، میرے بیان کی بے تامل تصدیق کرے گا۔

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اصلاح وتبلیغ کی راہ کے بعض نہایت ہی اہم اور خاص نکتوں پر بڑی احتیاط سے غور کیا تھا۔ اور وہ ان نکتوں سے پُر حکمت طریقوں سے کام لیتے تھے۔ جب کبھی اسلام اور اس کی عالم گیر صداقت کا ذکر چھڑتا ہے۔ تو ایک خاص طرح کی اُلجھن پیش آتی ہے، ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے۔ اور اس میں انسانی جبلت کی تمام خصوصیتوں کو کچھ اس طرح سمو دیا گیا ہے کہ ہر انسان خواہ وہ دنیا کے کسی گوشے میں آباد ہو۔ ایک مذہب حق کی حیثیت سے اس کو بے تکلف قبول کر سکتا ہے، دوسری طرف دینِ حق اور اُس کی تعلیم کی وسعتوں اور سہولتوں کے دامن کو کچھ اس طرح سمیٹنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ ہماری ہی جیب کے لفافے میں بند ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور امتیاز وتفوق کی اونچی اونچی دیواریں کھڑی کر دی جاتی ہیں۔ قدرتی طور پر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کو اسلام کی وسعتوں اور اس کے بتائے ہوئے نظامِ عمل کی دلکشیوں کو سمجھنے اور ان سے نفع اٹھانے کا موقع نہیں ملتا، حالانکہ ہونا یہ چاہیئے تھا کہ دوسروں پر اس کی رحمت ورافت کے دروازے اس طرح کھلے جاتے کہ وہ بغیر کسی جھجک اور ہچکچاہٹ کے اس کے حریم قدس میں داخل ہو سکتے، حلقۂ اسلام میں داخل ہونے کے بعد فطرت سلیم

---

[۵۱] ان خطبوں کے عنوانات یہ ہیں:- (۱) انسانیت کی تکمیل صرف انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں سے ہو سکتی ہے۔ (۲) عالم گیر اور دائمی نمونہ عمل صرف محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے۔ (۳) سیرت نبوی کا تاریخی پہلو۔ (۴) سیرت نبوی کی کاملیت۔ (۵) سیرت نبوی کی جامعیت۔ (۶) سیرت نبوی کی عملیت۔ (۷) اسلام کے پیغمبر کا پیغام۔ (۸) ایمان اور عمل۔

نئی روشنی کی رہنمائی میں ان کو اس کی اندرونی تعلیم عبادات وغیرہ کے سمجھنے کا اچھی طرح موقع ملے گا۔ وہ جب اس کے منہاج سے مانوس ہو جائیں گے اس کی پابندیوں اور امتیازات خصوصی کو خوشی خوشی قبول کرلیں گے۔

مجھے یقین ہے کہ سید صاحب مرحوم نے تبلیغ حق کے اس گر سے بڑی قابلیت اور دیدہ وری سے کام لیا ہے۔ ان کے مضامین اور تصانیف میں یہ چیز بہت ہی نمایاں نظر آتی ہے۔

حضرات! دیوبند اور ندوہ کے درمیان بُعد و اجنبیت کی داستان اب اگرچہ کہنہ ہو کر طاق نسیاں کے حوالے ہو چکی ہے پھر بھی ہم کو اس کے ماضی سے سبق لینے کی ضرورت ہے۔ تاویلیں خواہ کتنی ہی دل پذیر کی جائیں۔ ندوہ اور دیوبند کا بُعد ایک حقیقت تھا کہ اگر کہا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس بُعد میں کبھی کبھی ایک لطیف قسم کی نفرت کی بو محسوس ہونے لگتی تھی، اور حقائق سے چشم پوشی نہ کی جائے۔ تو اس کے کچھ وجوہ بھی سمجھ میں آتے ہیں۔

اس مرحلے پر بے اختیار مجھے ایک تاریخی بات یاد آگئی، اخلاص و محبت کے اس بے لوث اجتماع میں غالباً اس کا ذکر کچھ زیادہ نامناسب نہ ہوگا۔ واقعات کی تفصیل حضرت سید صاحب مرحوم کی مشہور تالیف حیات شبلی میں موجود ہے۔ میں یہاں اجمالی اشاروں سے کام لوں گا۔

غالباً جون ۱۹۱۲ء کی بات ہے کہ سیرۃ النبیؐ کا مقدمہ ملک کے ایک شہرۂ آفاق ہفتہ وار اخبار میں شائع ہوا اس کا شائع ہونا تھا کہ بعض اہل علم نے جن میں شاید کچھ دیوبند کے خیال کے اصحاب بھی شامل تھے منظم طریقے پر بیگم صاحبہ بھوپال تک یہ شکایت پہنچائی کہ آپ جس چیز کی اعانت کر رہی ہیں وہ دین کی نہیں الحاد کی اعانت ہے۔ سب جانتے ہیں کہ سیرۃ النبیؐ کی ابتدائی ترتیب کے مصارف کیلئے بھوپال کی یہ امداد ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی تھی اسلئے قدرتی طور پر معاملے نے نہایت نازک شکل اختیار کرلی اور اسکے اثرات صورت حال کی پوری نوعیت پر پڑنے لگے، مولانا شبلی مرحوم کے پاس اس کے متعلق سرکاری مراسلہ پہنچا جسکے جواب میں مولانا نے لکھا "سرکار عالیہ کسی مستند عالم کو تجویز فرمائیں تاکہ مسودہ اسکے پاس بھیجدیا جائے" اور مولانا نے اپنی طرف سے اس کام کے لئے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی قدس سرہٗ کا اسم گرامی تجویز فرمایا۔ چنانچہ حضرتؒ کے خادم خاص اور ہمدم دیرینہ مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم اس خدمت کی انجام دہی کے لئے واسطہ بنے اور موصوف نے مولانا شبلی کی

اس خواہش کو حضرت شیخ الہند تک پہنچایا، پھر جو کچھ ہوا یہاں اس کی تفصیل غیر ضروری ہے حالات نے کچھ ایسی کروٹ بدلی، حضرتؒ اس مسودے کو دیکھ نہیں سکے۔ تاہم مولانا شبلی کو پورا اعتماد تھا کہ حضرت شیخ الہند کو مسودہ دیکھنے کا موقعہ مل جاتا تو ممکن نہیں تھا کہ اسکی تحسین نہ کرتے،

یہ بات تو یونہی درمیان میں آگئی مجھے عرض کرنا یہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء کی اجنبیت کے ازالے میں حالات کے جدید تقاضوں کے علاوہ خود حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کا بھی بہت بڑا دخل ہے۔ یعنی سید صاحب کسی روحانی اشارے سے حضرت مولانا تھانویؒ کے حلقۂ ارادت و بیعت میں کچھ اس شان سے داخل ہوئے کہ ان دونوں خیالوں کا تاریخی بُعد ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا اور علم کی فضا دیوبندیت اور ندویت کے غبار سے بالکل صاف ہو گئی۔ دوسرے رموز کی طرح طریقت کا ایک خاص رمز یہ بھی ہے کہ مرشد و مسترشد کے روحانی عواطف میں جبتک کامل ہم آہنگی نہ ہو مرید مرشد کے فیض سے محروم رہتا ہے۔ یا اس میں کم سے کم وہ جلا نہیں آتی ارشاد و تلقین کے اصول کے ماتحت جس کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ پھر جیسا کہ معلوم ہے مولانا تھانویؒ اس باب میں یوں ہی زیادہ با اصول واقع ہوئے تھے چنانچہ مرید نے مرشد کے حکم سے برملا بہت سے معتقدات سے رجوع کیا اور اس شانِ سپردگی سے کیا کہ سنا جاتا ہے حضرت تھانوی سید صاحب کے اس والہانہ اندازِ عقیدت پر وجد کیا کرتے تھے۔ میں تو کبھی کبھی سوچا کرتا ہوں کہ حضرت سید صاحب کی جگہ میں ہوتا تو شاید اتنے بڑے ایثار کے لئے آمادہ نہ ہوتا۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

الاسرب فرد یعدل الالف زائداً
والف ترأهم لا یساوون واحداً

ادبیات

غزل

از
(جناب رَوِش صدیقی)

تماشائے بے تابیٔ دل نہ تھا — مرا حال، ہم رنگ محفل نہ تھا
سرِ جادۂ آرزو، دل کا رُخ — تری سمت تھا سوئے منزل نہ تھا
وہیں تک زبوں حال تھی زندگی — جہاں تک ترا درد شامل نہ تھا
یہ دیکھا کہ شایانِ ذوقِ حیات — تلاطم ہی تھا، امنِ ساحل نہ تھا
کہاں خود فراموشیوں سے نجات — تجھے بھول جانا تو مشکل نہ تھا
مکمل تھی ہر شوخیٔ اجتناب — مرا جذبۂ دل ہی کامل نہ تھا
ترے عہد میں کیوں مٹایا گیا — وہ نقشِ محبت جو باطل نہ تھا
یہاں رہزن و رہ نما ایک تھے — تری راہ میں کون حائل نہ تھا

وہ اب سوچتے ہیں کہ حالِ رَوِش
یہاں تک تغافل کے قابل نہ تھا

رونقِ محفل ہوں میں

۱۳

جناب آلم مظفر نگری

ہوں نمودِ حق اگرچہ جلوۂ باطل ہوں میں
زندگی میں زندگیِ عشق کا حاصل ہوں میں

مرکزِ اسرارِ غم یعنی سراپا دل ہوں میں
روزِ اول سے نگاہِ دوست کے قابل ہوں میں

اپنی بربادی کے ماتم کی نہیں فرصت مجھے
ہم نشیں جب سے شریکِ بے کسیِ دل ہوں میں

کس قدر ہے بے نیازِ ہوش میری بیخودی
اپنی منزل پر ہوں اور گم کردۂ منزل ہوں میں

شورشِ ہستی مجھے دیتی ہے پیغامِ سکون
موجِ ہر طوفاں میں تسکینِ سرِ ساحل ہوں میں

مرحبا اے گرمیِ سوزِ محبت مرحبا
پھونک دینے ہم قسمتِ پروانۂ محفل ہوں میں

رقص کرتی ہے مرے نغموں پہ روحِ کائنات
سازِ نیرنگِ وفا ہوں رونقِ محفل ہوں میں

بے نیازیِ حسن کی شاید ابھی واقف نہیں
حاصلِ ضبطِ فغاں ہوں جذبۂ کامل ہوں میں

میری ہستی پر محبت کو ہے کیا کیا ناز شیں
آپ کی نظروں میں جب سے اعتبارِ دل ہوں میں

دی جوانی زندگی کو میرے سوزِ عشق نے
جس سے پیدا ہوں چمن اس برق کا حاصل ہوں میں

کون ہے عالم میں سوز و ساز کے ہوں کیا خبر
شمعِ بزمِ ناز یا پروانۂ محفل ہوں میں

دیکھتا ہے ذرہ ذرہ آشنا یا نہ مجھے
آپ کی محفل میں گو بیگانۂ محفل ہوں میں

جادۂ ہستی میں ہوں خود ذمہ دارِ عیش و غم
صبحِ منزل اور کہیں شامِ سرِ منزل ہوں میں

روز و شب ہوں اب تو محوِ لذتِ بیدادِ عشق
یا الٰہی وہ نہ سمجھیں خوگرِ مشکل ہوں میں

وقت پر ہر اک تمنا میری بر آتی آلم
زندگی میں پھر بھی محتاجِ سکونِ دل ہوں میں

غزل

از

(جناب برج لال جگی رعنا بی۔ اے)

لہو میں ڈوب کر مثلِ دمِ خنجر نکلتے ہیں
شہیدانِ محبت سرخرو ہو کر نکلتے ہیں

زمانہ نور والوں سے کبھی خالی نہیں رہتا
جو سورج ڈوبتا ہے تو مہ و اختر نکلتے ہیں

اگر ہے عشق صادق تو ہے ترکِ عشق ناممکن
کہ اس کوچے میں جو آتے ہیں وہ مر کر نکلتے ہیں

ظہورِ نورِ حق باطل کے جلوؤں میں نہیں ہوتا
کبھی آبِ یمِ تصویر سے گوہر نکلتے ہیں؟

نہ پوچھو حسرتِ پرواز اس معصوم طائر کی
قفس کی چار دیواری میں جس کے پر نکلتے ہیں

دلِ غمگیں میں تیری یاد یوں سج دھج کے آتی ہے
فلک پر رات کو جیسے مہ و اختر نکلتے ہیں

بقدرِ ضربِ غم دل میں ظہورِ ہوش ہوتا ہے
بقدرِ ہوشِ دل انسان کے جوہر نکلتے ہیں

فروغِ جلوۂ وحدت ہے کثرت اس طرح رعنا
خمِ صہبا سے جیسے سینکڑوں ساغر نکلتے ہیں

العلم والعلماء

یہ بہت بڑے امام حدیث علامہ ابن عبد البر کی شہرہ آفاق کتاب "جامع بیان العلم وفضلہ" کا نہایت نفیس ترجمہ ہے کتاب کے مترجم مشہور ادیب اور بے مثال مترجم عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی ہیں، یہ ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ارشاد کی تعمیل میں کیا گیا تھا جو اب ندوۃ المصنفین سے شائع کیا گیا ہے علم و فضیلتِ علم و علماء پر اس درجے کی کوئی کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی صفحات ۳۰۰، بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت، طباعت بہت عمدہ، قیمت چار روپے آٹھ آنے۔ مجلد پانچ روپے آٹھ آنے

شئون علمیہ

توہم کی کارفرمائی

دس برس ادھر امریکہ کے پروفیسر نفسیات ڈاکٹر ایڈورڈ کایول نے اپنے تین ساتھیوں کو گھر پر مدعو کیا۔ ان میں سے ایک صاحب نامور ریاضی داں ہیں۔ کھانے کے دوران میں ان کے ہاتھ سے نمک گر گیا۔ فوراً ہی انہوں نے ایک چٹکی نمک اپنے بائیں کندھے کی طرف پھینک دی۔ ایک دوسرے صاحب ماہر معاشیات تھے۔ انہوں نے جب شیر خوار بچے کی صحت کا ذکر کیا تو لکڑی کو ہاتھ لگایا۔ اب رہے تیسرے صاحب تو وہ فلسفہ کے ماہر تھے۔ شام کو جب تاش کھیلنے کا وقت آیا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ ہمیشہ نیلے رنگ کے تاش پسند کرتے ہیں کہ یہ "سعد" ہے۔

جب یہ تینوں رخصت ہونے سے قبل ایک جگہ بیٹھے تو میزبان نے "توہمات" کا ذکر چھیڑا۔ تینوں مہمانوں نے بڑے زور شور سے اس انسانی کمزوری سے بری ہونے کا اعلان کیا۔

۱۹۴۴ کی اس دعوت نے ڈاکٹر کایول کو "توہمات کی دنیا" کی سیر پر آمادہ کر دیا۔

ڈاکٹر کایول کے سائنس دانوں کی ایک جماعت ہے جس نے ۱۰ ملکوں میں ڈیڑھ لاکھ سے اوپر لوگوں سے توہمات کے بارے میں سوال کئے۔ انہوں نے مختلف آمدنی اور تعلیم رکھنے والے مردوں اور عورتوں سے سوالات کئے۔

انہوں نے توہمات کی کوئی ۴ ہزار قسمیں قرار دیں اور انسانوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا۔ ایک تو وہ ہیں جو توہمات کو قطعاً نہیں مانتے۔ یعنی منکرین۔ دوسرے وہ جو توہمات پر پورا یقین رکھتے ہیں یعنی معتقدین۔ تیسرے وہ جو کہتے تو یہی ہیں کہ وہ نہیں مانتے۔ لیکن وہ کسی کھانے کی میز پر ۱۳ میں شریک نہیں ہوتے اور نہ کسی سیڑھی کے پیچھے سے گزرنا پسند کرتے ہیں یا اس قماش کی اور باتوں سے گریز کرتے ہیں یعنی مذبذبین ہیں۔

اس عالم گیر تحقیق کی بدولت عجیب وغریب نتائج حاصل ہوئے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اکثر لوگ دو دنیاؤں میں رہتے ہیں۔ ایک دنیا تو منطق اور سائنس کی ہوتی ہے اور دوسری توہمات کی غیر منطقی دنیا۔ صرف دس میں سے تین لوگ قطعیت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ توہم پرست نہیں ہیں۔ دس میں دو ایسے لوگ ہے جو فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ وہ توہم پرست ہیں۔ اس کو کمزوری سمجھتے ہیں۔ لیکن تفنن کے طور پر اس میں مبتلا رہتے ہیں

دس میں دو مذبذبین بھی ملے جو کرنے کو تو انکار کرتے ہیں لیکن عملاً ان تمام توہمات کی پابندی بھی کرتے ہیں۔ اب رہ گئے باقی تین۔ تو وہ توہم پرست ہیں۔ اس کو تسلیم کرتے ہیں۔

بہت مشہور اور بہت پھیلے ہوئے ۲۲۷ توہمات میں سے ۱۴۹ کو بالکل لغو اور مہمل قرار دیا گیا۔ ۱۲ توہمات بے ضرر قرار پائے۔ باقی ۶۸ توہمات کو ضرر رساں قرار دیا گیا جو ماننے والوں کو مشکلات اور پریشانیوں میں مبتلا کر دیتے ہیں اور نقصان مال کا بھی باعث ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر کالڈیول نے اس تحقیق کے دوران میں معلوم کیا کہ توہم پرستی ان پڑھ لوگوں کا خاصہ نہیں ہے۔ کیونکہ مستند توہم پرستوں میں یونیورسٹی کی ڈگریاں رکھنے والے حضرات کی بھی کافی تعداد ہے۔

یہ بھی ایک نظریہ ہے کہ مردوں سے زیادہ عورتیں توہم پرست ہوتی ہیں۔ لیکن اس تحقیق نے اس کی پردہ دری کر دی۔ ڈاکٹر کالڈیول کے سب ساتھیوں نے متفقہ رپوٹ بھی دی کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتیں زیادہ توہم پرست نہیں ہیں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ عورتیں اپنے توہمات میں راسخ زیادہ ہوتی ہیں۔

لطف کی بات یہ ہے کہ تماش بازوں اور جواریوں میں توہم پرستی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ۲۰ مزید توہمات تاش بازوں سے اور ۲۸ جواریوں سے منسوب ہیں۔

قوموں میں چینی سب سے زیادہ توہم پرست واقع ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں کوئی ۲ ہزار ایسے توہمات ہیں جو دوسری قوموں میں نہیں پائے جاتے۔

اہل امریکہ بڑے شگنیئے ہوتے ہیں۔ لاکھوں آدمی کسی سکے، گھوڑے کی نعل، پرانے بٹن، تاگے یا خرگوش کے پاؤں کو بڑا شگنی سمجھتے ہیں۔

ہوائی طبیعیات کے ایک پروفیسر نے شرم کے ساتھ اقرار کیا کہ کوئی ۲۰ سال سے وہ

تپتیا گھاس کی ایک چارپتی والی شاخ کو اپنے ساتھ شگفتی سمجھ کر رکھتے ہیں۔ اور ساتھ ہی تسلیم کیا کہ یہ ایک خالص توہم ہے۔ اس پر ان سے کہا گیا کہ آخر اس کو آپ پھینک کیوں نہیں دیتے؟ اس کا جواب دیئے بغیر وہ رخصت ہو گئے۔

ایسے لوگوں کی بڑی تعداد ہے جو اپنی صحت کا ذکر کریں گے تو لکڑی کا چھونا ان کے لئے ضروری ہے فرش پر سوئی پڑی ہو گی تو وہ ضرور اٹھالیں گے۔ کسی سیڑھی کے نیچے سے گذرنا ہو گا تو کبھی نہ گذریں گے، آئینے ان سے ٹوٹ جائیں تو ان پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔ سڑک پر پیسہ مل جائے تو بہت خوش ہوتے ہیں۔ چھت کے نیچے کبھی چھتری نہیں کھولتے، ہتھیلیاں کھجلائیں تو سمجھتے ہیں کہ کوئی ان کو تحفہ دینے والا ہے۔

اس طبقے میں صنعت و حرفت و تجارت کے کامیاب کپتان، فوجوں کے کمانڈر اور عالمی شہرت کے سیاست داں شامل ہیں۔ دیگر حضرات، اساتذہ، ڈاکٹر، فلسفی اور جوہری سائنس داں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نظم و ضبط کی دنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن اپنے دل و دماغ کے ایک کونے میں توہم کی دنیا بسائے رہتے ہیں۔

بعض اعداد ہمارے دماغوں پر عجیب و غریب طریقہ پر مسلط ہیں چنانچہ عدد دوست (جو بعض عددوں کو بہت پسند کرتے ہیں) اور عدد ترس (جو بعض عددوں سے بہت ڈرتے ہیں) انسانوں میں اتنی کثرت سے پائے جاتے ہیں جس کا وہم و گمان کبھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ اکثر اپنی اس "کمزوری" کو ظاہر ہونے نہیں دیتے۔ چنانچہ نیویارک کے ایک مشہور ڈاکٹر نے اپنے مریضوں اور دوستوں سے راز میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ تقریباً نصف تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو "عدد پرست" تھی۔ اور بہت سے ایسے تھے جو "دن پرست" تھے مثلاً اکثر کاروباری حضرات اہم معاہدوں پر دستخط کرنے کے لئے منگل کے دن کو ترجیح دیتے تھے۔ ایک فرانسیسی مستعمل موٹر فروش نے بیان کیا کہ خریداری کا ارادہ رکھنے والا ہر دوسرا شخص عدد پرست تھا۔ اور کئی موٹروں کے سودے اس وجہ سے ہوئے کہ ان کے رجسٹری نمبر خریداروں کو اپیل کرتے تھے۔

ڈاکٹر کالوِل کی جماعت کے ایک رکن نے ۶۰ دن تک نیویارک کے ایک مشہور ہوٹل کے استقبالی اہلِ کار کی نگرانی کی تو معلوم ہوا کہ اہل کار نے تیرھویں منزل پر تیرھویں کمرے کو پیش کیا تو کسی نے ایک دن بھی اسے قبول نہ کیا، پوری مدت میں وہ کمرہ خالی رہا۔ ساتھ ہی رد کرنے کے طرح طرح کے عذرات پیش کئے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ دنیا بھر میں دستور ہے کہ ایسے بڑے ہوٹلوں میں تیرھویں منزل میں تیرھواں کمرہ ہوتا ہی نہیں۔ سب جگہ یہی دستور ہے کہ کمرہ نمبر ۱۲ کے بعد کمرہ نمبر ۱۴ ہوتا ہے اور تیرھویں منزل پر ہوٹل کا دفتر وغیرہ ہوتا ہے۔

"محققین" کی اس جماعت نے ہندوستان کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ یہاں حکومت بھی جوتشیوں کے بتائے ہوئے وقت کے مطابق حاصل کی گئی۔ اور بعض سائنس داں عہدہ داروں نے جنم پتری دیکھ کر یا دکھلوا کر اپنے عہدہ کا جائزہ لیا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ڈاکٹر کالوِل اور ان کی جماعت خودکسی "توہم" میں مبتلا ہے۔ ہندوستان کے پروفیسرانِ نفسیات کے لئے لمحۂ فکریہ۔

ضروری اعلان

ڈاک خانہ کے قواعد کی رو سے اب رسالہ صرف تاریخ اشاعت یعنی ہر ماہ انگریزی کی ۵ تاریخ کو پوسٹ ہو سکے گا۔ اس تاریخ کے علاوہ کسی دوسری تاریخ کو ایک پرچہ بھی پوسٹ نہیں ہوگا۔ اس لئے آئندہ اگر اتفاق سے کسی کو رسالہ نہ پہونچنے کی شکایت ہوئی تو اطلاع ملنے پر آئندہ ماہ کی ۵ تاریخ کو ہی رسالہ روانہ کیا جائے گا۔ کیونکہ اب متعینہ تاریخ کے علاوہ ڈاک خرچ ایک پیسہ کی بجائے چھ پیسے خرچ ہوتے ہیں۔

نمونہ کا پرچہ ۱۲ر آنے کے ٹکٹ آنے پر ارسال ہوگا۔

منیجر

تبصرے

زجاجۃ المصابیح جلد اول از مولانا ابو الحسنات سید عبد اللہ الحیدر آبادی تقطیع کلاں ضخامت تقریباً چھ سو صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت چھ روپیہ پتہ :-

مولانا موصوف محلہ حسینی علم جوبلی پوسٹ آفس ۲ حیدر آباد دکن

احناف پر دوسرے مذاہب فقہ کی طرف سے عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ حضرات احادیث کے مقابلہ میں صرف قیاس سے کام لیتے ہیں، فقہ حنفی کا دار و مدار اسی پر ہے اور احادیث و روایات کی زیادہ پروا نہیں کرتے اس اعتراض کا مدلل جواب متقدمین علمائے احناف میں علامہ ابن ہمام اور امام زیلعی نے اور متاخرین میں مولانا عبد الحئی اور مولانا شوق نیموی نے دیا ہے حضرتنا الاستاذ مولانا السید محمد انور شاہ الکشمیری رحمۃ اللہ علیہ کو اس باب میں بڑا اہتمام تھا چنانچہ حضرت مرحوم نے اس سلسلہ میں جو کام انجام دیا ہے وہ وسعت نظر، تلاش و جستجو اور صحت و روایات و اسانید کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا ہے اور بقول حضرت الاستاذ کے اب فقہ حنفی روایت کے لحاظ سے بھی اس قدر مضبوط بنیادوں پر قایم ہو گیا ہے کہ اسے کوئی نہیں ہلا سکتا (حضرت الاستاذ بر سبیل انکساری "پچاس سال تک" کی میعاد مقرر کرتے تھے) لیکن حضرت الاستاذ کی اس بارہ میں تحقیقات متعدد تصنیفات اور امالی کے مجموعہ میں منتشر ہیں کسی مرتب شکل میں اسی خاص مقصد کے ماتحت موجود نہیں زیر تبصرہ کتاب کا مقصد تالیف بھی یہی ہے۔ چنانچہ اس میں مشکوٰۃ المصابیح کے طرز پر مختلف ابواب فقہ کے ماتحت انھیں احادیث کو یکجا کیا گیا ہے جن سے مسلک حنفی کی تائید ہوتی ہے ہر باب کے شروع میں امام بخاری کے ترجمۃ الباب کے طرز پر اس باب سے متعلق قرآن مجید کی متعدد آیات کو بھی نقل کر دیا گیا ہے پھر مشکوٰۃ میں ایک ہی باب کی احادیث مختلف فصلوں میں ملتی ہیں جس کے

باعث بیک وقت کسی ایک مسئلہ کے متعلق تمام احادیث پر نظر رکھنا دشوار ہوتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کے فاضل مؤلف نے اس زحمت سے بچانے کے لئے تمام احادیث متعلقہ ایک ہی باب میں جمع کردی ہیں۔ علاوہ جمع احادیث کے حاشیہ میں تشریحی و توضیحی نوٹ اور متن میں کسی خاص قول یا عبارت یا مسئلہ کی تحقیق بھی ہے۔ یہ سلسلہ کی پہلی جلد ہے۔ ابھی تین جلدیں اور ہوں گی جلد اول میں کتاب الایمان سے باب الاعتکاف تک کے ابواب ہیں امید ہے کہ علم حدیث کے طلبا، اور علما، اس کی قدر کرکے فاضل مؤلف کے حسنِ عمل اور محنت کی داد دیں گے۔

صفات الصفوۃ

از جناب محمد اسمٰعیل صاحب شکاری میرٹھی تقطیع کلاں ضخامت ۵۱۲ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد ۸؍۱۱ آٹھ روپیہ گیارہ آنے پتہ :۔ جناب مصنف بازار بزازہ متصل چھتہ احترام شہر میرٹھ (یوپی)

اسلام میں تصوف کی اصل حقیقت احسان ہے جس کی تعریف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کی ہے کہ "تم خدا کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم اس کو نہیں دیکھ سکتے تو یہ سمجھو کہ وہ تم کو بہر حال دیکھ رہا ہے اس بنا پر تصوف منافی شریعت نہیں بلکہ عین اتباعِ شریعت ہے اور شریعت وطریقت میں کوئی تضاد وتباین نہیں ہے لیکن افسوس ہے کہ غرض مند اور گمراہ لوگوں نے تصوف کے نام سے ہر قسم کے مخالف شریعت اعمال وافعال کو اپنے لئے مباح کرلیا اور سوسائٹی میں فساد عظیم پیدا کردیا ان لوگوں کے عجیب عجیب ناموں کے ساتھ چند در چند فرقے ہیں اور یہ کوئی ایسی اخلاقی دینی اور روحانی بے عنوانی وبدعملی ایسی نہیں ہے جو تصوف اور فقیری کے نام سے خود نہ کرتے ہوں اور دوسروں کو ان کے کرنے کی ترغیب نہ دیتے ہوں کبار اولیار، اللہ اور اکابر علمانے برابر مسلمانوں کو ان لوگوں کے فتنہ سے بچانے کی سعی کی ہے اور فقر و درویشی کی آڑ میں ان گمراہی پھیلانے والوں کا پردۂ مکر وزور چاک کیا ہے اس کتاب کے فاضل مصنف

اسی طبقۂ فقرا سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک خانقاہ کے باقاعدہ سجادہ نشین بھی ہیں لیکن چونکہ توفیقِ الٰہی سے طبع مستقیم اور علم دین کے ساتھ فہم سلیم بھی رکھتے تھے اس لئے موصوف پر اس طبقہ کی کج اندیشی و گمراہی جلد منکشف ہوگئی اور آپ نے احقاقِ حق کا عزمِ صمیم کر لیا، چنانچہ یہ کتاب موصوف کے اسی جذبۂ صادق اور عملِ نیک کا خوشگوار نتیجہ ہے۔ شروع میں صوفی اور فقیر کے لفظوں کے اصل معنی ان کے استعمال کے آغاز کی تاریخ۔ ان کے اقسام و انواع ہر قسم اور ہر نوع کی خصوصیات و ممیزات ان کے عقائد و اعمال ان سب عنوانات پر قرآن و حدیث۔ ائمۂ اسلام کے اقوال اور تاریخ و سیر کی روشنی میں بڑی دل چسپ مدلل اور سبق آموز و عبرت انگیز گفتگو کی ہے اور اس کے بعد مشاہیر صحابۂ کرام تابعین و تبع تابعین اکابر اولیاء اللہ (جن میں خواتین بھی شامل ہیں) ان کے احوال و واقعات۔ لطائف و مزایا اور سوانحِ حیات قلم بند کئے ہیں تاکہ قارئین کو معلوم ہو جائے کہ صحیح معنی میں صوفی۔ فقیر درویش اور باخدا بزرگ ایسے ہوتے ہیں اور درحقیقت یہی وہ نفوسِ قدسیہ ہیں جن کے نقشِ قدم پر چلنے سے فلاح و نجاح ہو سکتا ہے۔ فاضل مصنف نے کتاب محنت اور توجہ و شوق سے لکھی ہے اور پھر ان کا جذبہ اور نیت بھی بڑا مبارک اور نیک ہے۔ اس بنا پر امید ہے کہ اردو خواں مسلمان اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں گے اور فقرائے کوتاہ آستین کی دراز دستیوں اور ان کی "بزیرِ دلق مرقع کمندہا"، کی فتنہ کاریوں سے باخبر و ہوشیار رہنے کی کوشش کریں گے۔ مصنف کا خلوص اور ان کا جذبۂ اصلاح کتاب کے ہر صفحے سے نمایاں ہے۔ جزاہ اللہ عن المسلمین احسن الجزا

لغات القرآن جلد چہارم

جس کا مدتِ مدید سے انتظار تھا چھپ کر پریس سے آگئی ہے۔ قیمت غیر مجلد پانچ روپے قیمت مجلد چھ روپے۔

بُرھَانْ

جلد نمبر ۳۲ شمارہ نمبر ۴

اپریل ۱۹۵۴ء مطابق شعبان المعظم ۱۳۷۳ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

مسلمانوں کی قومی زندگی کا سب سے زیادہ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے قومی اور تہذیبی معاملات پر سنجیدگی اور متانت کے ساتھ بہت کم اور جذباتیت کے ساتھ بہت زیادہ غور کرتے ہیں چنانچہ ان کو ایسے لیڈر پسند ہیں جو پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر اشتعال انگیز باتیں کہہ جائیں، مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی کا بھیانک نقشہ ان کے سامنے پیش کریں اور اس زبوں حالی میں جن لوگوں کا دخل ہے ان کو برا بھلا کہیں اسی طرح وہ ان اخبارات کی طرف زیادہ مائل ہیں جن کی تنقید و صاف بیانی کا نشتر زیادہ سے زیادہ تیز ہو۔ اس کے برخلاف جو زعما اور اکابر اپنے اپنے حلقوں میں ٹھوس۔ مفید اور تعمیری کام انجام دے رہے ہیں مگر زبان و قلم دونوں کو محتاط اور اپنے قابو میں رکھتے ہیں ان کی مسلمانوں میں نہ زیادہ پوچھ ہے اور نہ ان کے دلوں میں ان کی زیادہ قدر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو مخلص ٹھوس تعمیری کام انجام دے رہے ہیں جن کے نتائج آگے چل کر مسلمانوں کی قومی زندگی بنانے میں نہایت عظیم الشان اور دور رس ہو سکتے ہیں اور انشاء اللہ ہوں گے ان کی طرف سے قوم کی بے اعتنائی اور بے توجہی کا یہ عالم ہے کہ ان غریبوں کو اپنا کام چلانا بھی مشکل ہے اور ان کے برعکس جن لوگوں کی قومی قیادت کی معراج گلے کی رگیں پھلا کر آنکھوں کو شرربار اور جسم کو مرغ بسمل کا ہمزاد بنا کر چند تقریریں کر لینا ہے ان کا کوئی کام رکا ہوا نہیں ہے۔

مسلمانوں کی ہی تخصیص نہیں۔ خواہ کوئی قوم ہو اس دوسری قسم کے لیڈر اپنی قوم کے کسی مرض کی دوا نہیں ہو سکتے۔ بلکہ ان کی غلط قیادت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم خود اپنے عیب اور اپنی کمزوریاں نہیں دیکھتی معمولی معمولی باتوں میں الجھ کر اور دوسروں کے ساتھ دستہ

گریباں ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور جب تعمیر و تشکیل کی فرصت اکارت جاتی ہے تو اس وقت حسرت و ندامت اور پشیمانی کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہتا جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے تو انھیں تو قرآن اور اسوۂ نبوی نے تعلیم ہی یہ دی ہے کہ سخت سے سخت اشتعال انگیز حالات میں بھی اپنا دماغی توازن اور دل کا سکون برباد نہ کرو۔ خاموشی اور صبر و استقلال کے ساتھ اپنی تعمیر اور اصلاح حال کا کام انجام دیتے رہو۔ دوسروں پر نکتہ چینی اور خورده گیری کے بجائے خود اپنے آپ کو دیکھو کہ تم کیا ہو اور تمہیں کیا ہونا چاہئے کسی انسان یا کسی قوم کا سب سے بڑا گناہ اس کا کمزور ہونا ہے، جسم کے اعضا اگر ضعیف ہوتے ہیں تو معمولی سی بیماری کی مقاومت بھی نہیں ہو سکتی۔ اور جسم اگر قوی ہے تو بڑے سے بڑے مرض کا بھی مقابلہ کر سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ جسم محض نعرہ بازی سے فربہ و توانا نہیں ہوتا۔ بلکہ مسلسل اس کی غور پرداخت۔ عمدہ غذائیں۔ صحت بخش آب و ہوا اور ماحول۔ ورزش اور بے اعتدالی و بے احتیاطی سے پرہیز یہ سب چیزیں مل کر جسم کو مضبوط و توانا بناتی ہیں۔

آج مسلمانوں کے سامنے جو مسائل و معاملات درپیش ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم خود ان کی اور ان سے زیادہ ان کے بچوں اور بچیوں کی دینی تعلیم و تربیت کا معاملہ ہے، آخرت میں ان کی سرخروئی اور فلاح و نجاح اور دنیا میں ان کی قومی زندگی کا تحفظ و بقا سب کا دار و مدار اسی ایک چیز پر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا انتظام کیوں کر اور کس طرح ہو ظاہر ہے کہ حکومت سیکولر ہے اس لئے کسی سرکاری مدرسہ یا اسکول میں اس کا بند و بست نہیں ہو سکتا، پھر چونکہ پرائمری تعلیم جبری ہو گئی ہے اس لئے کوئی مسلمان بچہ اس سے مستغنی بھی نہیں ہو سکتا اور ہونا بھی نہیں چاہئے ورنہ معاشی، سماجی اور سیاسی اعتبار سے اس کے نتائج بہت خطرناک اور تباہ کن ہوں گے اس بنا پر دینی تعلیم کے انتظام کی صورت اس کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ جگہ جگہ مکتب کھولے جائیں اور ان میں جبری تعلیم کے ساتھ ساتھ روزانہ ایک دو گھنٹہ یا کم از کم ہفتہ میں تین دن مسلمان بچوں کو دینی تعلیم دینے کی اجازت حاصل کی جائے۔ اس کے علاوہ بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ دینی تعلیم کا انصار ایسا

جامع بنایا جائے کہ اسے پڑھ کر ایک بچہ اسلام کے عقائد و اعمال سے باخبر اور اسلامی اخلاق و اسلامی فکر سے پورے طور پر بہرہ مند ہو سکے اس میں صحیح معنی میں خدا ترسی ہو، نیک کاموں کی طرف اس کا فطری میلان ہو، اپنوں اور دوسروں کے ساتھ معاملہ کرتے وقت اس میں اسلامی اخلاق و کردار کی پوری جھلک ہو اسلامی شعائر و احکام اور بزرگان اسلام کی حقیقی عظمت و احترام اس کے دل میں موجود ہو عزت نفس کے ساتھ ساتھ بنی نوع انسان کی خدمت کا جذبہ اس میں بدرجہ اتم موجود ہو۔

بڑی خوشی اور مسرت کی بات ہے کہ مسلمانوں کی خصوصاً اور ملک کی عموماً مخلص و فداکار جماعت جمعیۃ علمائے ہند نے اپنے بیسیوں قومی اور جماعتی کاموں اور سرگرمیوں کے باوجود مسلمانوں کی اس اہم ترین ضرورت کی طرف بھی بروقت صحیح اور مناسب ترین توجہ کی اور اس سلسلہ میں اس نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا، چنانچہ جمعیت ایک طرف جگہ جگہ مکاتب کھول رہی ہے اور دوسری جانب اس نے دینی تعلیم کا ایک ایسا جامع مفید اور ہمہ گیر نصاب بنا کر شائع کر دیا ہے جو دینی احکام و مسائل اخلاق و معاملات، تاریخ و سیرت، وعظ و نصیحت اور ترتیب و تہذیب ہر اعتبار سے ایک مثالی اور بہترین نصاب ہے پھر بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ کہیں کسی جگہ بھی کسی اختلافی مسئلہ کا ذکر نہیں کیا ہے اس بنا پر اس نصاب کو دیوبندی، بریلوی، مقلد، غیر مقلد ہر مسلک اور ہر طبقہ کے مسلمان بچے بے تکلف پڑھ سکتے ہیں اس سلسلہ میں اب تک پانچ حصے شائع ہو چکے ہیں جن کی مجموعی قیمت مع اردو عربی قاعدہ ۱۱؎ ہے اور دفتر جمعیۃ علمائے ہند گلی قاسم جان بلی ماران دہلی سے مل سکتے ہیں کاغذ اور کتابت و طباعت اور ضخامت کے لحاظ سے یہ قیمت واجبی سی ہے حقیقت یہ ہے کہ تعمیری و اصلاحی اعتبار سے جمعیت علمائے ہند کی یہ کوشش بہت زیادہ قابل قدر اور لائق مبارکباد ہے اسلامی مکاتب کو چاہئے کہ اس کو رائج کریں جہاں مکاتب نہیں ہیں وہاں بچوں کو پرائیویٹ طور پر پڑھایا جائے اور نصاب اگرچہ بچوں کے لئے بنا ہے لیکن بڑی عمر کے مرد اور عورتیں وہ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، بہر حال جمعیۃ نے جو کام کیا ہے اب اس کو تمام ملک میں پھیلانا اور بہمہ وجوہ کامیاب کرنا مسلمانوں کا فرض ہے اس میں نہ زیادہ روپیہ خرچ کرنے کی ضرورت ہے اور نہ زیادہ وقت دینے کی صرف توجہ درکار ہے اور جو فائدہ ہوگا وہ بہت اہم اور غیر معمولی ہوگا۔

خالد بن سنان العبسی

از

(جناب ڈاکٹر محمد خالدی ام - اے - ڈی - لٹ)
(استاذ تاریخ اسلام جامعہ عثمانیہ)

یہ بات عام طور پر مشہور ہے بلکہ یہ ایک حقیقت سمجھی جاتی ہے کہ سیدنا عیسیٰؑ و سیدنا محمدؐ کے درمیانی زمانہ میں دنیا کے کسی خطہ میں کوئی نبی یا رسول مبعوث نہیں ہوا۔ اور جزیرۃ العرب تو سیدنا اسماعیلؑ کے بعد سے اس سعادت سے، جس کے بعد کوئی سعادت نہیں ہے، محروم ہی رہا۔ گو اس طویل مدت میں دوسرے ملکوں اور قوموں خاص کر بنو اسرائیل میں ایک سے زیادہ نبی مبعوث ہوئے قرآن میں ایسے انبیاء علیہم السلام کے نام آئے ہیں جو سیدنا اسماعیلؑ کے بعد مبعوث ہوتے لیکن سیدنا عیسیٰؑ کے بعد کسی نبی کا مبعوث ہونا مذکور نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوصف بعض عربی روایتوں میں خاص جزیرۃ العرب میں ایک شخص ——— خالد بن سنان العبسی کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ نبی تھے۔ خالد کے حالات کی تفصیل سے قدیم و جدید عربی مصادر تقریباً خاموش ہیں۔ چند محدثوں، بعض مفسروں اور ایک دو تذکرہ نگاروں نے صرف اجمالی ذکر کیا ہے اسی طرح بعض ادیب بھی چند سطروں سے زیادہ آگے نہ بڑھ سکے کافی تلاش و جستجو کے بعد ان منتشر و مختصر معلومات کو جمع کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ تاریخی تحقیق کے لحاظ سے خالد بن سنان اور اس کی نبوت کی کیا حیثیت ہے وما توفیقی الا باللہ۔

جن بزرگوں نے خالد بن سنان کے متعلق کچھ نہ کچھ بیان کیا ہے تاریخی ترتیب کے لحاظ سے ان میں پہلا درجہ محمد بن سعد متوفی سنہ ۲۳۰ھ کا ہے۔ ابن سعد اپنے شیخ محمد بن عمر الواقدی متوفی سنہ ۲۰۷ھ سے اور وہ علی بن مسلم اللیثی سے اور وہ سعید بن کیسان المقبری متوفی سنہ ۱۲۳ھ سے روایت کرتے ہیں۔

مقبری کہتے ہیں کہ ابوہریرہؓ نے فرمایا "بنو عبس کے تین افراد نبی صلعم کے پاس حاضر ہوتے آپ صلعم نے ان سے خالد بن سنان کی بابت دریافت کیا تو ان لوگوں نے کہا اس کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ نبی صلعم نے فرمایا وہ نبی تھے۔ اس کی قوم نے ان کو ضائع کر دیا نبیؐ ضیعه قومه۔ پھر اپنے اصحاب سے خالد بن سنان کی متعلق باتیں کرنے لگے"

(۱) اس حدیث کا پہلا راوی واقدی ہے۔ محدثین کی اکثریت اس کو کذاب سمجھتی ہے۔

(۲) دوسرا راوی علی بن مسلم لیثی مجہول ہے۔ اس لئے سلسلہ رواۃ کے اعتبار سے ابن سعد کی یہ حدیث قابل استناد نہیں ہے حدیث کے متن کی تنقیح آگے آئے گی۔

خالد کا تذکرہ کرنے والوں میں تاریخی ترتیب کے لحاظ سے ابن سعد کے بعد جاحظ کا درجہ ہے عربی کا یہ سب سے بڑا ادیب، محدث و مفسر نہیں ہے، البتہ معلومات کی کثرت کے لحاظ سے اس کی کتابیں اپنے زمانہ کی اسلامی تاریخ کا ایک بہت بڑا، اہم اور کار آمد خزانہ ہیں اس لئے اس کے بیان پر بھی توجہ کرنا فائدہ سے خالی نہیں کتاب الحیوان (۳) میں نار الحرتین کے ذکر میں جاحظ کا بیان ہے "نار الحرتین" نار خالد بن سنان ہے۔ خالد بن سنان بنو مخزوم سے تھا جو بنو قُطَیعہ بن عبس کی ایک شاخ ہے۔ بنو اسماعیل میں اس سے پہلے کوئی نبی نہیں ہوا۔ یہ وہی شخص ہے جس کے ذریعہ سے اللہ نے حرتین کی آگ بجھائی جو بنو عبس کے علاقہ میں تھی جب رات ہوتی تو آگ بلند ہو کر آسمان تک پھیل جاتی۔ بنو طے اس آگ کی روشنی میں اپنے اونٹوں کو بغیر رکھوالے کے چرنے کے لئے چھوڑ دیتے تھے حالانکہ بنو عبس اور بنو طے کے درمیان تین راتوں کی مسافت تھی۔ بعض وقت اس کا کچھ حصہ الگ ہو جاتا اور جس چیز کا رخ کرتا اس کو بھسم کر دیتا۔ جب دن ہوتا تو دھواں جوش مارتا رہتا تب اللہ نے خالد بن سنان کو بھیجا۔ اس نے آگ کے لئے کنواں کھودا اور آگ کو اس میں ڈھکیل دیا اور لوگ یہ حال دیکھ رہے تھے۔ خالد کنویں میں کود پڑا اور آگ کو اس نے غایب کر دیا جب اس نے سنا کہ بعض لوگ کہہ رہے ہیں خالد ہلاک ہو گیا تو بولا۔ بکریاں چرانے والے کا بیٹا جھوٹ بکتا ہے۔ میں اس کنویں سے اس حال میں نکلوں گا کہ میری پیشانی تر ہو گی۔

جب خالد کی وفات کا وقت آیا تو اس نے اپنی قوم سے کہا۔ جب میں مرجاؤں اور تم مجھ کو دفن کرچکو تو تین دن گذرتے پر میرے پاس آنا تم دیکھو گے کہ ایک دُم کٹا جنگلی گدھا میری قبر کے گرد گھوم رہا ہے۔ جب تم یہ دیکھو میری قبر کھود دو میں تم کو قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے اس سے مطلع کردوں گا چنانچہ اس غرض کے لئے تیسرے روز لوگ جمع ہوئے۔ جب جنگلی گدھے کو دیکھا تو خالد کو قبر سے نکالنے چلے۔ اس وقت ان میں اختلاف پیدا ہوا اور دو گروہ ہو گئے، خالد کا بیٹا عبداللہ اس گروہ میں تھا جو قبر کھودنے کا مخالف تھا۔ عبداللہ کہتا تھا میں ہرگز ایسا نہیں کرنے دوں گا اگر قبر کھودی جائے تو لوگ مجھے اکھڑے مردے کا بیٹا کہیں گے پس لوگوں نے خالد کی قبر کو جوں کا توں چھوڑ دیا۔ خالد کی بیٹی نبی صلعم کے پاس حاضر ہوئی تھی تو آپؐ نے اس کے لئے اپنی چادر بچھائی اور فرمایا یہ نبی کی بیٹی ہے جس کو اس کی قوم نے ضائع کر دیا۔ راوی کہتا ہے۔ خالد کی بیٹی نے قل ھواللہ احد کی سورۃ سُنی تو کہا۔ میرا باپ اس سورۃ کی تلاوت کیا کرتا تھا۔

افسوس ہے کہ جاحظ نے اپنی اس اطلاع کا کوئی ماخذ نہیں بتایا۔ اس لئے راوی و ماخذ کے ثقہ و غیر ثقہ ہونے کے متعلق کوئی بات نہیں کہی جاسکتی اور چوں کہ یہ روایت غیر مستند قرار پاتی ہے اس لئے ناقابل حجت ہے۔ متن روایت پر تنقید آگے آرہی ہے۔

تاریخی ترتیب سے تیسرا درجہ عبداللہ، ابن قتیبہ متوفی ۲۷۶ھ کا ہے۔ ابن قتیبہ گرچہ ادیب کی حیثیت سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں لیکن خالص اسلامی علوم جیسے مثلاً تفسیر، حدیث و کلام میں بھی ان کا درجہ لحاظ کے قابل ہے اپنی کتابوں میں خواہ وہ ادبی ہوں یا کلامی جب کبھی کوئی حدیث نقل کرتے ہیں تو عام طور پر راویوں کا سلسلہ بھی ذکر کرتے اور ماخذ بتا دیتے ہیں۔

ابن قتیبہ کی جو کتابیں چھپ گئی ہیں ان میں صرف المعارف میں خالد ابن سنان کا ذکر ملتا ہے (۴)، اس میں ہے کہ خالد بن سنان بن غیث بنو عبس بن بغیض سے ہے۔ روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا یہ نبی ہے۔ اس کی قوم نے اس کو ضائع کر دیا۔

جب خالد کی وفات ہونے لگی تو اس نے اپنی قوم سے کہا، میرے دفن ہونے پر ایک جنگلی گدھی۔

عانتہ من حمیر۔ آئے گی اور اس کے آگے آگے (یا پیچھے) ایک صاف رنگ کا جنگلی گدھا عیر اقمر۔ ہوگا۔ یہ میری قبر پر اپنی سُم ملدے گا۔ جب تم یہ دیکھو تو میری قبر کھود و۔ میں نکلوں گا اور تم کو ان تمام امور سے جو موت کے بعد ہونے والے ہیں نیز برزخ و قبر کے حالات سے بھی مطلع کر دوں گا چنانچہ جب خالد مرا تو لوگوں نے وہ دیکھا جو اس نے کہا تھا اس لئے اس کو نکالنے کا ارادہ کیا لیکن بعض لوگوں نے اس کو بُرا جانا اور کہا کہ لوگ کہیں گے ہم نے اپنا گڑا مردہ اُکھاڑا۔

خالد کی بیٹی نبی صلعم کے پاس حاضر ہوئی اور آپ کو قل ھو اللہ احد پڑھتے سنا تو کہنے لگی میرا باپ ایسا ہی کہا کرتا تھا۔

اپنی عادت کے خلاف ابن قتیبہ نے اس حدیث کی کوئی سند بیان نہیں کی۔ لہذا یہاں بھی سلسلہ رواۃ کی تحقیق سے مجبوری ہے اور یہ روایت بھی جاحظ کی روایت کی طرح حجت کے قابل نہیں۔

ابن قتیبہ کے بعد محمد ابن دُرید متوفی ۳۲۱ھ نے الاشتقاق (۵) اور احمد ابن عبد ربہ متوفی ۳۲۷ھ نے العقد الفرید (۶) میں خالد بن سنان کا ذکر بنو عبس کے نسب وغیرہ کے سلسلہ میں کیا ہے۔ غیر معمولی اختصار اور بغیر کسی سند کے۔ اس لئے تاریخی ترتیب کو باقی رکھنے کے لئے ہم نے صرف حوالہ پر اکتفا کی ہے۔

ممتاز اور معروف مورخوں میں سوائے مسعودی متوفی ۳۴۶ھ کے کسی اور مورخ نے خالد ابن سنان کے حالات پر روشنی نہیں ڈالی۔

مسعودی اُن مشہور لوگوں کے حالات لکھتے ہوئے جو سیدنا عیسیٰؑ اور سیدنا محمد صلعم کے درمیانی زمانہ میں گذرے ہیں اپنی کتاب مروج الذہب و معدن الجواہر (۷) میں کہتے ہیں اور جو لوگ اس زمانہ میں گذرے ہیں ان میں خالد بن سنان ہے۔ نبی صلعم نے اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ یہ نبی ہے اُس کی قوم نے اُس کو ضائع کر دیا۔ مسعودی کہتے ہیں اور یہ اس طرح کہ عرب میں ایک آگ ظاہر ہوئی اور یہ اس کے فتنہ میں پڑ گئے۔ یہ آگ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو رہی تھی

قریب تھا کہ عرب مجوسی بن جائیں اور ان پر مجوسیت غالب ہو جاتے۔ پس خالد ایک ڈنڈا لے کر آگ میں داخل ہوا۔ اس وقت خالد کہہ رہا تھا۔ اللہ برتر کی طرف لے جانے والی عام ہدایت ظاہر ہو گئی۔ میں اس آگ میں داخل ہوں گا دراں حالیکہ وہ بھڑک رہی ہے اور اس سے اس حال میں نکلوں گا کہ میرے کپڑے تر ہوں گے۔

چنانچہ خالد نے یہ آگ بجھا دی۔

اس کے بعد مسعودی نے وہی نقل کیا ہے جو ابن قتیبہ نے خالد کی وصیت کے متعلق لکھا ہے کہ اس طرح لوگ قبر پر جمع ہوئے۔ بتائی ہوئی علامتوں کو دیکھا اور اختلاف رائے کے بعد قبر نہ کھودنے کا فیصلہ کیا۔ مسعودی نے یہ پوری روایت بغیر کسی سند کے لکھی ہے لیکن اپنی اسی کتاب میں دوسری جگہ (۸) لکھتے ہیں۔

حدثت حسن بن ابراہیم قال حدثنا محمد بن عبداللہ مروزی قال ثنا اسد بن سعید ابن کثیر بن عفیر عن ابیہ عن جدہ کثیر عن جدہ ابیہ عفیر عن عکرمہ عن عبداللہ بن عباس آپ کہتے ہیں رسول اللہ صلعم نے فرمایا اللہ نے پچھلے زمانہ میں ایک بہترین پرندہ پیدا کیا اور اس میں ہر قسم کے حسن کا حصہ رکھا۔ اس کا چہرہ انسانوں کے چہروں کی طرح بنایا۔ ہر پنکھ میں ہر طرح کے بہترین رنگ کے پر تھے۔ اس کے دونوں طرف چار پنکھ تھے۔ اس پرندہ کے دو ہاتھ تھے جن میں ناخن تھے۔ عقاب کی چونچ کی طرح اس کے چونچ تھی جس کی جڑ مضبوط تھی اس کی صورت پر اللہ نے اس کی مادہ بھی پیدا کی اور اس پرندہ کا نام عنقاء رکھا اللہ نے موسیٰ بن عمران کی طرف وحی کی کہ میں نے ایک عجیب قسم کا پرندہ کا جوڑا پیدا کیا ہے اور ان کا رزق بیت المقدس کے وحشی جانوروں کو بنایا ہے اب میں نے اس جوڑے کو تم سے مانوس کر دیا ہے۔ تاکہ بنو اسرائیل کو میں نے جو فضیلت دی ہے ان میں یہ بھی شمار ہو۔ یہ جوڑا بچے پیدا کرتا رہا اور اس کی نسل بڑھ گئی پھر یہ جوڑا موسیٰؑ اور بنو اسرائیل کے ساتھ وادی تیہ میں بھی اس وقت رہا کہ پہلی نسل ختم ہو کر ایک دوسری نسل نے ان کی جگہ لی۔ پھر اللہ نے ان پرندوں کو بھی موسیٰؑ کے شاگرد و وصی یوشع بن نون کے ساتھ تہمہ سے

دوسرے مقام پر منتقل کر دیا اور یہ پرندے نجد و حجاز میں قیس عیلان کی بستی میں اتر پڑے یہاں عنقا وحشی جانوروں کے علاوہ بنو قیس کے بچوں اور ان کے چوپایوں کو بھی ہڑپ کرنے لگا۔ یہاں تک کہ عیسیٰؑ و محمد صلعم کے درمیانی زمانہ میں بنو عبس میں ایک نبی کا ظہور ہوا جن کا نام خالد بن سنان تھا۔ لوگوں نے فریاد کی کہ عنقا، ان کے بچوں کو کھا جاتا ہے تب خالد نے اللہ سے دعا کی کہ عنقا، کی نسل منقطع کر دے اب عنقا کی صورت کی نقل شطرنجوں پر بنائی جاتی ہے۔

(۹) مندرجہ ذیل روایت اور پچھلی روایتوں میں بعض اہم اختلاف ہیں اس لئے پوری روایت پیش کی جاتی ہے

عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں۔ خالد بنو عبس کے نبی تھے۔ رسول اللہ صلعم کی بشارت دینے والے خالد نے اپنی وفات کے قریب اپنی قوم سے کہا کہ مرنے کے بعد مجھ کو ان ٹیلوں میں سے کسی ٹیلے میں دفن کر دو اور چند روز تک میری قبر کی نگرانی کرتے رہو جب تم دیکھو کہ کوئی سیاہی مائل کھلے رنگ کا دم کٹا گدھا اس ٹیلے کے اطراف چکر لگا رہا ہے تو تم سب جمع ہو کر قبر کھولو اور مجھے قبر کے کنارہ کر دو۔ تم میں ایک لکھنے والا بھی ہو۔ اس کے ساتھ وہ چیز بھی ہو جس پر لکھا جائے میں تم کو قیامت تک جو کچھ ہونے اور گذرنے والا ہے وہ بتلا دوں گا اور تم لکھ لو چنانچہ لوگ اس کی قبر پر تین دن تک انتظار کرتے رہے (کچھ نظر نہیں آیا) پھر اور تین دن تک ٹھیرے (تب بھی کچھ دکھائی نہیں دیا تو) مزید تین روز بیٹھے رہے۔ نویں روز کیا دیکھتے ہیں کہ اس ٹیلہ کے اطراف جس کے قریب خالد کی قبر تھی ایک گدھا چر رہا ہے (یہ دیکھ کر) خالد کے حکم کے مطابق لوگ اس کی قبر کھولنے چلے تو خالد کے بیٹوں نے تلواریں سونت لیں اور کہا خدا کی قسم! کسی ایسے کو زندہ نہیں چھوڑیں گے جو (ہمارے باپ کی) قبر کھودے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ کل ہمیں لوگ اس کی وجہ سے عیب لگائیں! در عرب کہیں یہ ہیں اکھڑے مردے کے بیٹے! (یہ حال دیکھ کر) لوگ پلٹ گئے اور خالد کی قبر نہ کھل سکی۔

عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں خالد کی بوڑھی بیٹی جو بہت زیادہ عمر رسیدہ ہو گئی تھی، نبی صلعم کے پاس آئی تھی۔ آپ اس سے اچھی طرح ملے۔ اس کا اکرام کیا۔ پھر وہ اسلام لے آئی آپ صلعم نے

فرمایا "مرحبا بابنة نبیٍّ ضیعه أهله - بنو عبس کا شاعر کہتا ہے

بنو خالد لو انکم اذ حضرتم ... نبشتم عن المیت المغیب بالقبر

لأبقی لکم فی آل عبس ذخیرة ... من العلم لا تبلی علی سالف الدهر

اے خالد کے بیٹو جب تم خالد کی قبر پر حاضر ہوتے تھے اس وقت اگر تم قبر میں چھپی میت کو کھودتے تو تمہارے لئے آل عبس میں علم کا ایسا ذخیرہ باقی رہتا جو ہمیشہ کے لئے کارآمد ہوتا۔

مسعودی کا کہنا ہے کہ اس قسم کی بہت سی روایتیں ابن عفیر سے مروی ہیں اس کے علاوہ بنو اسرائیل وغیرہ سے متعلق اسی مضمون سے مشابہت رکھنے والی روایتیں بھی ابن عفیر ہی سے مروی ہیں۔

اس روایت میں مسعودی نے اپنے راویوں کے نام بھی بتلائے ہیں مگر افسوس ہے کہ ان میں سوائے سعید کے باقی سب کے سب مجہول ہیں، راویوں میں سے سوائے آخری دو کے۔ بقیہ راویوں کے متعلق کچھ پتہ نہیں لگتا کہ کون تھے ابتدائی راوی مروزی کا کچھ نشان ملتا ہے اور نہ اس سلسلہ کے اصل راوی ابن عفیر ہی کا۔ مسعودی کی رائے سے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابن عفیر کوئی قصہ گو تھا جو گرمی محفل کے لئے قسم قسم کے انوکھے قصّے بیان کرتا تھا۔ جن میں واقعہ کا حصہ بہت ہی کم اور خیالی حاشیہ آرائی زیادہ ہوتی تھی جو شعر نقل ہوتے ہیں اس کے کہنے والے کا نام بھی نہیں بتلایا گیا بنو عبس میں عنترہ، حُطیئہ اور عروۃ بن الورد جیسے بڑے بڑے شعراء ہوتے ہیں۔ اپنے اپنے قبیلہ پر فخر کرنا اور اس کے افراد کے کارنامے مزے لے لے کر بیان کرنا عرب شعراء کا محبوب و مرغوب موضوع رہا ہے ان کے دواوین آپ دیکھ جائیے خالد بن سنان کا ذکر اشارۃً یا کنایۃً بھی نہیں ملتا معلوم نہیں مسعودی نے یہ شعر کہاں سے نقل کئے ہیں۔

بہرحال اس روایت کے راوی بھی مجہول ہیں اس لئے یہ بھی پچھلی روایتوں کی طرح ناقابل حجت ہیں۔ اشعار بھی مصنوعی معلوم ہوتے ہیں۔

ابن سعد کی روایت کے علاوہ اب تک جو روایتیں نقل کی گئیں وہ ادیبوں اور مورخوں کی تھیں جو محدثین کرام کے بلند معیار تک نہیں پہنچتیں۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ توجہ کے

قابل الحاکم متوفی ۴۰۵ھ کی روایت ہے (۱۰) کیوں کہ حاکم نے اس کی تصریح کی ہے کہ اپنی کتاب المستدرک میں وہی حدیثیں درج کی جا رہی ہیں جو سند و متن کے اعتبار سے بخاری یا مسلم کی شرط پر پوری اترتی ہیں لیکن خود بخاری و مسلم سے رہ گئیں (۱۱) یا ان کو ان دونوں نے کسی نہ کسی وجہ سے اپنے اپنے مجموعۂ احادیث میں شامل نہیں کیا حاکم نے اپنی اس کتاب کا نام مستدرک اسی لئے رکھا ہے کہ ان کی دانست میں یہ ان روایتوں کی نشان دہی کرتی ہے جن کو صحیحین میں درج ہونا چاہیئے تھا غرض جس کتاب کے متعلق یہ دعویٰ کیا جائے کہ صحت و تنقیح کے اعتبار سے وہ صحیحین کے درجہ کی ہے اس کی روایت پر خصوصی توجہ ضروری ہے۔

حاکم کہتے ہیں اخبرنا ابوبکر بن اسحاق الفقیہ وجعفر الخلدی قال ثنا علی بن عبد العزیز ثنا معلی بن مھدی ثنا ابو عوانہ عن ابی یونس عن عکرمۃ عن عبد اللہ بن عباس : بنو عبس کے ایک شخص نے جس کو خالد بن سنان کہا جاتا تھا اپنی قوم سے کہا میں نار حدثان کو بجھا دوں گا جو تمہاری تکلیف کا باعث ہے اس کی قوم کے ایک شخص عمارۃ بن زیاد نے یہ سن کر کہا واللہ! خالد تم نے تو ہم سے ہمیشہ سچی بات کہی ہے بھلا تم اور نار حدثان! کیا تم کو اس کی توقع ہے کہ تم اس آگ کو ٹھنڈا کر دوگے، راوی کہتا ہے، پھر خالد آگ کی طرف بڑھے اور اُن کے ساتھ عمارۃ اور اس کی قوم کے تیس آدمی اور بھی یہ سب آگ کے پاس آئے جو سیاہ پتھریلی زمین کے ایک پہاڑ کی کھو سے نکل رہی تھی یہ علاقہ حرۃ اشجع کہلاتا تھا۔ یہاں خالد نے ان لوگوں کے لئے ایک نشان بنا کر ان سب کو اس پر بٹھا دیا اور کہا اگر مجھے تمہاری طرف آنے میں دیر ہو جائے تو مجھے میرا نام لے کر نہ بلانا۔ آگ اس طرح نکل رہی تھی گویا سرخ گھوڑے ہیں کہ ایک دوسرے کے پیچھے سرپٹ دوڑ رہے ہیں (یا) آگ کا ایک پہاڑ ہے کہ حرکت کر رہا ہے خالد اس آگ کی طرف بڑھا اور اس پر یہ کہتے ہوئے اپنا عصا مارا۔ سچائی ظاہر ہو گئی۔ راہِ حق ممتاز ہو گئی، حق پوری طرح واضح ہو گیا۔ بکریاں چرانے والی کا بیٹا سمجھتا ہے کہ میں اس آگ سے صحیح و سلامت نہیں نکل سکوں گا۔ پھر خالد آگ کے اس کھو میں داخل ہو گئے، راوی کہتا ہے

لیکن اس کے واپس آنے میں دیر ہوئی۔ تو عمارۃ نے کہا اگر تمہارا ساتھی زندہ ہوتا تو (اب تک ضرور) لوٹ آتا اس پر کسی نے کہا اس کا نام لے کر پکارو دوسروں نے کہا اس نے تو ہم کو نام لے کر بلانے سے منع کیا ہے۔ بہر حال چند لوگوں نے اس کا نام لے کر پکارنا شروع کیا۔ راوی کہتا ہے کہ خالد اپنا سر پکڑے ہوئے ان کی طرف نکلے اور ان سے کہا کیا میں نے تم کو نام لے کر پکارنے سے منع نہیں کیا تھا؟ خدا کی قسم تم نے تو مجھے مار ہی ڈالا۔ مجھے دفن کر دو اگر تم پر گدھوں کا گذر ہو اور ان میں کوئی دم کٹا گدھا ہو تو میری قبر کھولو تم مجھے زندہ پاؤ گے۔ راوی کہتا ہے۔ لوگوں نے خالد کو دفن کر دیا۔ پھر ان پر گدھوں کا گذر ہوا جن میں ایک دُم کٹا گدھا بھی تھا لوگوں نے کہا اب اس کو کھود کر نکالو کیوں کہ اس نے حکم دیا ہے کہ ہم اس کو نکالیں عمارۃ بن زیاد نے کہا مضر یہ نہ کہنے پائیں کہ ہم اپنے گڑھے مردے اکھاڑا کرتے ہیں۔ خدا کی قسم ہم تو اس کو کبھی نہیں اکھاڑیں گے۔

راوی کہتا ہے: خالد نے ان کو خبر دی تھی۔ کہ اس کی عورت کے پیٹ کی بٹ (مگلن) میں دو تختیاں ہیں۔ جب تم کو کسی امر میں مشکل آن پڑے تو ان میں دیکھنا۔ جس چیز کی بابت دریافت کرو گے وہ تم اس میں دیکھ لوگے۔ خالد نے کہا تھا ان تختیوں کو حیض والی عورت چھونے نہ پائے اس کی عورت کے پاس لوگ گئے اور اس سے تختیاں طلب کیں۔ اس وقت عورت حیض میں تھی۔ اس نے اسی وقت تختیاں نکالیں۔

راوی کہتا ہے ان میں جو کچھ علم تھا وہ جاتا رہا۔ حاکم کہتے ہیں کہ ابو یونس نے کہا کہ سماک بن حرب کہتے ہیں۔ نبی صلعم نے خالد بن سنان کی بابت دریافت کیا اور فرمایا یہ نبی تھے ان کی قوم نے ان کو ضائع کر دیا۔ اور ابو یونس یہ بھی کہتے ہیں کہ سماک بن حرب نے کہا خالد بن سنان کا بیٹا نبی صلعم کے پاس حاضر ہوا آپ نے فرمایا مرحباً یا بن اخی۔

حاکم کہتے ہیں یہ روایت بخاری کے درجہ صحت پر ہے لیکن بخاری و مسلم دونوں نے اس کو اپنی کتابوں میں درج نہیں کیا۔ وراں حالیکہ ابو یونس نے عکرمہ سے روایت کی ہے۔ ابو یونس کا نام حاتم بن صغیرہ ہے۔ دونوں نے اس کو حجت مانا ہے۔ بخاری ان سب حدیثوں کو دلیل

مانتے ہیں جن کی روایت عکرمہ سے صحیح ثابت ہو۔

رہا خالد کی موت کا قصہ۔ اس میں بھی اختلاف ہے۔ میں نے ابولا صبغ عبدالملک بن مغر ابو عثمان سعید بن نصر اور ابو عبداللہ محمد بن صالح معافری۔ یہ تینوں اندلسی ہیں۔ اور انھوں نے ایک ثقہ جماعت سے یہ سنا کہ قیروان اور ان کے درمیان سمندر ہے۔ قیروان کے وسط میں ایک پہاڑ ہے عام طور پر کوئی اس پر چڑھتا نہیں قیروان کا رستہ سمندر کی طرف پہاڑ پر سے نکلتا ہے ان لوگوں نے وہاں غار میں ایک شخص کو دیکھا جس پر سفید صوف (کی چادر) ہے۔ یہ اپنی دونوں ٹانگوں اور پیٹھ کو سفید صوف ہی (کے کپڑے) سے باندھے ہوئے اکڑوں بیٹھا ہوا ہے اس شخص کا سر اس کے ہاتھ پر ٹکا ہوا ہے گویا وہ سو رہا ہے۔ اس میں کوئی تغیر نظر نہیں آتا: یہاں رہنے والوں کی ایک جماعت شہادت دیتی ہے کہ وہ خالد بن سنان ہیں اور اللہ ہی زیادہ جاننے والا ہے۔

حاکم کی روایت پر دوبارہ نظر ڈالئے آپ دیکھیں گے کہ دراصل دو روایتیں بیان کی گئی ہیں ایک وہ جو ابو بکر اور جعفر نے علی سے اور علی نے معلی سے روایت کی ہے اس میں نبی صلعم کا کوئی ذکر نہیں ہے ظاہر ہے کہ یہ حدیثِ نبوی نہیں بلکہ عبداللہ بن عباس کا اثر ہے۔ اس اثر کے راویوں میں ابتدائی تین راوی مجہول ہیں اور معلی منکر حدیثیں بیان کرنے والا بلکہ بعض کے نزدیک تو کذاب ہے۔ (۱۲)

دوسری روایت میں نبی صلعم کا ذکر ہے اور اس میں حاکم نے دو راوی بیان کئے ہیں یعنی ابو یونس جو سماک بن حرب سے روایت کرتے ہیں۔ سماک اور نبی صلعم کے درمیان دو ورنہ کم از کم ایک راوی یعنی صحابی مفقود ہے۔ یہاں حاکم نے یہ نہیں بتایا کہ ابو یونس سے حاکم تک یہ روایت کس نے بیان کی۔ اس کا سلسلہ روایت حاکم نے کیوں نہیں بتایا؟ اس سلسلہ میں عکرمہ کا نام کیوں نہیں آیا؟ اوپر کے راوی سماک کا نام درمیانی راوی کے بعد کیسے آگیا۔ راویوں کے سلسلہ کی تحقیق میں یہ سوال لازماً پیدا ہوتے ہیں ان سب کے جواب سے حاکم خاموش ہیں کیا عجب کہ دونوں روایتوں میں اختلاط ہو گیا ہو جس کی وجہ سے یہ پتہ لگانا ممکن نہیں کہ اصل حدیث یا اثر کا

سلسلہ کیا ہے۔ اس سقم کے باوجود حاکم کا یہ فیصلہ کہ روایت بخاری کی شرط پر صحیح ہے بہت مشکوک ہے حاکم کے اس بیان پر تعجب ہوتا ہے اس لئے کہ خود ان ہی کا بیان ہے کہ بخاری اور عکرمہ کی ہر روایت درج نہیں کرتے بلکہ وہی روایت لیتے ہیں جو ان کے نزدیک صحیح ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ابو یونس سے خالد کا واقعہ ان تک پہنچا۔ لیکن سند یا متن یا دونوں حیثیتوں سے صحیح ثابت نہیں ہوا لہذا انھوں نے اختیار نہیں کی۔ اس میں بخاری سے کیا کوتاہی ہوئی۔

بحث کا خلاصہ یہ کہ اثر کے بعض راویوں کے مجہول یا منکر و ضعیف ہونے اور سلسلہ روایت کے متصل نہ ہونے کی وجہ سے نہ اثر صحیح ثابت ہوتا ہے اور نہ حدیث۔ فن اصول روایت کا فیصلہ یہی ہے۔

علماء سلف کی کتابوں میں خالد کی روایت کا جہاں جہاں پتہ لگ سکا۔ ان کے علمی مرتبہ کے لحاظ سے وہ تمام روایتیں پیش کر دی گئیں۔ اور سلسلہ روایت نیز راویوں کی فنی تنقید، جرح و تعدیل کی کتابوں سے درج کی گئی۔ جس سے حدیث خالد کا درجہ کسی نہ کسی حد تک متعین ہو گیا۔ اب واقعہ کی درایتاً جو تنقید ہو سکتی ہے وہ پیش ہے۔

ہماری یہ فنی تنقید ناقص رہے گی اگر ہم متنِ حدیث کی تنقیح سے پہلے ایک اور محدث ابو نعیم کی روایت کا ذکر نہ کریں جو بحیثیت محدث عام ادیبوں اور مورخوں سے زیادہ معتبر ہیں۔

ابو نعیم سے کچھ ہی پہلے عبد الملک ثعالبی متوفی ۴۲۹ھ نے بھی اپنی کتاب ثمار القلوب فی المضاف والمنسوب (۱۳) میں خالد بن سنان کا قصہ نقل کیا ہے لیکن مذکورہ صدر روایتوں میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں ان پر ثعالبی کی روایت سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ صرف تاریخی ترتیب کو قائم رکھنے کے لئے حوالہ دے دیا گیا۔

ابو نعیم احمد متوفی ۴۳۰ھ اخبار اصفہان (۱۰۴) میں کہتے ہیں۔

حدثنا احمد بن جعفر بن سعید ثنا عمر بن احمد التستری ثنا یحیی بن معلی بن منصور ثنا محمد بن الصلت ثنا قیس عن سالم عن سعید بن جبیر عن ابن عباس۔ آپ فرماتے ہیں خالد بن سنان کی بیٹی

نے نبی صلعم کے پاس حاضر ہونے کی اجازت چاہی تو آپ صلعم نے فرمایا مرحبا بابنہ ضنیتہ قومہ

اس حدیث کے ابتدائی دو راوی احمد و عمر کے متعلق ابونعیم نے کوئی تصریح نہیں کی کہ بحیثیت راوی ان کا کیا مرتبہ ہے اور نہ رجال کے مطبوعہ ذخیرہ میں ان بزرگوں کا کوئی اتا پتا ملتا ہے۔ ہمارے لئے یہ سب مجہول ہیں یہی حال درمیانی دو راویوں محمد اور قیس کا ہے ابونعیم نے ان دونوں کی کنیت یا نسبت بیان نہیں کی، جس سے ان کا سراغ لگایا جائے کیونکہ ان ناموں کے راوی بکثرت ہیں۔ ان حقایق کی روشنی میں اس روایت کے متعلق بھی یہی کہا جائے گا کہ سند کے اعتبار سے یہ روایت بھی ہمارے لئے حجت نہیں۔

یہاں تک جو روایتیں نقل کی گئیں ان میں سے صرف چار یعنی ابن سعد، مسعودی، حاکم اور ابونعیم نے اپنا اپنا سلسلۂ سند ذکر کیا ہے۔ ان سب سلسلوں کی جانچ کرنے سے معلوم ہوا کہ کوئی روایت بھی ایسی نہیں ہے جو سند کے اعتبار سے استدلال و حجت کے قابل ہو۔

یہاں یہ پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ علمار اصول حدیث نے راویوں کی کثرت و قلت کے اعتبار سے حدیث کی ابتدائی دو قسمیں متواتر اور احاد یا متواتر، مشہور و احاد قرار دی ہیں خبر احاد کی دو قسمیں مقبول و مردود ہیں۔ غرض کے سلسلہ میں کسی ایک یا ایک سے زائد راویوں کے ساقط یا کاذب ہونے یا ان میں کسی کے ثقہ، مشہور یا مجہول وغیرہ ہونے کے اعتبار سے مردود کی اور بہت سی قسمیں ہیں۔ مردود کو ضعیف بھی کہتے ہیں۔ مردود روایت۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مفید ظن نہیں ہوتی۔ اس لئے کسی درجہ میں بھی حجت نہیں۔

بعض علمار حدیث نے رد و قبول یعنی واجب العمل ہونے یا نہ ہونے کے اعتبار سے حدیث کی ابتدائی تین قسمیں مقبول، ضعیف، و مردود قرار دی ہیں ان میں سے ہر ایک کی بہت سی ذیلی قسمیں ہیں ان میں سے ہر ایک کا ایک ہی حکم ہے کہ وہ قابل حجت نہیں۔ ضعیف حدیث بعض شرطوں کے ساتھ بعض فقہا کے نزدیک مفید ظن ہوتی ہے بعض

علماء ضعیف حدیث کا حکم توقف بتاتے ہیں لیکن اہل حدیث ضعیف حدیث کو مطلقاً ناقابل حجت کہتے ہیں (۱۵)

اب اگر پہلی تقسیم کا اعتبار کیا جائے تو حدیث خالد بن سنان مردود ٹھیرتی ہے اور اگر دوسری تقسیم کا لحاظ کیا جائے تو زیادہ سے زیادہ ضعیف ثابت ہوتی ہے اور انتہائی محتاط مذہب کی رو سے اس کا حکم توقف ہے

تنقیح روایت کی بحث ختم کرتے ہوئے یہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ راویوں کی چھان بین کرنے ان کے حالات کی تحقیق کرنے اور ان پر جرح کرنے کا مقصد یہ نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے کہ خواہی نخواہی کسی کی عیب جوئی کی جائے یا کسی حدیث کو اپنے مسلک کے خلاف پاکر مردود یا ضعیف قرار دینے کے لئے راویوں کو کسی نہ کسی طرح کا اخلاقی مجرم ٹھیرایا جائے چونکہ رسول اللہ صلعم کا ہر قول و فعل حتیٰ کہ آپ کی تقریر بھی ہر مسلمان کے لئے کسی نہ کسی درجہ میں موجب یقین و عمل ہے اس لئے یہ معلوم کرنا انتہائی ضروری ہے کہ فلاں بات نبی صلعم سے ثابت ہوتی ہے یا نہیں۔

اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا بھی کچھ کم ضروری نہیں کہ کذب کے معنی خلاف واقعہ اطلاع دینا ہی نہیں بلکہ اس کے معنی خلاف یقین بیان کرنا بھی ہے۔ یہ بالکل ممکن بلکہ اغلب ہے کہ ابن سعد، حاکم یا ابونعیم نے جو کچھ روایت کی وہ ان کے یقین کے مطابق درست ہو ان معنی میں ہم ان بزرگوں پر کذب کا الزام نہیں لگا رہے ہیں۔ بلکہ ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ اصول روایت کے اعتبار سے حدیث خالد بن سنان ثابت نہیں ہوتی اور خلاصہ اس ساری بحث کا اتنا نکلتا ہے کہ سند کے اعتبار سے رسول اللہ صلعم سے اس حدیث کی نسبت کرنا (لا یصح و لا یثبت) غلط ہے، آپ سے ثابت نہیں ہوتی۔

اب تک جو آٹھ یا نو روایتیں نقل ہوئیں ان پر سرسری نظریں ڈالنے سے مجموعی طور پر دو تین امور فوراً نمایاں طور پر معلوم ہو جاتے ہیں۔ الف۔ ایک روایت کا دوسری

روایت سے تفصیل میں نفظاً و معنیً اختلاف۔ ب۔ تاریخی ترتیب سے ہم جوں جوں آگے بڑھتے جاتے ہیں روایت میں افسانہ پن اور عجوبگی بڑھتی جاتی ہے مثلاً آگ بجھانے کا واقعہ جاحظ یا ابن قتیبہ کے پاس سیدھے سادے طریقہ سے بیان کیا گیا ہے لیکن حاکم تک زمانہ گذرنے پر ایک معمولی سی روایت ایک مکمل افسانہ بن گئی۔ مسعودی یا حاکم کی روایت پڑھنے ایسا معلوم ہونے لگے گا۔ گویا ٹھنڈی چاندنی راتوں میں الاوہ کے گرد چند بدوی عرب بیٹھے سامرہ میں مصروف ہیں داستان گو یا قصہ خواں انھیں حیرت انگیز داستان سنا رہا ہے یہ ہو سکتا ہے کہ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا لوگوں کو اس حکایت کی تفصیلات معلوم کرنے کا شوق بڑھتا گیا۔ اخباریوں نے اس طلب کو پورا کرنے کے لئے روایتیں جمع کرنی شروع کیں۔ راویوں نے اس جمع و تالیف میں اس بات کا خیال نہیں رکھا کہ فراہم شدہ معلومات میں حقیقت کتنی ہے اور خیال آفرینی کتنی ان کا یہ مقصد تھا بھی نہیں۔ ج۔ تمام روایتوں میں صرف ایک ہی چیز مشترک ہے یعنی نبی صلعم نے خالد کی بابت فرمایا کہ وہ نبی تھا اس کی قوم نے اس کو ضائع کر دیا۔

اس متن ہی میں جو امور مختلف فیہ ہیں ان کی نشان دہی آسانی سے ممکن ہے مثلاً ابن سعد کی روایت میں ہے خالد کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ابو نعیم وغیرہ کہتے ہیں آپ صلعم کے پاس خالد کی لڑکی آئی تھی۔ حاکم کہتے ہیں آپ صلعم کے پاس حاضر ہونے والا شخص خالد کا بیٹا تھا مسعودی کی حکایت میں ہے خالد کے متعدد بیٹے تھے اس قسم کے نمایاں اختلافوں کو چھوڑ کر ہم متن حدیث کے مشترک جزو پر توجہ کریں گے کہ وہ زیادہ قابلِ اعتبار ہے کہ ابو نعیم کے بعد دوسرے محدثین و مفسرین نے بھی اس جزو کو اہمیت دی ہے

حدیث خالد کو قبول نہ کرنے والوں کی سب سے پہلی تحریری شہادت جاحظ کے یہاں ملتی ہے اس نے صراحت سے لکھا ہے کہ متکلمین خالد کی نبوت پر ایمان نہیں لاتے بلکہ اس کا انکار کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ خالد بن سنان بنو عبس کی قیام گاہوں کا ایک گنوار دیہاتی

تعالیٰ اللہ نے کبھی اُجڈ گنواروں میں سے کسی کو نبوت سے سرفراز نہیں کیا اور نہ خیمہ نشین خانہ بدوشوں سے کسی کو اس منصب پر فائز کیا۔ اللہ اپنے نبیوں کو شہروں اور مہذب بستیوں میں رہنے والوں ہی میں سے مبعوث کرتا رہا۔ خالد عُیَیْنَ اپنے ہم عصر شاعر متوفی سنہ ھ کی ہجو اور اپنے باپ پر فخر کرتے ہوئے کہتا ہے (۱۶)

وائی نبی کان فی غیر قومہ　　وھل کان لکم الیہ الا مع النخل

ممدوح کی قوم کے علاوہ نبی کسی اور قوم میں بھی ہوا ہے؟ اور کیا اللہ کا حکم سوائے (مہذب) مقیم آبادی کے کسی اور پر بھی نازل ہوا ہے؟ یعنی کوئی خانہ بدوش نبی نہیں ہوا۔

اس سے معلوم ہوا کہ خالد کی نبوت کے صحیح نہ ہونے پر متکلمین کے نزدیک خالص عقلی نہیں بلکہ عقلی و واقعاتی دلیل ہے یعنی تاریخ۔ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اللہ نے کسی خانہ بدوش کو نبوت سے نوازا ہو۔

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ متکلمین اس اصول کے قائل ہیں کہ کسی مسلمہ تاریخی حقیقت کے خلاف جو حدیث وارد ہو وہ صحیح نہیں ہو سکتی اس اصول کو عام اہل سنت علماء بھی صحیح سمجھتے ہیں۔ کسی حدیث کے مردود یا مقبول ہونے کا ان کے یہاں ایک معیار یہ بھی ہے کہ وہ مسلمہ تاریخی حقیقت کے معارض نہ ہو البتہ کسی خبر کے مسلمہ تاریخی حقیقت ہونے یا نہ ہونے میں اختلاف ہو سکتا ہے۔

یہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اہل عرب کا کسی چیز سے لاعلم ہونا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ وہ چیز بھی موجود نہ ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اہل عرب کسی ایسے نبی سے واقف نہیں تھے جو خانہ بدوش یا غیر مہذب آبادی میں مبعوث ہوا ہو۔ . . . .

. . . . اللہ قادر مطلق ہے وہ کسی خانہ بدوش شخص کو بھی اپنی رسالت سے نواز سکتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے تعالیٰ (۱۷) نے اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنا پیغام کہاں بھیجے۔ کہہ کر کچھ

اسی قسم کے اعتراض کی طرف اشارہ کیا ہے اس پر ایک عرب کہہ سکتا ہے کہ ہاں میں [illegible] پ تاریخی
معلومات تو یہی کہتی ہیں کہ اللہ نے کسی خانہ بدوش یا بادیہ نشیں کو نبی نہیں بنایا۔ آ [illegible] پ بتائیے کس
زمانہ میں کہاں کون سا خانہ بدوش شخص نبوت سے سرفراز ہوا؟ تاریخی اس [illegible] ستدلال کا رد تاریخی شواہد
ہی سے کیجئے۔ میں سنۃ اللہ سے استدلال کر رہا ہوں آپ قدرۃ اللہ [illegible] سے اس کا جواب دے
رہے ہیں، یہاں امکان عقلی سے نہیں امکان عادی سے استدلال کیا [illegible] جا رہا ہے۔

اس کا جواب کچھ ہو یا نہ ہو جاحظ کے بیان اور خالد علیہ [illegible] کے شعر سے اتنا تو بہرحال ثابت ہوا
کہ متکلمین اور عام عرب دونوں ہی کسی ایسے شخص سے وا [illegible] ف نہیں جو خانہ بدوش یا اجڈ گنواروں
میں سے منصب نبوت پر فائز ہوا ہو۔ چونکہ خالد بن سنان کا اہل بادیہ سے ہونا متحقق ہے اس
لئے اس کا نبی ہونا صحیح نہیں۔

متکلموں کی [illegible] س رائے پر مفردات القرآن کے مؤلف حسین راغب متوفی ۵۰۳ھ نے
قرآن سے [illegible] استدلال کیا ہے۔ محاضرات (۲ ؍ دبار ۱۸) میں لکھتے ہیں۔ اللہ نے سورۃ یوسف میں
فرمایا ہے وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِم مِّنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ أَفَلَمْ يَسِيرُوا
فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ
اتَّقَوْا أَفَلَا تَعْقِلُونَ (آیۃ ۱۰۹) اور جتنے بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے وہ سب مرد ہی تھے کہ وحی
بھیجتے تھے ہم ان کو بستیوں کے رہنے والے الخ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ جنگلی گنواروں
بادیہ نشینوں یا خانہ بدوشوں میں سے کوئی نبی نہیں ہوا بلکہ یہ سب مقیم و متمدن آبادی کے افراد تھے

قرآن ہی سے جاحظ و راغب کے قول کی مزید تائید ہو سکتی ہے مثلاً سورۃ الشعراء میں
(آیت ۲۰۸) ہے وَمَا أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ إِلَّا لَهَا مُنذِرُونَ۔ اور ہم نے کوئی ایسی بستی غارت
نہیں کی جس کے لئے (بداعتقادی اور اس کے نتائج سے) ڈرانے والے نہ ہوں۔ سورۃ القصص
میں ہے (آیت ۵۹) وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ حَتَّىٰ يَبْعَثَ فِي أُمِّهَا رَسُولًا الخ ترجمہ اور تیرا رب
ان بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہیں ہے جب تک کہ ان بستیوں میں اپنے رسول نہ بھیج دے

(باقی آئندہ)

حیات شیخ عبدالحق محدث

از

(جناب ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمن الاعظمی)

(۲)

(ب) مولانا میر کلاں محدث اکبر آبادی آپ صرف محدث نہیں استاذ المحدثین تھے، خواجہ کوہی کی اولاد میں تھے، سید میرک شاہ شیرازی (شاگرد سید جمال الدین محدث) سے حدیث اور دیگر علوم درسیہ حاصل کئے، آپ سے بقول صاحب حدائق ہندوستان کے ایک بڑے گروہ نے حدیث کو پڑھا۔ بادشاہ ہند اکبر نے شاہزادہ نور الدین جہانگیر کی تعلیم انھیں کے سپرد کی تھی، حضرت ملا علی قاری شارح مشکوٰۃ بھی ان کے شاگرد تھے، مشکوٰۃ کا کچھ حصہ انھوں نے ان سے پڑھا تھا جیسا کہ مرقات کی ابتدا میں انھوں نے خود لکھا ہے[1]، سنہ ۹۸۳ھ میں آپ نے آگرہ میں رحلت فرمائی، اور وہیں مدفون ہوئے (تذکرہ حدائق و سبحۃ المرجان ص۴۶)[2]

(ج) قاضی شیخ بہلول بدخشانی، یہ بزرگ اس عہد کے اجلۂ محدثین میں تھے، حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے شیخ الحدیث تھے، ان سے مجدد رحمۃ اللہ علیہ کو صحیح بخاری اور امام بخاری کی دوسری مصنفات مثلاً ثلاثیات بخاری، ادب المفرد، افعال العباد اور تاریخ بخاری

---

[1] ملا علی کے الفاظ یہ ہیں ثم انی قرأت بعض احادیث المشکوٰۃ علی منبع بحر العرفان مولانا الشہیر میر کلاں وھو قرأ علی زبدۃ المحققین وعمدۃ المدققین میرک شاہ ۱۲ منہ

[2] مولانا میر کلاں کا نام محمد سعید تھا اور وہ جب حج کو گئے تھے تو وہیں شیخ الحرم المکی تھے۔ ان سے سید غضنفر بن سید جعفر نہروالی نے بھی مشکوٰۃ کی سند لی تھی، اور سید غضنفر سے شیخ احمد بن علی شناوی نے سند حاصل کی (الامم ص۶۹)

کی نیز مشکوٰۃ، شمائل ترمذی، اور جامع صغیر سیوطی نیز حدیث مسلسل بالاولیہ کی اور اس کے علاوہ واحدی کی تفسیر اور دیگر مصنفات اور اسی طرح بیضاوی کی تفسیر اور دیگر مصنفات کی اجازت حاصل تھی، قاضی بہلول بدخشانی کو ان تمام چیزوں کی اجازت شیخ معظم عبدالرحمٰن بن فہد مکی سے حاصل تھی، خواجہ محمد ہاشم کشمی نے شیخ بہلول کا ذکر عالم ربانی قاضی بہلول بدخشانی کے عنوان سے کیا ہے۔ اور آزاد بلگرامی نے فرمایا[1] ہے کان من صنادید العلماء بھا (لاہور کے اکابر علماء سے تھے) اور دوسری جگہ لکھا[2] ہے کان من کبراء المحدثین بالهند (وہ ہند کے بڑے محدثوں میں تھے) مگر سبحۃ المرجان کے اس مقام پر نسخۂ اصل کے سقم کی وجہ سے غلط چھپ گیا ہے، جس کی وجہ سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ یہ فقرہ قاضی بہلول کے استاد شیخ عبدالرحمٰن کے حق میں ہے،

شیخ بہلول ہی کی خدمت میں میرزاہد ہروی (صاحب زواہد ثلثہ واستاد حضرت شیخ عبدالرحیم دہلوی) کے والد قاضی اسلم[3] نے بھی تحصیل وتکمیل علم کی (سبحۃ المرجان ص ۶۷)

(د) شیخ بہلول بن کبیر کنبو دہلوی، جن کا اصل نام عبدالرزاق ہے شاہ قمیص ساڈھوروی کے مرید وخلیفہ تھے، حضرت شیخ عبدالحق دہلوی لکھتے ہیں۔

ازاں جملہ شیخ عبدالرزاق المشہور بشیخ بہلول مرید وخلیفہ اوست جامع است میان علم شریعت وطریقت از اول فطرۃ بر نشأۃ وعبادت وتقوی وصلاح برآمدہ در عصمت ذاتی نشو ونما یافتہ وبعد تحصیل علوم دینی بتہذیب اخلاق وتبدیل صفات موفق شدہ والحق دریں زماں در زمرۂ درویشاں وسالکاں

ان میں سے شیخ عبدالرزاق المعروف شیخ بہلول شاہ قمیص کے مرید وخلیفہ ہیں، علم شریعت وطریقت کے جامع ہیں، ابتدائے پیدائش ہی سے عبادت وتقویٰ ونیکی اور ذاتی عصمت پر نشو ونما پائی ہے، تحصیل علوم کے بعد تہذیب اخلاق کی توفیق پائی، اور سچ یہ ہے کہ اس زمانہ میں درویشوں کے گروہ میں ایسے سالک اور اتباع سنت میں ایسے راسخ القدم لوگ

---

[1] سبحۃ المرجان ص ۶۷ [2] ایضاً ص ۴۲ [3] المتوفی ۱۰۶۱ھ

این چنین مردم در سلوک این طریق و رسوخ قدم در اتباع سنت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نادر و عزیز الوجود اند۔ (اخبار الاخیار ص۲۰۲)

نادر الوجود و کمیاب ہیں۔

اور شیخ عبد الصمد لکھتے ہیں

بعلم و عمل یگانہ عہد بود، دہلی دراں وقت بوجودش دہلی افتخار می زد از شکارپور بدہلی آمد و متداولات از مولانا جمال خاں و حدیث از شیخ عبد اللہ و شیخ رحمۃ اللہ کہ در عربستان بشیخین مشہور اند سند نمودہ، در ۱۰۰۷ھ ہماں جا محمل حیات بر بست (اخبار الاصفیا قلمی)

علم و عمل میں یگانۂ روزگار تھے، اس وقت دہلی ان کے وجود پر فخر کا نقارہ بجاتی تھی، شکارپور سے (جو ان کا اصلی وطن تھا) دہلی آئے اور مولانا جمال خاں سے متداولات پڑھیں اور شیخ عبد اللہ سندھی و شیخ رحمت اللہ سندھی سے جو عرب میں شیخین کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے حدیث کی سند حاصل کی، ۱۰۰۷ھ میں وہیں (دہلی) وفات پائی۔

میرا خیال ہے کہ یہ شیخ بہلول، قاضی بہلول بدخشانی کے علاوہ ہیں، وہ لاہور میں تھے اور یہ دہلی میں، وہ عبد الرحمٰن بن فہد کے شاگرد تھے یہ شیخ عبد اللہ و رحمت اللہ کے، اور تذکرہ علمائے ہند میں جن شیخ بہلول دہلوی کا ذکر ہے وہ یہی کنبو بزرگ ہیں، صاحب تذکرہ لکھتے ہیں۔

شیخ بہلول دہلوی علم حدیث را خوب ورزیدہ در صحبت اہل فقر و فنا رسیدہ با اہل دنیا کارے نداشت در عہد اکبر شاہ بافادہ و افاضہ طلاب مشغول شدہ (ص۳۳)

شیخ بہلول دہلوی نے علم حدیث کی خوب چھان بین کی ارباب باطن کی صحبتوں سے مستفید ہوئے اہل دنیا سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے عہد اکبری میں طلبۃ العلم نے ان سے خوب خوب استفادہ کیا

صاحب تذکرہ نے اگرچہ حوالہ نہیں دیا ہے مگر یہ الفاظ عبدالقادر بدایونی صاحب منتخب التواریخ کے ہیں، اور یہی شیخ بہلول ہیں جن کو فیضی اپنے خطوط بنام حضرت شیخ عبدالحق میں اسکندر مسند فقر میاں بہلول لکھا کرتا تھا اور شیخ کے واسطہ سے ان کو سلام بھجوایا کرتا تھا۔

(۸) شیخ یعقوب صوفی کشمیری، کشمیر کے مشہور عالم و مصنف و محدث میں، شیخ حسین خوارزمی کے خلیفہ تھے، حضرت مجدد الف ثانی نے ان سے حدیث پڑھی ہے (حدائق وزبدۃ المقامات) شیخ یعقوب نے حدیث کی سند شیخ ابن حجر مکی (المتوفی ۹۷۳ھ) سے حاصل کی تھی آپ نے صحیح بخاری کی شرح لکھی ہے، آپ کے حالات کے لئے اسرار الابرار (قلمی)، تذکرہ علمائے ہند ۲۵۵ حدائق الحنفیہ ۳۹۲ وغیرہ کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

شیخ یعقوب صوفی کا سال وفات ۱۰۰۳ھ ہے، حجاز سے واپسی میں آپ اپنے ساتھ بہت سی کتب تفسیر و حدیث و فقہ لائے اور ان کو خطہ کشمیر میں رواج دیا (حدائق)

(۹) خواجہ مبارک بن شیخ ارزانی فاروقی عالم باعمل اور محدث کامل تھے، آپ کے حالات کے لئے مناقب العارفین (قلمی) اور میرا مضمون "خطۂ پورب کے چند اولیاء" دیکھنا چاہئے آپ کو فن حدیث میں ید طولیٰ حاصل تھا، آپ کی تصنیفات بھی اس فن میں ہیں جن میں سے مجانی شرح مشکوٰۃ، مدارج الاخبار اور اس کی شرح معدن الاسرار کے نام ہم کو معلوم ہو سکے ہیں، آپ نے حدیث نیت، و حدیث شعب ایمان کی شرح بھی لکھی ہے، ان کے جد اعلیٰ رہتک سے بنارس آئے اور ان کے والد اور دادا وغیرہ بنارس میں آسودۂ خاک ہیں، شیر شاہ سوری کے وزیر (یا امرا میں) تھے، مگر بادشاہ کا قرب ان کے معمولات میں حارج نہیں تھا، وہ برابر خدمت علم میں مصروف رہے اور اپنے معمولات میں بھی کبھی فرق نہ آنے دیا، آپ کی وفات ۹۷۰ھ یا ۹۸۰ھ میں ہوئی

(۱۰) تاج المحدثین شیخ طاہر بن یوسف سندھی، آپ کی تصنیفات میں فوائد محمدیہ مختصر مواہب لدنیہ میں نے دیکھی ہے، وہ نسخہ ۱۰۰۲ھ میں نقل کیا گیا تھا، لہٰذا کتاب کی

تالیف یقیناً اس سے پہلے ہے اور چونکہ یہ کتاب مواہب لدنیہ کا اختصار ہے جس کا سال تصنیف ۸۹۹ھ ہے اس لئے بے شک وشبہ مصنف فوائد محمدیہ شیخ طاہر بن یوسف دسویں صدی ہجری کے عالم ومحدث ہیں۔ سردست اس سے زیادہ شیخ طاہر کے حالات میرے علم میں نہیں ہیں۔

ان سطور کو لکھنے کے بعد خوش قسمتی سے مجھے ترجمہ گلزار ابرار ہاتھ آگیا۔ اس میں شیخ طاہر مذکور کے جو حالات مذکور ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔

شیخ طاہر بن یوسف بن رکن الدین بن معروف بن شہاب الدین ۹۱۰ھ کے بعد قصبہ پاتری (سندھ) میں پیدا ہوئے، صاحب ہوش ہونے کے بعد اپنے بڑے بھائی شیخ طیب اور اپنے والد کے ہمراہ ان کو سفر کا اتفاق ہوا، ہر سہ اشخاص شیخ شہاب الدین سندہی کی خدمت میں پہونچے، اور ان سے منہاج العابدین پڑھی، اس کے بعد ۹۵۰ھ میں اس گاؤں سے گجرات کی طرف کوچ کیا، اور بہروچ پہونچ کر شیخ محمد غوث گوالیاری کی صحبت بابرکت سے بہرہ ور ہوئے، یہاں سے دکن پہنچے اور شیخ محمد ملتانی کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے، شیخ محمد ملتانی شیخ بہاء الدین قادری کے خلیفہ تھے، اس کے بعد ایرچ پور (برار) میں قیام پذیر ہوئے، اور یہیں اپنے پیر سے خرقہ خلافت پایا، اور یہیں مدتوں . . . . : مجلس درس وافادہ گرم رکھی، پھر والی خاندیس کی التماس پر برہان پور منتقل ہو گئے اور وہیں قیام رہا۔

۱۰۰۳ھ میں بہت سی تصانیف یادگار چھوڑ کر وفات پائی آپ کی تصانیف یہ ہیں تفسیر مجمع البحار، مختصر قوت القلوب مختصر مواہب لدنیہ۔ ملتقط جمع الجوامع سیوطی، موجز قسطلانی، مختصر تفسیر مدارک، اسامی رجال صحیح بخاری اور ریاض الصالحین (گلزار ابرار)

آپ کے شاگردوں میں شیخ محمد عرف تاج العاشقین بن عبداللہ سندھی المتوفی ۱۰۱۳ھ گلزار ص ۲۶۵ مسیح القلوب حضرت شیخ عیسیٰ بن قاسم سندھی برہانپوری آپ کے برادرزادہ [illegible]

۱۰۳۲ھ (کمالِ استفادہ من زبدۃ المقامات) میں

(ح) ملا شنگرف گنائی کشمیری، آپ نے شیخ ابن حجر مکی سے حدیث کی سند لی تھی صاحب تاریخ اعظمی کا بیان ہے کہ کتاب شمائل نبوی خاص آپ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے اور وہ اجازت نامہ جو پشت اسماء الرجال پر ہے شیخ ابن حجر نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیا تھا ہمارے پاس موجود ہے (حدائق تذکرہ علمائے ہند)

(ط) شیخ عبدالنبی صدر الصدور گنگوہی، حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے اور اکبر کے عہدِ حکومت میں پندرہ برس تک ہندوستان کے صدر الصدور تھے، بادشاہ کو ان سے ایسی عقیدت تھی کہ ان کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا، اگرچہ بعد میں یہ عقیدت بداعتقادی اور تعظیم اہانت میں تبدیل ہو گئی، انھوں نے چند بار حرمین شریفین جا کر وہاں کے مشائخ سے علم حدیث پڑھا تھا

صاحب تذکرہ گلزار ابرار لکھتے ہیں "رسمی علوم سے آراستہ تھے، خاص کر علم حدیث میں استادان عرب سے سند حاصل کی تھی" (ص ۲۴۱)

اور عبدالصمد بن افضل محمد بن یوسف اخبار الاصفیا (قلمی) اور ملا عزیز اللہ مداری تحفۃ الابرار (قلمی) میں لکھتے ہیں "بحکم عالی بمکہ رفت و از انجا از شیخ ابن حجر مکی سند حدیث حاصل کرد" (بادشاہ کے حکم سے مکہ گئے اور وہاں شیخ ابن حجر مکی سے حدیث کی سند لی) شیخ عبدالنبی کا رسالہ الرح علی صلوۃ القفال میں نے دیکھا ہے اس میں انھوں نے خود ابن حجر سے اپنے تلمذ کا اظہار کیا ہے۔

اس کے علاوہ ان کی ایک تصنیف سنن الھدیٰ کا ذکر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے کیا ہے، وہ کتاب بھی میں نے دیکھی ہے، اس میں مصنف نے تصریح کی ہے کہ میں نے اس کتاب کے لئے احادیث و مضامین کا انتخاب صحیحین، جامع صغیر سیوطی، شفائے قاضی عیاض، اذکار نووی، اور مقاصد حسنہ سخاوی سے کیا ہے، کتاب کا پورا نام سنن الھدےٰ فی متابعۃ المصطفےٰ ہے، کتاب کا موضوع زندگی کے تمام گوشوں میں اسوۂ نبوی کا بیان ہے

جو نسخہ میں نے دیکھا ہے وہ چھ سو بیاسی صفحات پر مشتمل ہے، مگر وہ ناقص ہے، اور میرا خیال ہے کہ اس میں آخر کا چوتھائی حصہ غایب ہے، شیخ عبدالنبی کی ان دونوں تصنیفات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو فن حدیث میں بڑا ملکہ تھا۔

شیخ کی وفات سنہ ۹۹۲ھ میں ہوئی، ان کے والد شیخ احمد بھی بڑے عالم، عارف تھے، ان کی وفات سنہ ۹۷۲ھ میں ہوئی، (گلزار ابرار)

شیخ عبدالنبی کے حالات کے لئے منتخب التواریخ بدایونی، اخبار الاصفیا، تحفۃ الابرار گلزار ابرار، تذکرہ علمائے ہند، طرب الاماثل اور حدائق الحنفیہ کا مطالعہ کرنا چاہیے، اخبار الاخیار مطبوعہ مجتبائی دہلی سنہ ۱۳۰۹ھ میں ان کو شیخ رکن الدین کا بیٹا لکھا ہے، یہ صحیح نہیں ہے، وہ شیخ رکن الدین المتوفی سنہ ۹۸۳ھ کے لڑکے نہیں تھے، بلکہ ان کے بھائی شیخ احمد کے لڑکے تھے جیسا کہ زبدۃ المقامات وغیرہ میں مذکور ہے۔ اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ شیخ احمد شیخ رکن الدین کے لڑکے تھے جیسا کہ ترجمہ گلزار ابرار صفحہ ۲۱۷ میں ہے شیخ احمد حضرت شیخ عبدالقدوس کے لڑکے اور شیخ رکن الدین کے بھائی تھے،

(ی) حاجی ابراہیم سرہندی، شیخ المحدثین شیخ ابن حجر ہیثمی کی خدمت میں آپ نے حرم محترم میں رہ کر احادیث کی تصحیح کی تھی، حدیث و تفسیر کی سند میں آپ کو نسبت عالی حاصل تھی، جس زمانہ میں تمام ملک ہندوستان کو اکبر شاہ نے فتح کرلیا تھا تو اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ یہ تمام علما جو گروہ کے گروہ پایۂ تخت میں فراہم ہیں، تمام قلمرو کے ایک ایک حصہ میں ایک ایک کو مقرر کیا جائے تاکہ اس باطنی گروہ کے بابرکت انفاس کی برکت سے لوگوں کو فیض پہنچے، اس لئے ہر ایک شخص ایک جداگانہ سمت کے لئے نامزد کیا گیا، حاجی ابراہیم جس ملک میں مامور تھے وہاں سے بے اجازت دارالسلطنت لوٹ آئے، یہ بات بادشاہ کو ناگوار ہوئی اور اس نے آپ کو قلعہ رنتھنبور میں محبوس کردیا، حاجی ابراہیم نے رہائی کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوتے دیکھی اس لئے ایک رات قلعہ کی دیوار سے ایک رسی لٹکائی کہ اسی

کے سہارے نکل بھاگیں اور کہیں گمنامی کی زندگی بسر کریں مگر اتفاق سے آدمی دور پہنچے تھے کہ رسی ٹوٹ گئی اور اسی کے ساتھ ان کا رشتۂ حیات بھی منقطع ہو گیا (گلزار ابرار صفحہ ۳۸۱)

(یا) مخدوم متو ٹھٹوی، آپ کا نام رکن الدین تھا، مخدوم بلال ساکن تلہٹی (سندھ) کے خلیفہ تھے، عبادت گذاری میں نہایت بلند ہمت تھے، تذکرہ علمائے ہند میں ہے کہ "در علم حدیث غایت مہارت داشت، شرح اربعین و شرح گیلانی و رسائل دیگر از مصنفات او مشہور اند (صفحہ ۲۲۲) یعنی علم حدیث میں ان کو بے حد مہارت تھی، شرح اربعین و شرح گیلانی اور چند رسالے ان کی تصنیفات میں مشہور ہیں مخدوم نے ۹۴۹ھ میں ٹھٹہ میں وفات پائی اور آپ کی قبر کوہ منگلی پر ہے۔

(ب) سید صدر جہاں رئیس قصبۂ پہانی (ضلع ہر دوئی) اکبر بادشاہ کے زمانۂ حکومت میں شیخ عبد النبی گنگوہی صدر الصدور کے توسل سے افتاء کے عہدہ پر مامور ہوئے پھر حکیم ہمام گیلانی کے ساتھ ایران کی سفارت پر بھیجے گئے، وہاں سے لوٹنے پر صدر الصدوری اور دو ہزاری منصب ملا،

اکبر کے بعد جہانگیر نے حق استادی کی رعایت سے ان کو چہار ہزاری منصب سے سرفراز کیا، اور سرکار قنوج ان کی جاگیر میں دیا۔ نواب سید علی حسن لکھتے ہیں

مدتے بدثار علم و فضل و مترّوی بردائے صلاح و تقوی و در علم حدیث علم بود جہانگیر بادشاہ در شاہزادگی یک ہزار و چہل حدیث از وے مسند نمودہ (صبح گلشن صفحہ ۲۵)	علم و فضل سے آراستہ اور صلاح و تقوی سے پیراستہ تھے، اور علم حدیث میں ممتاز تھے جہانگیر نے عہد شاہزادگی میں ان سے ایک ہزار چالیس حدیثیں سند کی تھیں

ایک سو بیس سال کی عمر پائی اور حواس میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوا ۱۰۲۰ھ میں انتقال کیا اور اپنے مقبرہ میں بمقام پہانی مدفون ہوئے۔

(یہم) شیخ ابوالفتح تھانیسری، دسویں صدی کے نہایت متبحر عالم تھے، اکبر آباد (آگرہ) میں عقلی اور نقلی علوم کا آپ نے درس دیا اور بہت سے فضلاء نے آپ کے حلقۂ درس سے سند فضیلت حاصل کی، ملا عبدالقادر بدایونی بھی ان کے شاگرد ہیں، صاحب تذکرہ علمائے ہند لکھتے ہیں "از فحول علمائے روزگار و اعیان متبحرین عالی مقدار بود، سند علم حدیث از سید رفیع الدین محدث داشت"

(یل) میر سید ابراہیم ایرجی ثم الدہلوی، نہایت بابرکت بزرگ اور دانشمند کامل تھے، حضرت شیخ عبدالحق دہلوی فرماتے ہیں کہ ان کو تمام علوم عقلیہ و نقلیہ پر عبور تھا۔ "والحق در دہلی در زمان او ہیچ کس بدانش او نبود" (دہلی میں ان کے جیسا کوئی دوسرا عالم ان کے زمانہ میں نہ تھا) ان کی مجلس سے علماء اور مشائخ دونوں نے فیض حاصل کیا ان سے استفادہ کرنے والوں میں شیخ عبدالعزیز حسن طاہر اور شیخ رکن الدین بن عبدالقدوس گنگوہی جیسے لوگ ہیں، ۹۵۳ھ میں وفات پائی اور مقبرۂ سلطان المشائخ (دہلی) میں مدفون ہوئے۔

(یم) ملا عبداللہ بن شمس الدین انصاری مخدوم الملک، عہد اکبری کے نامور اہل علم و صاحب جاہ لوگوں میں ہیں، صاحب تذکرہ علمائے ہند نے ان کی تصنیفات میں شرح شمائل النبی کا نام لیا ہے، اور اخبار الاصفیا مصنفہ عبدالصمد بن افضل محمد میں ہے کہ "حدیث را از سید ابراہیم ایرجی استماع نمودہ" ۹۹۱ھ میں بمقام احمد آباد وفات پائی۔

(۲) حیات شیخ عبدالحق ص ۸۷ میں لکھا ہے کہ "شیخ محدث نے ابتدائی زمانہ میں ہی قرآن پاک حفظ کر لیا تھا" یہ صحیح نہیں ہے شیخ نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس و تدریس میں منہمک ہونے کے زمانہ میں قرآن پاک حفظ کیا تھا، خود فرماتے ہیں

و بعد از تحصیل و استفادہ بدرس و افادہ مشغول شد و ہمدریں ایام بتوفیق و تائید الٰہی بحفظ قرآن مجید مشرف شدہ	تحصیل علوم کے بعد درس و افادہ میں مشغول ہوا، اور انھیں دنوں میں بتوفیق الٰہی حفظ قرآن مجید سے مشرف ہوا۔

(تالیف ص ۱)

اور اس سے بھی واضح تر توصیل المرید الی المراد میں فرماتے ہیں۔

چوں بعد از فراغ تحصیل بحفظ کتاب جب فارغ التحصیل ہونے کے بعد قرآن مجید
مجید توفیق یافت برخے ازاں اوراد یاد کرنے کی توفیق پائی تو کچھ وظیفے چھوٹ گئے
از دست رفت و تلاوت قرآن مجید اور ان کی جگہ قرآن پاک کی تلاوت نعم البدل
بطریق نعم البدل بجائے آں نشست ص۲ بن گئی۔

(۳) شیخ عبدالوہاب، استاد و مربی حضرت شیخ کا سن وفات لکھنا شاید مصنف بھول گئے، شیخ عبدالوہاب متقی کی وفات ۱۰۰۱ھ میں ہوئی ہے (حدائق و تذکرہ)

(۴) ص۱۵۱ میں حضرت شیخ عبدالحق کے لوح مزار کی جو عبارت نقل کی ہے اس میں معلوم نہیں کس طرح شیخ کا سال وفات ۱۰۲۱ھ لکھا گیا، اسی طرح تاریخ رحلت فخر عالم اور اس کے نیچے دوبارہ ۱۰۲۱ھ لکھا ہوا ہے، حالانکہ مصنف خود ہی باب کی ابتدائی سطر میں ۱۰۵۲ھ سال وفات تحریر فرما چکے ہیں اور یہی صحیح ہے

فخر عالم تاریخ رحلت غلط ہے فخر العالم ۱۰۵۲ صحیح ہے۔

(۵) ص۲۵۱ میں صاحب گلزار ابرار کی نسبت لکھا ہے کہ "وہ سید محمد غوث گوالیاری سے بیعت تھے" مگر یہ صحیح نہیں ہے، شیخ محمد غوث کی وفات ۹۶۷ھ میں ہوئی ہے جیسا کہ شیخ عبدالحق محدث نے اخبار الاخیار ص۲۲۵ میں لکھا ہے اور اس وقت مصنف گلزار ابرار کی عمر کل چار برس کی تھی، پھر وہ ان سے بیعت کیوں کر ہو سکتے ہیں، خلیق صاحب نے خود ہی مصنف گلزار کا سال ولادت ۹۶۳ھ تحریر فرمایا ہے

تصانیف شیخ

اس عنوان کے ماتحت فاضل مصنف نے شیخ کی تصنیفات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ میں اس عنوان کے ماتحت شیخ کی دو تصنیفوں کی نسبت کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں

وہ دونوں ابھی تک طبع نہیں ہوئی ہیں، اور فاضل مصنف کی نگاہ سے نہیں گذری ہیں اس لئے ان کی نسبت وہ کچھ زیادہ تفصیل سے نہ لکھ سکے۔

(۱) اجازۃ الحدیث فی القدیم والحدیث، اس رسالہ کا ذکر مصنف حیات شیخ عبدالحق نے "ذاتی حالات" کے عنوان کے ماتحت کیا ہے، اس کے قلمی نسخے لکھنؤ میں موجود ہیں، مگر سرورق پر بجائے مذکورہ بالا نام کے مثبت الشیخ عبد الحق المحدث الدھلوی لکھا ہوا ہے، اور ندوہ کے نسخہ میں اسانید الشیخ عبد الحق لکھا ہوا ہے یہ چند ورق کا ایک رسالہ ہے، مختصراً اس کا موضوع بحث اساتذۂ شیخ کے ضمن میں بتایا جا چکا ہے، شیخ نے اس رسالہ میں اپنے شیوخ کے اجازت ناموں کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے۔

اوصانی سیدی عبد الوہاب المتقی بانہ ینبغی للمحدث ان یختار لنفسہ من الاسانید التی حصلت لہ من المشائخ سنداً واحداً یحفظہ لیتصل بہ الی سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم ویعود برکتہ الی حالہ فی الدنیا والدین	مجھے سیدی عبدالوہاب نے وصیت کی کہ محدث کو چاہیئے کہ جو سندیں مشائخ سے حاصل ہوئی ہیں ان میں سے ایک سند منتخب کر کے یاد کرلے تاکہ اس سند کے واسطے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اتصال پیدا کرے اور دین و دنیا میں اس کی برکت شامل حال ہو۔
فاخترت بوصیۃ الشیخ سنداً من طریق البخاری وآخر من الامام مسلم واکتفیت بھما ففیھما البرکۃ قال العبد الضعیف	شیخ کی اس وصیت کی بنا پر میں نے ایک سند بطریق امام بخاری اور دوسری بطریق امام مسلم منتخب کرلی کہ ان میں برکت ہے (اس کے بعد شیخ نے وہ دونوں سندیں ذکر کی ہیں)

عبد الحق بن سیف الدین
الدھلوی حدثنا الشیخ الولی
المقتدی عبد الوھاب الحنفی
قال حدثنا شیخنا علی بن حسام
الدین المتقی قال حدثنا
ابو الحسن البکری قال حدثنا
الزین زکریا الانصاری قال
حدثنا شھاب الدین احمد
بن حجر العسقلانی ح وحدثنا
الشیخ عبد الوھاب المتقی
قال حدثنا المسند علی بن
احمد الخبانی الازھری
الشافعی قال حدثنا شیخ
الاسلام جلال الدین
السیوطی الخ

شیخ عبد الوہاب کی یہ وصیت اہل علم کے لئے ایک زریں نصیحت ہے، اس خیال سے میں نے اس رسالہ سے یہ ٹکڑا نقل کر دیا۔

(۲) فتح المنان فی تائید مذھب النعمان، یہ حضرت شیخ کی ایک ضخیم کتاب ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ اس وقت میرے پیش نظر ہے اس کے مقدمہ سے چند اقتباسات ہدیہ ناظرین کرتا ہوں، ان سے کتاب کی نوعیت، اس کا موضوع بحث اور سبب تالیف روشنی میں آجائے گا، فرماتے ہیں

وقد وقع فی ذھن بعض القاصرین عن درك الحق وتوھموا ان مذھب الامام الشافعی موافق للاحادیث وبناءہ علیھا اغلب واظھر وسلوك الاتباع فیہ اکثر واوفر وبناء مذھب ابی حنیفۃ علی الرای والاجتھاد مخالفا للاحادیث بالاستقلال والاستبداد ولیس الامر کذلك

بعض کوتاہ فہموں کے ذہن میں یہ بات پڑ گئی ہے کہ امام شافعی کا مذہب احادیث کے مطابق ہے اور اس کی بناء احادیث پر اغلب اور اتباع اس میں زیادہ ہے اور امام ابو حنیفہ کے مذہب کی بنیاد رائے اور قیاس پر ہے اور وہ حدیث کے مستقلا خلاف ہے، حالانکہ یہ واقعہ نہیں ہے

اس کے بعد شیخ نے مذہب حنفی کے باب میں چند بنیادی باتیں ذکر کی ہیں، اور اصولی طور پر اس کا موافق احادیث ہونا ثابت کرکے لکھا ہے کہ میں جب مکہ معظمہ میں حضرت شیخ عبدالوہاب متقی کی خدمت میں مشکوٰۃ پڑھ رہا تھا تو میں بھی اس خلجان میں پڑ گیا تھا، لیکن حضرت شیخ کی شافی تقریر سے میرا خلجان دور ہوگیا، اس کے بعد جب شیخ مجھے میرے وطن رخصت کرنے لگے تو میں نے درخواست کی کہ کچھ دن اور مجھے اپنی خدمت میں رہنے کی اجازت دیجئے تاکہ مذاہب اربعہ خصوصاً مذہب حنفی و شافعی کی کماحقہ تحقیق اور چھان بین کرلوں، تو شیخ نے فرمایا کہ ان شاء اللہ یہ تم کو وہیں (ہندوستان میں) حاصل ہو جائے گا، چنانچہ آپ کے ارشاد کی برکت سے مشکوٰۃ کی شرح کے دوران میں بہت کچھ حاصل ہوگیا، لیکن بہ تمام وکمال اس امر کے حصول کا ابھی انتظار باقی تھا،

فحان طلوع صبح السعادۃ وحصل الامر علی الارادۃ فصرت ما

پس صبح سعادت کے طلوع کا وقت آگیا اور حسب خواہش وہ بات حاصل ہوگئی،

کنت قاصراً عاجزاً واجداً فائزاً فشرعت فیه مستعینا بالملک العلام راجیا بتوفیقه الاکمال والاتمام فجاء علی وجه یحصل به المقصود

اور میں عجز و قصور کے بعد کامیاب و فائز المرام ہو گیا تو میں نے خدا کی مدد سے اس کتاب کو لکھنا شروع کیا، میں خدا کی توفیق سے اس کی تکمیل کا امیدوار تھا چنانچہ وہ ایسے طریقہ پر پوری ہو گئی کہ مقصود حاصل ہو

اس کے بعد فرماتے ہیں

ثم انه قد اتفق تالیف هذا الکتاب علی طریقتین احدهما انی اقتفیت اثر صاحب المشکوۃ فی سرد الابواب والفصول واوردت من غیرها الاحادیث من سائر الاصول ونبهت فی کل فصل علی مواضع الاختلافات علی ما شرطت من ذکر الاستدلالات والمتمسکات فتم علی هذا النمط الی کتاب الجنائز اخر کتاب الصلوۃ ومن ههنا الی کتاب البیوع اخذت المسائل الاختلافیه من الکتب الفقهیة ونقلت دلائلها ومباحثها المذکورۃ ثمه فتم القسم الاول علی نمط کتب الحدیث والثانی

اس کتاب کی تالیف دو ڈھنگ سے ہوئی، کچھ دور تک یہ ہوا کہ مشکوۃ سے ابواب و فصول کے عنوان لے کر ان کے ماتحت دوسری کتابوں سے حدیثیں درج کیں، اور ہر فصل میں (تنبیہ کا عنوان قائم کر کے) اختلافی مسائل اور ہر فریق کے دلائل پر متنبہ کیا آخر کتاب الصلوۃ تک تو یوں لکھا اس کے بعد کتاب البیوع تک یہ کیا کہ فقہی کتابوں سے صرف اختلافی مسائل لے کر درج کیے اور جو دلائل وہاں مذکور تھے ان کو لکھ دیا۔

حاصل یہ کہ پہلی قسم کی تالیف کتب حدیث کے طرز پر ہوئی، اور دوسری قسم کی فقہ کے طرز پر

مثل کتب الفقہ

اخیر میں شیخ نے ماخذ کی حسب ذیل فہرست دی ہے۔

(۱) جامع الاصول، مصنفہ علامہ مجد الدین ابن الاثیر، اور اس کتاب کی توصیف میں یہ الفاظ لکھے ہیں، الکتاب الجلیل العظیم الخطیر

(۲) کتاب الجامع الکبیر، مولفہ شیخ امام علی متقی قدس سرہ (یعنی کنز العمال)

(۳) موطائے امام محمد،

(۴) کتاب الدارمی،

(۵) مشکوٰۃ کی فصل رابع جس کا اضافہ بعض علمائے ثقات نے کیا ہے

(۶) کتاب الحاوی اور اس کی شرح (فقہ شافعیہ میں)

(۷) رسالہ بن ابی زید (فقہ مالکیہ)

(۸) کتاب الخرقی اور اس کی شرح (فقہ حنابلہ میں)

میرے پیش نظر جو نسخہ ہے وہ آخر کتاب الحج تک ہے، اس میں مندرجہ ذیل بڑے بڑے عنوانات ہیں۔

کتاب[1] الایمان والاسلام، کتاب[2] العلم، کتاب[3] الطہارۃ، کتاب[4] الصلوٰۃ کتاب[5] الزکوٰۃ، کتاب[6] الصوم، کتاب[7] الحج

کتاب الصلوٰۃ تک ہر عنوان کے ماتحت متعدد ابواب اور اکثر ابواب میں متعدد فصول ہیں۔

اس کتاب میں جا بجا حضرت شیخ اپنے مشائخ حدیث کے اقوال بھی نقل کرتے ہیں، مثلاً "مسح راس" کی بحث میں لکھتے ہیں

وسمعت شیخی علی بن جار اللہ مفتی بلد اللہ الحرام ینقل من	میں نے اپنے شیخ علی بن جار اللہ مفتی مکہ سے سنا۔ وہ اپنے بعض مشائخ سے نقل

بعض مشائخہ انہ قال الانصاف — کرتے تھے کہ مسح کے مسئلہ میں انصاف امام
فی مسئلۃ المسح علی ید مالک — مالک کے ہاتھ پر ہے

اس کے بعد کی عبارت کا صحیح مفہوم نسخہ کے سقم کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آتا

اور مثلاً امامت اعمی کی بحث میں لکھتے ہیں

وذکر فی بعض الکتب انہ کان — بعض کتابوں میں مذکور ہے کہ نابینا اگر قوم کا
مقتدی القوم وعالما وقارئا — مقتدا اور عالم وقاری ہو تو اس کی امامت
لایکرہ وقد کان شیخنا الاجل — مکروہ نہیں ہے اور ہمارے شیخ اجل عبدالوہاب
الاکرم عبدالوھاب المتقی — متقی اپنی نابینائی کے باوجود امامت کرتے تھے
یؤم اصحابہ مع عماہ وقد کان — میرے دل میں ابتداءً کچھ کھٹک تھی اور ہیبت
فی نفسی منہ شیٔ ولم استطع — کی وجہ سے سوال نہیں کر سکتا تھا مگر جانتا تھا
السؤال عنہ .... — کہ وہ ترک سنت پر مداومت نہیں کر سکتے
مع علمی انہ لایترك السنۃ — تاآنکہ اشباہ ونظائر میں مجھے روایت مل گئی
ولایداوم علیہ حتی وجدت
فی کتاب الاشباہ والنظائر الروایۃ

اور رفع سبابہ کے مسئلہ میں لکھتے ہیں

وبعضھم یقولون ترکناہ لانہ — بعض کہتے ہیں ہم نے اس کو اس لئے چھوڑ
من شعار الرفضۃ سمعت — دیا کہ وہ رافضیوں کا شعار ہے میں نے اپنے
الشیخ رحمۃ اللہ علیہ یقول — شیخ رحمۃ اللہ سے سنا وہ اپنے شیخ (علی متقی)
نقلا عن شیخہ ھذا کلام سخیف — سے نقل فرماتے تھے کہ یہ بھدا کلام ہے جب
لانہ لما ثبت انہ سنۃ صحیحۃ — اس کا سنت صحیحہ ہونا ثابت ہے تو اس
فما لھم یترکونہ لمثل ھذا... — قسم کی باتوں سے اس کو کیوں چھوڑتے ہیں

... وکثیر من السنن یفعلہ الرفضۃ ولا یترک مع ان کونہ شعار الرفضۃ ممنوع وقد یفعلہ علماء السنۃ	...... بہت سی سنتیں رافضی کرتے ہیں مگر ان کو چھوڑا نہیں جاتا پھر رافضیوں کا شعار ہونا بھی تسلیم نہیں ہے جب کہ اس کو علمائے سنت کرتے آئے ہیں۔

اس کے کچھ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ شیخ امام علی متقی نے اس مسئلہ میں ایک رسالہ لکھا ہے جس میں حنفیہ کی بعض روایات کراہت کی اور اکثر سنیت کی نقل کر کے صحیح وصریح احادیث کی روشنی میں سنیت کی تائید کی ہے،

نسخۂ پیش نظر جیسا کہ میں نے اوپر بھی لکھا ہے آخر کتاب الحج تک ہے، اور شیخ نے مقدمہ میں کتاب البیوع تک لکھنا بیان کیا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ ناقص ہے، کسی کامل نسخہ کا مجھے پتہ نہیں ہے، حیدر آباد کا نسخہ بھی ناقص ہی ہے۔

میرے سامنے جو نسخہ ہے وہ ہمارے دیار کے مشہور جید عالم، مولانا محمد طاہر رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، جو مولانا سخاوت علی جونپوری کے شاگرد رشید، اور مولانا کرامت علی جونپوری کے خلیفۂ طریقت تھے، اور شیخ المشائخ حضرت شاہ محمد اسحق دہلوی سے بھی ان کو علم حدیث میں اجازت حاصل تھی، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا اجازت نامہ جو آپ نے مولانا طاہر کو مرحمت فرمایا تھا، میں نے اس کی زیارت کی ہے، اور اس کی نقل میں نے "معارف" ماہ دسمبر ۱۹۳۷ء میں شائع بھی کرادی ہے، مولانا محمد طاہر کی وفات سنہ ۱۲۹۶ھ میں ہوئی، اور اس نسخہ کا سال کتابت سنہ ۱۲۶۱ھ ہے۔

تالیفات شیخ کے فیوض وبرکات کی نسبت میں کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتا صرف نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی شہادت پیش کر دینا چاہتا ہوں کہ باہمی اختلاف مسلک کے پیشِ نظر یہ بڑی وزنی شہادت ہے نواب صاحب لکھتے ہیں

"محرر سطور را ہرچہ از فوائد ظاہر و باطن گماں کنند اکثر آں علوم و معارف در بدایت حال بطفیل مطالعۂ تالیفات حضرت شیخ، و تصنیفات حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی و اولاد ایشاں حاصل گشتہ (تقصار ص ۱۰۵)

حضرت محدث کا طرز نگارش

اس عنوان کے ماتحت بھی خلیق صاحب نے جو کچھ لکھا ہے بہت خوب لکھا ہے لیکن نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے شیخ کی بلاغتِ تحریر، حسن ادا و تعبیر کا جن لفظوں میں والہانہ اعتراف کیا ہے وہ کسی طرح نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے، یہ بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ نواب صاحب کا یہ اعتراف کشودِ خاطر و فتح باب اور ابن تیمیہ و ابن قیم اور ابن حجر و قاضی شوکانی کے مولفات پر پورا عبور حاصل ہونے کے بعد ہے۔ فرماتے ہیں

وہنوز شورش در ونۂ او (یعنی نواب صاحب) بالفاظ و عبارات شیخ دہلوی و حسن ادا و اشارات وے ہم چناں ست کہ بود، افاض اللہ علینا من برکاتہ (تقصار ص ۱۸۵)

اور ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں

وحق ایں ست کہ شیخ عبدالحق رحمہ اللہ تعالیٰ در ترجمہ عربی بفارسی یکے از افراد ایں امت است، مثل او دریں کاروبار خصوصاً دریں روزگار احدے معلوم نیست واللہ یختص برحمتہ من یشاء

معاصرین شیخ محدث

میں اس عنوان کے ماتحت اس وقت صرف ایک بزرگ نام کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں، اس لئے کہ حیات شیخ عبدالحق میں ان کا اور شیخ سے ان کی ملاقات و گفتگو کا ذکر آچکا ہے

مگران کا تعارف نہیں کرایا گیا ہے، ان بزرگ سے میری مراد حضرت میاں میر لاہوری ہیں

حضرت میاں میر کا اصل نام شیخ میر محمد اور وطن اصلی سندھ میں شہر سیوستان (جس کو سہوان اور سیوان بھی کہتے ہیں) تھا قاضی شاہ بدنہ کے خلف ارشد تھے، فضیلت ظاہری کے ساتھ باطنی کمالات میں یکتائے روزگار تھے، ۹۵۷ھ میں سوستان میں پیدا ہوئے، ساٹھ سال سے زیادہ لاہور میں اقامت کی، سلسلۂ قادریہ میں سید خضر قادری کے مرید و خلیفہ برحق تھے، شاہزادہ دارا شکوہ ان کا مرید تھا، اس نے ان کے حالات و کمالات کے باب میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے، اٹھاسی سال عمر پائی، اور ۱۰۴۵ھ میں رحلت فرمائی مزار موضع ہاشم پور میں ہے۔

میر علی شیر قانع تحفۃ الکرام میں لکھتے ہیں

شیخ میر محمد المشہور بمیاں میر پیشوائے اولیائے جہاں و قطب زماں بودہ، در فضیلت ظاہری کسے با وے بر نیامدہ۔ (تحفۃ الکرام ص ۱۳۸ / ۳۸)

اس کے بعد وہی حالات لکھے ہیں جو اوپر آپ پڑھ چکے ہیں

وھذا اٰخر ما اردنا ایرادہ الاٰن وللہ الحمد فی الاٰخرۃ والاولیٰ وعلیہ التکلان

العلم والعلماء

یہ بہت بڑے امام حدیث علامہ ابن عبد البر کی شہرہ آفاق کتاب "جامع بیان العلم وفضلہ" کا نہایت نفیس ترجمہ ہے کتاب کے مترجم مشہور ادیب اور بے مثال مترجم عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی ہیں یہ ترجمہ مولانا ابو الکلام آزاد کے ارشاد کی تعمیل میں کیا گیا تھا جو اب ندوۃ المصنفین سے شایع کیا گیا ہے۔

علم و فضیلت علم و علماء پر اس درجے کی کوئی کتاب آج تک شایع نہیں ہوئی۔ صفحات ۳۰۰، بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت، طباعت بہت عمدہ۔ قیمت چار روپے آٹھ آنے مجلد پانچ روپے آٹھ آنے

عُیُون الأخبار

از

جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق ایم۔ اے
(پروفیسر دلی کالج)

عُیُون الاخبار عربی ادب کی ایک مہتم بالشان تالیف ہے جس کو قلم بند ہوئے گیارہ سو برس سے زیادہ ہوئے، اس کے مصنف ابن قُتَیْبَہ دِیْنَوَری ہیں جو ۲۱۳ھ میں پیدا ہوئے اور جنہوں نے ۲۷۶ھ میں بغداد میں وفات پائی۔ ابن قتیبہ علمی دنیائے اسلام کی ایک ممتاز ہستی ہیں جن کو علمی دائرۃ المعارف کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ بیک وقت لُغوی، محدث، فقیہ، مورخ، ادیب اور نقاد تھے، انھوں نے لٹریچر کے مختلف اصناف پر بلند پایہ کتابیں لکھیں جن میں سے کوئی ڈیڑھ درجن آج بھی موجود ہیں دِیْنَور میں جو ایران کے صوبۂ جبال کا شہر تھا ایک عرصہ تک عباسی حکومت کی طرف سے قاضی کے عہدہ پر فائز رہے پھر اپنے منصب سے الگ ہو کر بقیہ عمر بغداد میں تعلیم تدریس اور تصنیف میں گذاری۔

عیون الاخبار ادب کی اُن تین بنیادی کتابوں میں سے ایک ہے جو اُس دور کے خاتمہ پر تصنیف ہوئیں جس کو عربی علوم و فنون کا سنہرا دور کہا جاتا ہے، تاریخ ادب میں یہ دور عباسی عہد کی پہلی صدی پر مشتمل ہے یعنی ایک سو بتیس ہجری سے دو سو بتیس ہجری تک، پہلی بنیادی ادبی تصنیف جاحظ (متوفی ۲۵۵ھ) کی اَلْبَیَان والتَّبْیِین ہے اور دوسری مُبَرِّد متوفی ۲۸۵ھ کی اَلْکَامِل، ابن قتیبہ، مبرد اور جاحظ تینوں ہم عصر تھے اور مبرد جاحظ کے شاگرد بھی تھے۔

ادب کا مفہوم اس زمانہ میں لگ بھگ وہی تھا جو آج کل جنرل نالج کا ہے،

اس کے دائرہ میں ایک طرف زمانہ جاہلیت کے عربی اشعار، ضرب الامثال، وصیتیں، حکمت و دانش سے پر ملفوظات، تقریریں، روایات، رسوم اور حالات، دوسری طرف اسلامی دور کے اشعار، ضرب الامثال، تقریریں، احادیث، مشہور اسلامی و عجمی افراد اور فرقوں کے حالات و نظریات، حکمرانوں کی تاریخ، زاہدوں کے وعظ، عشق و محبت کی داستانیں اور لطیفے شامل تھے، ادب کے یہ اجزار ترکیبی ان تینوں کتابوں میں کم و بیش موجود ہیں، ان تینوں کتابوں نے بعد کی ادبی تصانیف کے لئے نمونہ کی حیثیت اختیار کی۔ جیسا کہ میں نے ابھی بتایا ان کتابوں میں جاحظ کی البیان سب سے پہلی تصنیف ہے، مامون، معتصم اور متوکل کے زمانہ میں جاحظ کا تعلق ایک عرصہ تک عباسی سکریٹریٹ۔ اور دیوان رسائل کے مقتدر اہل قلم سے رہا تھا جس سے انھیں کلرکوں، سکریٹریوں اور وزیروں کی علمی ضروریات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ گمان غالب ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب ان ضروریات کو ملحوظ رکھ کر لکھی اور اس میں شک نہیں کہ دفتری اہل کار میں یہ کتاب ہوئی بھی بہت مقبول، جاحظ نے عام اہل علم کے مذاق اور ضرورت کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اس وقت دو قسم کے لوگ تھے، ایک خوشحال جو زندگی کے وسائل کو دل کھول کر استعمال کرتے اور دوسرے وہ لوگ جو ناداری یا کسی اور وجہ سے ترک دنیا اور ترک لذت کے قائل تھے۔ جاحظ نے اپنی کتاب میں دوسرے طبقہ کے لئے ایک طویل باب باندھا جس کا نام باب الزہد تھا۔ اس باب نے بعد کی اکثر ادبی تصانیف میں جزلاینفک کی حیثیت اختیار کرلی، یہ باب ابن قتیبہ کی عیون میں موجود ہے۔ کتاب البیان کی ایک بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں بابوں کے عنوان اور ان کے ذیل میں بیان ہونے والے مضامین میں کوئی ہم آہنگی نہیں ہے مختلف بابوں کے مضمون ایک دوسرے میں گھل مل گئے ہیں جس سے بابوں کی تقسیم بے معنی ہو کر رہ گئی ہے یہ خامی مبرد کی کامل میں البیان سے بھی زیادہ ہے اور ابن قتیبہ نے اس میں شک نہیں

کہ اس سے بچنے کی بلیغ کوشش کی مگر پوری طرح کامیاب نہ ہوسکے۔

عیون الاخبار کے شروع میں ابن قتیبہ نے ایک بسیط مقدمہ لکھا ہے جس سے کتاب کے محرک اسباب، حدود، مقاصد اور خود مصنف کی بعض آراء کی وضاحت ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"جب میں نے دیکھا کہ لوگوں میں بے علمی و بے لیاقتی عام ہوتی جاتی ہے اور بادشاہ وقت کی توجہ بازار ادب کی رونق کی طرف سے ہٹ گئی ہے تو میں نے ادب سے غفلت کرنے والے کاتبوں کی زبان و قلم کی اصلاح کے لئے ایک کتاب لکھی (اس کتاب کا نام اَدَب الکاتِب ہے) .... اس کتاب میں میں نے کاتب کو تاکید کی ہے کہ اس کے مضامین محفوظ کرنے کے علاوہ عربی کلام کا بہترین انتخاب بھی یاد کرے تاکہ اپنی انشاء میں اس کو استعمال کر سکے اور بوقت گفتگو اپنے الفاظ کو اس کے ظاہری و معنوی محاسن سے آراستہ کرے ..... کاتب کو ادب کے آلات فراہم کرنے کے بعد میرے دل میں تحریک ہوئی کہ اس کے لئے ایسا مواد بھی پیش کروں جس کو وہ ان آلات سے استعمال کر سکے، کیوں کہ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر یہ حصہ خود اس کے مذاق و انتخاب پر چھوڑ دوں تو وہ یہاں بھی سستی، اور ڈھیل سے کام لے گا اور گوہر مقصود نہ پا سکے گا اور جس طرح زبان و قلم کی صحت کی طرف بے پرواہ تھا جمال ادب سے بھی بے توجہی برتے گا اور اگر اس کی طرف مائل بھی ہوا تو نہ گرمی شوق اس کے ساتھ ہوگی نہ ارادہ کی پختگی، بنا بریں میں نے ابتدار ادب کو انتہا تک پہنچا دیا ......" اگرچہ یہ کتاب قرآن، سنت اور علم دین کے بارے میں نہیں ہے تاہم اس کا موضوع "عالی مقاصد" ہیں، یہ عمدہ اخلاق کی طرف رہنمائی کرتی ہے، دنائت سے روکتی ہے، ناشائستہ امور سے باز رکھتی ہے حسن تدبیر، نرم سیاست اور زمین کی آبادکاری کی ترغیب دیتی ہے خدا تک پہنچنے کا بس ایک ہی طریقہ نہیں ہے اور نہ ساری بھلائیاں تہجد، روزہ اور حلال و حرام کے

علم ہی میں منحصر نہیں بلکہ خدا تک پہنچنے کے بہت سے طریقے ہیں اور بھلائی کے راستے خوب فراخ ہیں، دین کی صلاح ماحول کی صلاح سے ہے اور ماحول کی صلاح بادشاہ کی صلاح سے ہے اور بادشاہ کی صلاح توفیق الٰہی کے بعد راست روی اور معاملات کی خوش فہمی پر موقوف ہے . . . .

"میں نے اس کتاب میں علماء اور عقلمندوں کے افکار کا نچوڑ پیش کیا ہے، اس میں ادب کے دُرہائے شاہوار، انسانی غور و تدبر کے پھل، بلیغ مقرروں کے کلام کے بہترین نمونے، شاعروں کے پُر حکمت اشعار، بادشاہوں کی سیرت اور سلف کے واقعات و حالات جمع کئے ہیں . . . . .

"یہ بات مجھے درست معلوم نہیں ہوئی کہ اس کتاب کے مخاطب بس دنیا کے متوالے ہوں، یا صرف خاص لوگ یا بادشاہ، اور اہل آخرت، عوام اور معمولی لوگوں کی دلچسپی کی اسمیں رعایت نہ کی جاتے؟ پس میں نے ہر طبقہ کے لوگوں کے مذاق کو پیش نظر رکھا اور کتاب میں زاہدوں اور ترک دنیا کرنے والوں، دنیا کی تباہیوں، ناپائداری اور انقلاب کے بارے میں بہترین فرمودات پیش کئے . . . . ساتھ ہی ساتھ پُر لطف مکالموں، خوش بیانیوں، دلچسپ اور مضحک باتوں کو بھی نہیں چھوڑا تاکہ کتاب میں مروجہ تصنیفات کے مضامین میں سے کوئی رہ نہ جائے اور سنجیدہ و ٹھوس باتوں سے قاری کو جو تکان محسوس ہو دور ہو جائے . . . . مقدمہ کے آخر میں زاہد خشک رو سے یہ اپیل ہے: " زاہد خشک رو، کتاب میں تم کو اگر ایسی باتیں ملیں جن کو تم معیوب یا بے ہودہ خیال کر دیا جن کو پڑھ کر تم کو غصہ آئے یا لائق تضحیک نظر آئیں تو تم کتاب کے مقاصد اور ضرورت کو یاد کر کے ہم کو معذور رکھنا۔ تم کو معلوم ہو کہ اگر تم اپنی خدا پرستی کی وجہ سے ان باتوں سے بے نیاز ہو تو ایسے لوگ بھی ہیں جو ان کو روا رکھتے ہیں اور ان امور کے شیفتہ ہیں جن کو تم ناپسند کرتے ہو، یہ کتاب تمہارے لئے نہیں لکھی گئی کہ صرف

تمھاری خوشنودی کو ملحوظ رکھا جاتا اور اگر اس میں ان باتوں کے ذکر سے پرہیز کیا جاتا جو تم کو ناگوار ہیں تو یقیناً کتاب کی آدھی آب وتاب جاتی رہتی ہیں اگر کوئی ایسا قصہ یا کہانی تمہارے سامنے آئے جس میں کسی پوشیدہ امر، یا عضو یا کسی گندی بات کا ذکر ہو تو خشوع الٰہی یا خشوع الٰہی کے بہانہ کے تحت حقارت سے منہ نہ پھیر لینا کیوں کہ کسی عضو کا نام لینا گناہ نہیں ہے، گناہ یہ ہے کہ کسی کو بے آبرو کیا جائے، جھوٹ بولا جائے اور غیبت کی جائے۔[۱]"

عیون الاخبار کا کچھ حصہ پہلی بار جرمنی کے شہر ویمار (Weimar) میں مشہور مستشرق بردکلمان کے اہتمام سے ۱۸۹۸ء چھپا، اس کی نقل مصر سے ۱۹۰۷ء میں نکلی[۲] پھر پوری کتاب ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۰ء تک زیر طبع رہ کر مصر سے شایع ہوئی، یہ مکمل نسخہ دو ضخیم جلدوں میں گیارہ سو چھپن صفحوں پر مشتمل ہے۔ کتاب دس بڑے بڑے بابوں میں تقسیم ہے: (۱) کتاب السلطان (۲) کتاب الحرب (۳) کتاب السُّؤدد (۴) کتاب الطّباع والاخلاق المذمومہ (۵) کتاب العلم (۶) کتاب الزّھد (۷) کتاب الاخوان (۸) کتاب الحوائج (۹) کتاب الطّعام (۱۰) کتاب النّساء

مُبرّد کی کامل اور جاحظ کی البیان کے مقابلہ میں عیون کے ابواب میں بیّن تنوع اور ہمہ گیری ہے اور جہاں تک مضامین کا تعلق ہے اس میں بھی عیون کے ماخذوں اور انتخاب کا دائرہ نہایت وسیع ہے، مبرد نے کامل میں عرب ماخذ اور ثقافت سے شاذونادر ہی تجاوز کیا ہے اور البیان میں غیر عربی اقتباسات آٹے میں نمک سے بھی کم ہیں، ابن قتیبہ نے عربی ماخذوں اور ثقافت کے علاوہ فارسی، ہندی، اسرائیلی، عیسائی اور رومی ماخذوں اور ثقافت سے بکثرت اقتباسات لئے ہیں، اقتباسات کے علاوہ، فارسی، رومی، عیسائی اور یہودی کاہنوں، زاہدوں اور ماہرین سیاست کے اقوال اور نصیحتیں بھی نقل کی ہیں

---

[۱] مقدمہ عیون الاخبار، مطبوعہ مصر ۱۹۳۰ء [۲] تاریخ ادب جرجی زیدان ۲/ ۱۷۰

چند وہ ماخذ جن کی صاحب کتاب نے تصریح کی ہے یہ ہیں:

(۱) سیر العجم (۲) کتاب الآئین (۳) کلیلۃ ودمنۃ (۴) جاحظ کی کتاب البخلاء (۵) جاحظ کی کتاب الحیوان (۶) انجیل (۷) تورات۔

• ہر باب کی ابتدا، بالعموم کسی ایسی حدیث، صحابی یا تابعی کی ایسی رائے سے ہوتی ہے جو عنوان سے مناسبت رکھتی ہو، اس کے بعد تاریخی اجتماعی، علمی، ادبی روایتیں، مقولے اور اشعار بیان ہوتے ہیں جو عنوان باب سے ربط رکھتے ہیں اور اکثر ہر باب میں ایسا مواد بھی آجاتا ہے جو عنوان سے کوئی تعلق نہیں رکھتا یا محض سطحی تعلق پر مبنی ہوتا ہے، یہاں مختلف بابوں سے چند ایسی مثالیں پیش کرتا ہوں جن سے کتاب کی معنوی و مضمونی حیثیت پر روشنی پڑے گی اور اس بے ربطی کا بھی اندازہ ہو سکے گا:

باب الحرب: (۱) دو شخص حضرت عائشہ کے پاس آئے اور کہا کہ ابو ہریرہ نے رسول اللہ کی یہ حدیث بیان کی ہے: "شگون عورت، گھر اور سواری کے جانور سے لیا جاتا ہے" حضرت عائشہ نے طیش میں آکر کہا ابو ہریرہ نے جھوٹ بولا، رسول اللہ کے الفاظ یہ ہیں: "دورِ جاہلیت کے لوگ کہتے تھے کہ شگون سواری کے جانور، گھر اور عورت سے لیا جاتا ہے"[1]

(۲) حسین ابن علی نے احنف (قبائلی سردار متوفی ۷۱ھ) کو لکھا کہ اپنے قبیلہ کے ساتھ آکر خلافت کی مہم میں میری مدد کرو، تو احنف نے خط کا جواب نہیں دیا اور کہا: ابو الحسن (حضرت علی) کے لڑکوں کو ہم نے آزما دیکھا ان میں نہ حکمرانی کی صلاحیت ہے اور نہ روپیہ جمع کرنے کا سلیقہ، اور نہ وہ جنگی چالوں سے واقف ہیں۔[2]

باب الزهد: (۱) سفیان ثوری (متوفی ۱۶۱ھ) نے کہا: زہد یہ ہے کہ دنیا کی آرزو نہ کی جائے، موٹا کھانے اور موٹا پہننے کا نام زہد نہیں ہے۔

(۲) رسول اللہ نے کہا میرے مالک نے مجھے نو باتوں کی ہدایت کی ہے: (۱) ظاہر

[1] عیون ۲/۱۴۷ [2] عیون ۲/۲۱۱ [3] عیون ۲/۳۵۶

اور باطن میں اخلاص سے کام لوں (۲) رضا اور غضب میں انصاف کروں (۳) مفلسی اور خوش حالی میں میانہ روی اختیار کروں (۴) اگر کوئی مجھ پر ظلم کرے تو اس کو معاف کروں (۵) اگر کوئی مجھ سے کٹے تو میں اس سے جڑوں (۶) اگر کوئی مجھے محروم رکھے تو میں اس کو عطا کروں (۷) جب خاموش رہوں تو غور کروں (۸) میری بات خدا کی حمد ثنا ہو (۹) جب نظر ڈالوں تو عبرت حاصل کروں"[1]۔

کتاب السُّؤدد۔ (۱) عمر بن الخطاب سڑک پر سے گٹھلیاں اور سوت اٹھا لیتے اور جب کسی گھر کے سامنے سے گذرتے تو اس میں ڈال دیتے اور کہتے اس سے فائدہ اٹھائے[2]۔

(۲) شعبی (متوفی ۱۰۵ھ) نے کہا: ایک عرصہ تک لوگوں نے دین اور تقوی کی زندگی گذاری، پھر یہ صفت اٹھ گئی تو لوگ حیا اور ناشائستہ امور سے اجتناب کی زندگی بسر کرنے لگے، پھر یہ صفت بھی اٹھ گئی اور اب حال یہ ہے کہ نقصان سے ڈر کر یا فائدہ کی خواہش کے تحت زندگی گذارتے ہیں، میرا خیال ہے اس سے بھی بدتر زمانہ آنے والا ہے[3]۔

(۳) ابو الضحی نے کہا: میں نے عبد اللہ بن زبیر (متوفی ۷۳ھ) کے سر میں اتنا مشک دیکھا کہ اگر میرے پاس ہوتا تو میرا راس المال ہوتا[4]۔

(۴) اشعری قبیلہ کے لوگ رسول اللہ کے پاس آئے اور کہا اے رسول اللہ آپ کے بعد کوئی شخص ہمارے قبیلہ کے فلاں شخص سے زیادہ افضل نہیں ہے، وہ دن بھر روزہ رکھتے اور جب ہم مقام کرتے تو وہ رات بھر کھڑے ہو کر نماز پڑھتے، یہ سن کر رسول اللہ نے فرمایا ان کے کام کاج کون کرتا تھا؟ جواب ملا: ہم لوگ، رسول اللہ نے فرمایا: "تم سب ان سے بہتر ہو"[5]۔

(۵) عبد اللہ بن عمر (متوفی ۷۳ھ) عروہ بن زبیر (متوفی ۹۶ھ) مصعب بن زبیر

---

[1] عیون ۱/۲۶۳ [2] عیون ۳/۲۶۶ [3] عیون ۳/۲۷۹ [4] عیون ۳/۳۰۳

[5] عیون ۳/۳۲۶

متوفی سنہ ۷۲ھ اور عبد الملک بن مروان (متوفی سنہ ۸۶ھ) کعبہ کے صحن میں بیٹھے تھے، مصعب نے کہا اپنی اپنی آرزو بتاؤ، ساتھیوں نے کہا پہلے تم بتاؤ، مصعب: میری آرزو ہے کہ عراق کا گورنر بنوں اور حسین کی لڑکی سکینہ اور طلحہ کی لڑکی عائشہ سے شادی کروں، ان کی یہ آرزو پوری ہوئی، انھوں نے دونوں بیویوں کا مہر پانچ پانچ لاکھ درہم باندھا اور اتنی ہی رقم کا ہر ایک کو جہیز دیا: عروہ بن زبیر نے آرزو کی کہ فقیہ بنیں اور لوگ دور دور سے حدیثیں سننے اُن کے پاس آیا کریں۔ عبد الملک نے خلافت کی آرزو کی جو پوری ہوئی اور عبد اللہ بن عمر نے جنت کی تمنا کی۔[1]

کتاب الطباع والأخلاق المذمومة: علاء حضرمی (بحرین کے گورنر) رسول اللہ سے ملنے آئے تو آپ نے دریافت کیا تم کچھ شعر سنا سکتے ہو تو انھوں نے یہ شعر پڑھے:

تَحَیَّ ذوی الاضغانِ تَسْبِ قُلُوبَھم	تَحِیَّتُكَ القُربی فقد یُرقعُ النَّعَلُ
وَاِنْ دَحَسُوا بالشَّرِّ فَاعْفُ تَکَرُّمًا	وَاِنْ خَنَسُوا عنكَ الحدیثَ فلا تَسَلُ
فَاِنَّ الذی یُؤذیكَ مِنهُ سَماعُہ	وَاِنَّ الَّذِی قالوا وراءَكَ لَمْ یُقَلُ

۱۔ اپنے نفرت کرنے والوں کو سلام کرو، اس سے تم ان کے دل موہ لوگے۔ سلام ایسے تپاک سے کرو جیسے اپنے قریبی عزیزوں کو کرتے ہو کیوں کہ پیوند لگانے سے پھٹے جوتے جڑ جاتے ہیں۔

۲۔ وہ تم کو نقصان پہنچانے کی اگر خفیہ کارروائی کریں تو خود برائی سے بچنے کی خاطر ان کو معاف کردو اور اگر دل آزاری کی باتیں تم سے چھپائیں تو ان سے نہ پوچھو۔

۳۔ کیوں کہ تم کو اذیت ان کے سننے سے ہوتی ہے اور وہ باتیں اگر انھوں نے تمہارے پس پشت کہیں تو ایسا ہی ہے گویا کہی ہی نہیں (کیوں کہ ان کے سننے سے تم کو اذیت نہیں ہوتی)

---

[1] عیون ۳/۲۵۸

یہ اشعار سن کر رسول اللہ پھڑک اٹھے اور فرمایا: اِنَّ مِنَ الشِّعرِ حِکَمًا وَاِنَّ مِنَ البیانِ سِحرًا[1]

(۲) بچھو کو ہانڈی میں رکھ کر ہانڈی کو گلِ حکمت کرتے ہیں، پھر ہانڈی تنور میں رکھ دی جاتی ہے جب بچھو راکھ ہو جاتا ہے تو بقدر نصف دانق یا زیادہ (دانق = ۳ ۲/۴ رتی) اس شخص کو دیتے ہیں جس کے مثانہ میں پتھری ہو، یہ راکھ کسی عضو یا خلط کو نقصان پہنچائے بغیر پتھری توڑ ڈالتی ہے، بچھو کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس کو تیل میں ڈال دیتے ہیں، پھر اس کو نچوڑ کر تیل نکالا جاتا ہے، یہ تیل سخت ترین ورموں کو دور کر دیتا ہے[2]

ان مثالوں سے کتاب کے مضامین کی کچھ جھلکیاں آپ کے سامنے آگئیں، زیادہ تفصیل کا یہاں موقع نہیں مختصر یہ کہ کتاب اسلامی معارف کا گنجینہ ہے جس سے ابتدائی ڈھائی سو برس کے اسلامی تمدن، ثقافت اور افکار و آرا کی منظم تشکیل میں قیمتی مدد مل سکتی ہے۔

اب میں کتاب کے ان پہلوؤں پر کسی قدر روشنی ڈالوں گا جو مابہ الامتیاز ہیں یا جن پر مواخذہ ہو سکتا ہے۔

۱۔ کتاب میں عربی ضرب الامثال کثرت سے بیان ہوتے ہیں اور ایسی سلیس و برجستہ عربی میں ڈھلے ہیں کہ تفسیر و تنقیح کی ضرورت نہیں ہوتی۔

۲۔ مصنف نے بادیہ نشیں عربوں کے قصے حالات اور اشعار پیش کرنے میں خاص اہتمام کیا ہے۔

۳۔ کتاب میں عربی اشعار کا بہت اچھا انتخاب ہے، ایسے اشعار کی خاصی تعداد ہے جو ابو تمام کے حماسہ میں موجود ہیں، زیادہ تر اشعار ایسے ہیں جو قدرتی وحقیقی محرکات کا نتیجہ ہیں اور ایک بڑی تعداد ایسے اشعار کی بھی ہے جو صدیوں کے انسانی تجربات کا نچوڑ ہیں یا سرمدی اقدار کے حامل ہیں اور ایک مرنجاں مرنج، عالی سیرت

---

[1] عیون ۲/۱۸ [2] عیون ۲/۱۰۱

کی تعمیر میں معاون ہو سکتے ہیں۔ پوری کتاب میں تقریباً پانچ ہزار شعر ہیں جو دس بابوں پر اس طرح پھیلے ہوئے ہیں:

۱۔ کتاب السلطان۔ ۳۰۷، کتاب الحرب۔ ۳۷۶، کتاب السؤدد۔ ۶۳۲، کتاب الطباع والاخلاق المذمومۃ۔ ۲۹۲، کتاب العلم۔ ۳۱۰، کتاب الزہد۔ ۲۱۳، کتاب الاخوان۔ ۶۱۳، کتاب الحوائج۔ ۱۵۴، کتاب الطعام ۲۴۳، کتاب النساء ۶۹۴۔

۴۔ مصنف نے ایسی حدیثیں بے دریغ بیان کی ہیں جو چاہے بلحاظ اسناد قابل قبول ہوں لیکن باعتبار متن شان نبوت یا واقعات یا قدرتی قوانین کے منافی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ حدیث ملاحظہ ہو: ان للہ حرّاساً فحراسہ فی السماء الملائکۃ وحرّاسہ فی الارض الذین یاخذون الدیوان[1]

کتاب میں ایسی تصریحات بھی موجود ہیں جن سے پاک باز دل ... کرتے ہیں اور جن سے بے حیائی اور تفحش کی اشاعت ہوتی ہے۔[2]

۶۔ کتاب میں کہیں کہیں اشعار کی نسبت ایسے افراد کی طرف ہوئی ہے جن کو قدیم مبصرین ادب نے کسی اور کی طرف منسوب کیا ہے یا جن کی طرف وہ نسبت مشہور نہیں ہے:

۱۔ ساتویں باب کے صفحہ ۸۷ پر ذیل کے اشعار یحییٰ بن سعید کی طرف منسوب ہیں۔

غَذَوتُكَ مَولُوداً وَمُنتُكَ يافِعاً	تُعَلُّ بِما آتي عَلَيكَ وَتُنهَلُ
إِذا لَيلَةٌ نابَتكَ بِالشَكوِ لَم أَبِت	لِشَكواكَ إِلّا ساهِراً أَتَمَلمَلُ
كَأَنّي أَنا المَطروقُ دونَكَ بِالَّذي	طُرِقتَ بِهِ دوني وَعَيني تَهمُلُ
فَلَمّا بَلَغتَ السِنَّ وَالغايَةَ الَّتي	إِلَيها مَدى ما كُنتُ فيكَ أُؤَمِّلُ
جَعَلتَ جَزائي مِنكَ جَبهاً وَغِلظَةً	كَأَنَّكَ أَنتَ المُنعِمُ المُتَفَضِّلُ

---

[1] عیون ۱/ ۲ [2] عیون ۴/ ۴۲، ۱۰۵، ۱۸۲

یہ شعر جہاں جہاں میری نظر سے گذرے ہیں ان کی نسبت اُمیّہ بن ابی الصلت (متوفی ۹ھ) کی طرف کی گئی ہے اور تبریزی شارح حماسہ کی رائے میں بھی یہ امیہ ہی کے ہیں

۲- ساتویں باب کے گیارھویں صفحہ پر قاضی شُریح کو ذیل کے دو شعروں کا قائل بتایا گیا ہے

خُذی العفو منّی واستدیمی مودّتی — ولا تنطقی فی سورتی حین أغضبُ
فانی رأیت الحُبّ فی الصدر والأذی — إذا اجتمعا لم یلبث الحبُّ یذهبُ

یہ شعر دسویں باب کے صفحہ ۷ پر ابوالاسود دُؤلی (متوفی ۶۹ھ) کی طرف منسوب کئے گئے ہیں لیکن أغانی کے مصنف ابوالفرج (متوفی ۳۵۶ھ) کی رائے میں یہ شعر خارجہ بن اسماء فزاری کے ہیں[1]

---

[1] اغانی مصر ۱۸/ ۱۲۸

حالاتِ حاضرہ

سیاسی حالات و واقعات کا جائزہ

از

(جناب اسرار احمد صاحب آزادؔ مدیر جد و جہد)

زبان کا مسئلہ ہمارے ملک میں زبان کا مسئلہ طے ہو چکا ہے اور اگر ہمارے ملک کے بعض عاقبت نااندیش اور کوتاہ بیں مدبرین زبان سے متعلق دستورِ ہند کے فیصلہ کا احترام کر سکتے تو اس سوال کے از سرِ نو زیرِ بحث آنے کا کوئی امکان نہیں تھا لیکن اسے ملک کی بدنصیبی کہنا چاہیے کہ بعض تنگ نظر مدبرین کی غیر جمہوری سرگرمیوں کی بدولت ایک مرتبہ پھر زبان کا مسئلہ ملک کے زیرِ بحث آچکا ہے اور جو حضرات اپنی رواداری اور اعتدال پسندی کی وجہ سے کل تک زبان کے مسئلہ میں حریفوں کے حلیف سمجھے جانے کے باوجود اس مسئلہ کو خاموشی کے ساتھ حل کرانے کے خواہشمند تھے آج انھیں بھی "گذارشِ احوالِ واقعی" پر مجبور ہو جانا پڑا ہے۔

زبان کے مسئلہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ——— ملک کے دستور میں جہاں ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط کو اس ملک کی زبان اور رسم الخط تسلیم کیا گیا ہے وہیں علاقائی زبانوں کی ایک فہرست بھی دی گئی ہے اور جن جن علاقوں میں یہ زبانیں بولی جاتی ہیں وہاں انھیں سرکاری زبان تسلیم کر لئے جانے کی گنجائش بھی رکھی گئی ہے اور مذکورہ فہرست میں اردو زبان کو بھی شامل کیا گیا ہے ——— اور دستورِ ہند کی منشا کے مطابق اگرچہ ابتدا ہی سے اردو زبان کو ہندو یونین کی علاقائی زبانوں میں اس کا حقیقی مقام دیا جانا چاہیے تھا لیکن گذشتہ چند سال کی مدت میں ملک کی حکمراں جماعت کانگرس کی جانب سے دو

مرتبہ لسانی حکمت عملی کی وضاحت کے باوجود نہ صرف اردو کو نظر انداز ہی کیا جاتا رہا بلکہ بعض کوتاہ بیں افراد اور حلقوں کی طرف سے اسے مٹا دینے کی ہر ممکن کوشش بھی کی گئی اور اب جب کہ یو۔پی کی اردو بولنے والی آبادی کی جانب سے صدر جمہوریہ کی خدمت میں اردو زبان کو اس ریاست کی ثانوی سرکاری زبان تسلیم کرلئے جانے کی درخواست پر مشتمل ایک معروضہ پیش کیا جا چکا ہے مذکورہ بالا افراد اور حلقوں کی طرف سے اردو زبان کی مخالفت میں بھی شدت پیدا ہو گئی ہے۔

یہاں ان دلائل کے اعادہ کی ضرورت نہیں جو اردو کو ایک ملکی اور مشترک زبان ثابت کرنے کے لئے دی جاتی رہی ہیں پھر جو بات روز روشن کی طرح واضح ہو اُسے دلیل اور برہان سے ثابت کرنے کی کوشش تضیع وقت سے زیادہ اہمیت بھی نہیں رکھتی اس لئے اگر اردو زبان کے مخالفین کی اس دلیل کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ——— اردو مسلمانوں کی زبان ہے ——— تو بھی مخالفین اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ مسلمان بھی اس ملک کے باشندے ہیں اور دستور ہند نے انھیں ہندوستان کے حقوق شہریت سے محروم نہیں کیا پھر ملک کے تناسب آبادی کے اعتبار سے بھی انھیں ایک اہم مقام حاصل ہے اور اس لئے بھی ایک ایسی زبان کو جو اگرچہ ہندوستان کے باشندوں کی مشترک زبان ہے لیکن جسے ہٹ دھرمی سے صرف مسلمانوں کی زبان قرار دیا جا رہا ہے زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔

بہر حال ملک کے رہنماؤں اور مدبرین کی توجہات ایک مرتبہ پھر زبان کے مسئلہ کے حل پر مرکوز ہوئی ہیں اور اس مرتبہ اس کا جو حل بھی طے کیا جائے گا وہ بظاہر دیرپا اور اطمینان بخش ثابت ہو گا لیکن حکومت اور رہنماؤں سے کہیں زیادہ اردو زبان کی بقا اور ترقی کا مدار اردو بولنے والے عوام کے فیصلہ اور تعمیری مساعی پر ہے۔ اردو زبان اس وقت عالم وجود میں آئی تھی جب اس ملک کی سرکاری زبان فارسی تھی اور اسے اس عہد میں فروغ حاصل

ہوا جب انگریزی کو ملک کی سرکاری زبان قرار دے دیا گیا تھا اور تاریخ کے ان ناقابل تردید واقعات کے پیش نظر یہ نتیجہ برآمد کرنا کچھ زیادہ دشوار کام نہیں کہ اگر ملک کی اردو بولنے والی آبادی اس زبان کو زندہ رکھنا اور ترقی دینا چاہے گی تو اس کے مٹنے یا مضمحل ہو جانے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

اس سلسلہ میں بہت سی تعمیری تجاویز پیش کی جا سکتی ہیں لیکن ان کا تعلق لائحہ عمل کی ترتیب کے ساتھ ہے اور یہاں اس نئے موضوع بحث کو چھیڑنے کی گنجائش نہیں۔

مشرقی بنگال کے انتخابات عمومی

مشرقی بنگال کے انتخابات عمومی کے نتائج اور پاکستان کے ایک صوبہ میں پہلی بار مسلم لیگ کو شکست فاش دینے والی ایک جماعت کی حکومت کے قیام نے پاکستان کے دو اجزا کے مابین جس دستوری اور سیاسی کشمکش کا دروازہ کھول دیا ہے ابھی اس کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکا پھر اس کشمکش کے اثرات پاکستان ہی تک محدود نہیں رہیں گے بلکہ ان سے ہندوستان بھی متاثر ہوگا اور جنوبی مشرقی ایشیا کے ممالک بھی۔

مشرقی پاکستان کے رائے دہندگان نے انتخابات عمومی میں مسلم لیگ کو شکست فاش دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اب وہ دستور یہ پاکستان کو غیر نمائندہ قرار دے کر اسے توڑ دینے یعنی امریکہ اور پاکستان کے حالیہ معاہدہ کی تنسیخ یا پھر اس کی توثیق نہ کرنے کا مطالبہ بھی کر رہے ہیں۔ اور اگر وہ اپنے ان دونوں مطالبات کو تسلیم کرانے میں کامیاب ہو گئے تو ظاہر ہے کہ اس کے نتیجہ میں ایک جانب تو خود پاکستان میں بعض اہم تغیرات رونما ہوں گے اور دوسری طرف امریکی جنگ بازوں کے جنگی منصوبہ کا ایک اہم حصہ بے کار ہو کر رہ جائے گا لیکن ان تغیرات کے باوجود جہاں تک ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کا سوال ہے ہمیں ان میں کوئی خوشگوار تغیر رونما ہونے کی کوئی توقع نظر نہیں آتی۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہند اور پاکستان کے مابین، قضیہ کشمیر کو اہم

ترین تنازعہ کی حیثیت حاصل ہے اور اگرچہ پاکستان اور امریکہ کے حالیہ معاہدہ کی بدولت اس تنازعہ کی تصفیہ کی وہ بنیاد منہدم ہو گئی ہے جس پر گذشتہ چند سال سے تصفیہ کی عمارت تعمیر کی جاتی رہی تھی لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ جس طرح ہندوستان میں کوئی ایسی حکومت قائم نہیں رہ سکتی جو کشمیر کے معاملہ میں بے توجہی کا ثبوت دے اسی طرح پاکستان میں بھی کسی ایسی حکومت کی بقا ممکن نہیں جو اس قضیہ کو نظر انداز کر دینے کے رجحانات کا مظاہرہ کرے۔ پھر اگر مشرقی بنگال کے عوام کے مذکورہ بالا دونوں مطالبات پورے ہو سکے اور اس طرح مرکزی حکومت میں کوئی تغیر رونما ہوا یعنی امریکہ اور پاکستان کا حالیہ معاہدہ منسوخ کر دیا گیا تو پھر وہ بنیاد بھی منہدم ہو جائے گی جس پر کشمیر سے متعلق نئے نظریات کی تعمیر کی جا رہی ہے اور چونکہ پاکستان بر سر حکومت آنے والی نئی قیادت کشمیر کے مسئلہ کو نظر انداز نہیں کر سکتی اس لئے اس مسئلہ ہند اور پاکستان کے مابین پھر وہی کشمکش شروع ہو جائے گی جس کی نوعیت کو پاکستان اور امریکہ کے حالیہ معاہدہ نے یکسر تبدیل کر دیا تھا

بہرحال جہاں ہمارے ملک میں مشرقی بنگال کے انتخابات عمومی کے نتائج پر اظہار مسرت کیا جا رہا ہے وہیں معاملہ کے مذکورہ بالا پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کر دینا چاہئے۔

جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات

"بین الاقوامی سیاسی معلومات" میں سیاسیات میں استعمال ہونے والی تمام اصطلاحیں قوموں کے درمیان سیاسی معاہدوں، بین الاقوامی شخصیتوں اور تمام قوموں اور ملکوں کے سیاسی اور جغرافیائی حالات کو نہایت سہل اور دلچسپ انداز میں ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے یہ کتاب اسکولوں، لائبریریوں اور اخباروں کے دفتروں میں رہنے کے لائق ہے، جدید ایڈیشن جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد ۸ آٹھ روپے علاوہ محصول ڈاک۔

التقریظ والانتقاد

عورت اور اسلامی تعلیم[1]

از

(جناب مولانا ابو سلمہ شفیع احمد البہاری استاذ مدرسہ عالیہ کلکتہ)

عرب قبل از اسلام ظلمت کدۂ جہل تھا اور اس کا اثر زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں تھا "جنس لطیف" اور "صنف نازک" جو سکون و طمانیت اور مودت و رحمت کا باعث اور قوموں، ملکوں کی ترقی میں اہم کردار کی مالک ہے اس کی کوئی قیمت نہیں تھی بلکہ بے رحم والدین قساوۂ قلبی سے اپنے ہاتھوں قتل اولاد اور وأد بنات تک کے عادی ہو چکے تھے، جب اس کا خاندان اور قبیلہ میں کوئی احترام نہیں تھا تو سوسائٹی میں اس کی حیثیت نقط کی نہ ہوتی تو اور کیا ہوتی؟ وہ سارے حقوق سے محروم کر دی گئی تھی، وراثت کی وہ مستحق نہیں تھی، عقد ثانی سے وہ محروم اور اپنے مال و دولت پر مالکانہ تصرف کا اختیار حاصل نہیں لیکن اسلام کی یہ ضیار گستری تھی کہ عرب کے ذروں کو چمکایا اور اس کے آثار و اطلال کو منور کیا اور اس گری ہوئی متاع کو مردوں کے مقابل لا کھڑا کیا اور اس کی نظر میں مرد و عورت دونوں کی حیثیت یکساں قرار پائی اس نے صاف صاف اعلان کیا کہ

وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ	مرد اور عورت جو بھی نیک کام کرے گا۔ دراں حالیکہ وہ مومن ہو تو وہ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا ظلم نہیں کیا جائے گا۔

[1] از جناب مالک رام صاحب ایم۔ اے۔ ضخامت ۱۹۱ صفحات قیمت تین روپیہ پتہ :- نگار بک ڈپو لکھنؤ (۲) مکتبہ جامعہ اردو بازار جامع مسجد دہلی

تقدیراً الایہ اور

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً الخ

مرد و عورت جو بھی نیک کام کرے گا در آں حالیکہ وہ مومن ہو۔ ہم بے شبہ اس کو بہتر زندگی بخشیں گے

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہوا

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَاۤ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ الایہ

ان کے رب نے ان کی یہ دعا منظور کر لی کہ میں تم میں سے کسی مرد یا عورت کا عمل ضایع نہیں کروں گا۔

شریعت غرا نے نہ صرف سلبی پہلو اختیار کر کے اسے ان مصائب سے نجات دی بلکہ ایسے حقوق بھی عطا کئے جس سے اس کی حیثیت حاکمہ اور راعیہ کی ہو گئی چنانچہ فرمایا گیا

والمرأة راعية على بيت زوجها عورت اپنے شوہر کے گھر کی حاکمہ ہے۔

(البخاری)

لیکن یورپ اس بیسویں صدی میں ان عطا کردہ حقوق کا مذاق اڑا رہا ہے اس باب میں اسلامی تعلیمات کو ناکافی سمجھے ہوئے ہے۔

اس بنا پر بڑی ضرورت تھی کہ اس "کمزور طبقہ" کے اسلامی حقوق کو جمع کیا جاتا خوشی کی بات ہے جناب مالک رام صاحب ام، اے نے جو غالبیات کے ماہر اور اردو زبان کے نامور ادیب و محقق ہونے کی حیثیت سے علمی و ادبی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں اس طرف توجہ مبذول کی اور اس کمی کو پورا کیا اور زیر نظر تالیف کے ذریعہ عورت کی زندگی کے جتنے پہلو ہو سکتے ہیں ان سب کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اجاگر کیا۔

یہ مضمون پہلی مرتبہ اب سے تیرہ چودہ سال پہلے لکھا گیا تھا لیکن لائق مصنف چوں کہ اس زمانہ میں بیشتر ہندوستان سے باہر رہے اس لئے اس کی اشاعت کا انتظام نہ کر سکے اور اس اثنا میں مزید مطالعہ بھی جاری رہا اور معلومات میں اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ اس میں

تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی اور پورا مضمون از سرِ نو لکھا گیا۔

انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس التزام کے ساتھ کہ اپنے سامنے صرف قرآن مجید اور اس کی تائید میں احادیث معتبرہ ہی کو سامنے رکھا ہے تاکہ اسے کوئی شخص محض داعیانہ چیز یا تاریخی تحریف نہ کہہ سکے،

کتاب پانچ بابوں پر منقسم ہے ہر باب میں مختلف ذیلی عنوانات ہیں، پہلے باب میں بیٹی ہونے کی حیثیت دوسرے میں بیوی، تیسرے میں ماں، چوتھے میں مطلقہ و بیوہ اور پانچویں باب میں وارثہ کی حیثیت سے اسلامی تعلیمات کو نمایاں کیا گیا ہے۔

مجموعی حیثیت سے یہ کتاب مفید، پر از معلومات اور لائقِ مطالعہ ہے، پڑھنے کے بعد مؤلف کی تلاش و تحقیق اور علمی ذوق و شوق کا پورا اندازہ ہوتا ہے طرزِ بیان سنجیدہ اور متین ہے زبان صاف و سلیس ہے، اختلافی مسائل میں محتاط قلم جادۂ اعتدال سے نہیں ہٹتا ہے البتہ بعض باتیں سرسری طور پر کھٹکیں جن کی نشان دہی ذیل میں کی جاتی ہے۔

(۱) تمام مضمون میں قرآن کے حوالوں کی یہ صورت ہے کہ سورت کا نام اس کا مقام اور آیت کا نمبر تینوں (ان کے دعوی کے مطابق) دئے گئے ہیں اور اس مقصد کے پیشِ نظر مصری چھاپے کا قرآن سامنے رکھا ہے حاشیہ میں مصری چھاپے کا قرآن رکھے جانے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ

> ہندوستانی چھاپے کے قرآن میں بالعموم آیتوں کے نمبر نہیں ہوتے آپ مصری چھاپے کا قرآن اٹھا لیجئے آپ کو حوالہ نکالنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی (ص ا حاشیہ ۵)

لیکن خط کشیدہ الفاظ سے راقم الحروف کو اتفاق نہیں بلکہ اس کے برعکس ہندوستانی چھاپے کے ہر قرآن میں آیتوں کے نمبر ہوتے ہیں البتہ "تجرید قرآن" کے باعث حومن میں نہیں بلکہ حاشیہ میں رکوع کے اوپر، نیچے اور وسط میں اس طرح ع نمبر ہوتے ہیں۔ اوپر کا نمبر سورۃ کے رکوع اور بیچ کا نمبر بین الرکوعین آیت اور نیچے کا پارہ کی رکوع کو ظاہر کرتا ہے مصنف نے پہلی

جگہ ص ۳ پر آیت کا حوالہ اس طرح دیا ہے (النحل ۱۶۔۵۸۔۵۹) اس کو ہندوستانی مطبع کے لحاظ سے یوں کہہ سکتے ہیں کہ النحل ۱۶ ار کوع ۷ آیت ۸۔۹ اور یوں بھی ادا کیا جا سکتا ہے کہ پارہ ۱۴ ا رکوع ۱۳ آیت ۸۔۹ اور اگر تھوڑی سی تکلیف برداشت کی جائے تو بیچ کے نمبرات کو جمع کر کے مصری چھاپے کی طرح حوالہ دیا جا سکتا ہے مگر اس میں تکلف ہے۔

(۲) قتل اولاد کے سلسلہ میں لکھتے لکھتے یہ بھی لکھ گئے کہ

حضرۃ مریم صدیقہ کی والدہ نے بھی اپنے یہاں لڑکی (کی) پیدائش پر اظہار افسوس کیا تھا وہ چاہتی تھیں کہ لڑکا پیدا ہوتا جو ساری عمر دین کی خدمت کرتا اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا

واللہ اعلم بما وضعت ولیس الذکر کالانثی — اللہ اس لڑکی کے متعلق جو اس نے جنی ہے بہتر جانتا ہے کہ وہ آگے چل کر کیا بننے والی ہے حالانکہ اس کی ماں کا یہی خیال ہے کہ لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا بلکہ اس سے بہتر ہوتا ہے۔

اس رسم بد کے سلسلہ میں حضرت مریم صدیقہ کی والدہ کا نام لینا نہیں بھاتا اور حق یہ ہے کہ اس واقعہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے ع گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر۔ نیز آیت کا ترجمہ بھی صاف نہیں ہے لیس الذکر کالانثی واللہ اعلم بما وضعت کا بیان ہے یعنی لیس الذکر الذی طلبت کالانثی التی وھبت لہا (کشاف)

اس صورت میں اس کا یہ مطلب ہو گا کہ

اس لڑکی کی قدر و قیمت کو خدا ہی جانتا ہے جس طرح کے بیٹے کی اسے خواہش تھی وہ اس بیٹی کو کہاں پہنچ سکتا تھا یہ بیٹی بذات خود مبارک و مسعود ہے اور اس کے وجود میں ایک عظیم الشان مبارک و مسعود بیٹے کا وجود منطوی ہے (فوائد شبیریہ)

(باقی آئندہ)

ادبیات

غزل

از

(جناب الم مظفر نگری)

اگر فلک سے کوئی بجلیاں نہ برسائے
تو جذبہ نشو و نما کا چمن سے مٹ جائے

کرم جنونِ محبت ادھر بھی فرمائے
مجھے مجاز و حقیقت کا فرق سمجھائے

جسے کہ دامنِ گل پر ہیں رفعتیں حاصل
وہ قطرہ بننے کو موتی صدف میں کیوں جائے

تجلیاتِ گلستاں کا اعتبار نہ کر
چمن میں پھول نہیں بجلیوں کے ہیں سائے

ہزار حشر بدامن ہیں اس کی تاثیریں
جو نالہ تا بلب آئے اور آ کے پھر جائے

وہ لائے درجِ وفا تھے جنہوں نے گلشن میں
جگر کے داغ بہاروں میں بھی نہ دکھلائے

ورودِ گل تو پیامِ خزاں ہے ہستی میں
یہ کون مانگ رہا ہے دعا بہار آئے

رہے نہ کس لئے محرومِ لذتِ جلوہ
وہ آنکھ جس کو شبِ ہجر نیند آ جائے

بغیر عشق ہے دل کے لئے خرد بے کار
یہ رمزِ اہلِ بصیرت کو کون سمجھائے

حریفِ مصلحتِ وقت سے کوئی کہہ دے
قفس میں آ کے زیادہ نہ پاؤں پھیلائے

تجھے نظامِ کہن پر ہے اعتمادِ سکوں
تو انقلابِ گلستاں سے کیوں نہ گھبرائے

ہر ایک دشت بفیضِ بہارِ گلشن ہے
الم کہاں دلِ وحشی کو لے کے بہلائے

شکست

از

(سعید احمد اکبر آبادی)

نگوں سرِ قیصر و فغفور و خاقاں ہیں میں کیا جانوں
بزیرِ پائے غربت تاجِ شاہاں ہیں میں کیا جانوں

فشارِ زندگی میں قید انساں ہیں میں کیا جانوں
کنارِ دہر میں پوشیدہ طوفاں ہیں کیا جانوں

حریمِ عیش میں جن کے نہ تھا غم کا گزر ہرگز
وہ ہمدرد و رفیقِ غمگساراں ہیں میں کیا جانوں

فروغِ حسن و مَے سے جن کے چہرے جگمگاتے تھے
اب ان کے حال پر دشمن بھی گریاں ہیں میں کیا جانوں

غرورِ محفل آرائی تھا جن روشن چراغوں کو
چراغِ کشتۂ گورِ غریباں ہیں میں کیا جانوں

گزر شب کا نہ ہوتا تھا کبھی جن جلوہ خانوں میں
بزنگِ خانۂ مفلس وہ ویراں ہیں میں کیا جانوں

جنھیں توہینِ اربابِ وفا اک کھیل تھا گویا
وفا کا نام سنتے ہی پشیماں ہیں میں کیا جانوں

جنھیں بندِ قبا کی رازداری پر بھروسہ تھا
بفکرِ بخیہ کاریِ گریباں ہیں میں کیا جانوں

جنھیں تزئینِ بزمِ ناز ہی سے کام تھا ہر دم
شریکِ دردِ بیمارانِ ہجراں ہیں میں کیا جانوں

وہ جن کا مشغلہ تھا اہتمامِ زینت و نکہت
وہ کیوں صیدِ زبونِ یاس و حرماں ہیں میں کیا جانوں

وہ جن کے پائے نازک پر گراں تھا فرشِ مخمل بھی
وہ دشتِ پُر خطر میں پا بجولاں ہیں میں کیا جانوں

تصدق کہکشاں جس طلعتِ روشن پہ ہوتی تھی
اسی پر کچھ نشانِ سوزِ پنہاں ہیں میں کیا جانوں

وہ رخسارِ درخشاں غیرتِ مہر و مہ و انجم
مثالِ یک چراغِ زیرِ داماں ہیں میں کیا جانوں

جنھیں آرائشِ گیسو سے اک لمحہ نہ تھی فرصت
انھیں کے بال بکھرے اور پریشاں ہیں میں کیا جانوں

لبِ لعلیں تبسم کھیلتا تھا ہر گھڑی جن پر
شرر افشاں و وقفِ آہ و لرزاں ہیں میں کیا جانوں

وہ آنکھیں شعلۂ برقِ تپاں کا جن میں مسکن تھا
وفورِ گریہ سے ممنونِ داماں ہیں میں کیا جانوں

وہ جن کو نالۂ دل پر گمانِ نغمہ ہوتا تھا | وہی اب غم پسند و درد ساماں ہیں میں کیا جانوں
جنہیں میری حدیثِ غم کا سننا بارِ خاطر تھا | وہی گاتے مرے اشعار سوزاں ہیں میں کیا جانوں
مزاج لاابالی اور وہ عہدِ شباب اُن کا | پئے پوشیدگی جیب و داماں ہیں میں کیا جانوں
جو تقدیرِ محبت تھی نہ تھا ممکن اسے ٹلنا | وہ ناداں ہیں جو محجوب و پشیماں ہیں میں کیا جانوں

وہ مجھ سے پوچھتے ہیں ہائے یہ کیا ہو گیا مجھ کو
یہ اسرار و رموزِ چرخِ گرداں ہیں میں کیا جانوں

غزل

از

(جناب شارق میرٹھی ام - اے)

تجھے کیا خبر تجھے کیا پتہ، کہ کہاں کہاں سے گزر گئے | یہ مکان کیا ترے شوق میں حدِ لامکاں سے گزر گئے
کبھی یہ ہوا کہ نہ پا سکے، ترا قرب تیرا نشانِ در | کبھی بے خودیٔ سجود میں، ترے آستاں سے گزر گئے
یہ وہ راز ہے نہ سمجھ سکے، جسے اہلِ آگہی آج تک | جو تری پناہ میں آ گئے، غمِ دو جہاں سے گزر گئے
یہ جہان تیرہ و تار کیا، یہ فریبِ رنگِ بہار کیا | ملی روشنیٔ یقیں انھیں، جو ہر اک گماں سے گزر گئے
نہ فریب بو وہ سمجھ سکے، نہ حجابِ رنگ اٹھا سکے | جو بچا کے ذوقِ نگاہ کو، سرِ گلستاں سے گزر گئے
کہیں سوز و سازِ سرور ہے، کہیں شانِ جلوۂ طور ہے | دہ میں ایک عالمِ نور ہے، وہ جہاں جہاں سے گزر گئے
یہ نگاہِ شوق کی کاوشیں، یہ طلب کی راہ نمائیاں | کہ چلے جو ڈھونڈھنے ذرہ کو سرِ کہکشاں سے گزر گئے
یہ انھیں سے پوچھئے ماجرا، ہے کھلی فضاؤں میں کیا مزا | جو چمن کی قید کو توڑ کر، حدِ گلستاں سے گزر گئے
مرے گھر کو پھونک کے دے گئے، مجھے عزمِ ذوقِ کی بجلیاں | وہ جو شعلے میرے جلانے کو، مرے آشیاں سے گزر گئے

میں کہوں تو شارق زار کیا، کہ مجھے خود اس کا یقیں نہیں
کہ ابھی ابھی مرے دل میں تھے وہ ابھی یہاں سے گزر گئے

تبصرے

اثبات دین انسانی | از صوفی نذیر احمد صاحب کشمیری۔ تقطیع متوسط ضخامت ۳۳۹ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت ہے پتہ:۔ مکتبہ علمیہ عثمانی بازار حیدرآباد دکن۔

آج دنیا میں لامذہبیت اور اس کی وجہ سے جو اخلاقی اور عملی زبوں حالی عام ہو گئی ہے وہی در حقیقت دنیا کے امن و امان اور انسانی زندگی کی عافیت کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے جناب صوفی نذیر احمد صاحب نے پہلے ان حالات اور خطرات کا مذکورۂ بالا کتاب میں جائزہ لیا ہے اور پھر موجودہ زمانہ کی ایک عظیم الشان تحریک کمیونزم اور دنیا کے دو بڑے مذہب عیسائیت اور ہندو مذہب۔ ان تینوں پر تفصیلی تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ یہ تینوں نہ بنی نوع انسان کو ایک مرکز پر جمع کر سکتے ہیں اور نہ کسی ایک مضبوط اور غیر متزلزل رشتۂ وحدت کے ساتھ ان سب کو مربوط کر سکتے ہیں اس کے بعد انھوں نے بتایا ہے کہ ان تمام مصیبتوں اور پیچیدگیوں کا واحد علاج صرف اسلام کے پاس ہے اور اگر دنیا کو حقیقی امن و امان میسر آسکتا ہے تو وہ اسلام کی بنیادی تعلیمات (جس کو وہ قرآن مجید کے محکمات کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں) پر نیک نیتی کے ساتھ عمل کر کے ہی میسر آسکتا ہے، جہاں تک لائق مصنف کے بنیادی تخیل کا تعلق ہے اس سے اختلاف نہیں ہو سکتا لیکن آج کل کے عام داعیانِ اصلاح و تجدید کا جو وطیرہ بن گیا ہے، یعنی اپنی تعریف اپنے منہ سے ادعار اور متکمانہ لب و لہجہ۔ دوسروں پر طنز و تعریض۔ لب و لہجہ کی درشتی۔ غیر متوازن طریق فکر، ناہموار طرز استدلال۔ ان عیوب سے یہ بھی محفوظ نہیں سب سے پہلا سوال تو یہ ہے کہ قرآن کے آیاتِ محکمات کی تخصیص کی وجہ کیا ہے؟ کیا قرآن کا ہر ہر لفظ سرچشمۂ ہدایت ربانی نہیں ہے اور کیا اس بنا پر یہ دعویٰ خود قرآن کی دعوت کے خلاف نہیں ہے۔ پھر مصنف نے علماء کا مذاق اڑاتے ہوئے لکھا ہے کہ علمائے کرام آیات محکمات کی تعداد تک نہیں بتا سکتے (ص ۲۹۹) لیکن مصنف

کے طریق بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ خود ان کو سرے سے "محکمات" کی تعریف ہی کا پتہ نہیں ہے لیکن اس کے باوجود دعویٰ یہ ہے کہ "میرے پاس ایک ایسا یقین ہے کہ جو اس وقت شاید ہی کسی دوسرے فرد کے پاس ہو" (ص ب) اب کسی خالق باری پڑھنے والے طفل مکتب سے پوچھئے کہ اسے اصطلاح میں کیا کہتے ہیں۔ بہرحال فکر و نظر کی اس بحرانیت کے باوجود کتاب میں بہت سی باتیں کام کی بھی آگئی ہیں اور اس حیثیت سے فلسفہ و مذہب کے طالب علم کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہوگا!!

یادۂ مخمور از جناب مخمور دہلوی تقطیع متوسط ضخامت ۲۲۴ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد تین روپیہ پتہ:- کتب خانہ رحیمیہ اردو بازار دہلی

جناب مخمور دہلوی دہلی کے پرانے اور کہنہ مشق شاعر ہیں لیکن چونکہ ان کی زندگی کا بڑا حصہ باہر ہی گذرا ہے اس لئے راقم الحروف نے نہ کبھی ان کا نام سنا تھا اور نہ کلام "گذشتہ ماہ جولائی میں دہلی کی ایک مجلس میں پہلی مرتبہ ان کی ایک غزل سنی تو کافی اثر ہوا اور ان کی شاعری سے متعلق ایک اچھا خیال پیدا ہوگیا یہ کتاب موصوف کے ہی کلام کا مجموعہ ہے جناب مخمور دہلوی کا خاص میدان تغزل ہے اور حسنِ تغزل کے لئے جو اوصاف ضروری ہیں یعنی سوز و گداز درد و اثر۔ معنی آفرینی۔ حسنِ تخیل۔ سلاستِ زبان و روانی، سادگی و ندرتِ بیان۔ طرفگی ادا موصوف کی غزلیں ان سب سے بہرہ مند ہیں۔ تغزل جس قدر آسان ہے اس لحاظ سے اتنا ہی مشکل بھی ہے کہ یہ اردو شاعری کی ایک نہایت پامال و فرسودہ صنف سخن ہے اور اس میں کوئی نئی راہ پیدا کرنا دشوار ہے لیکن مخمور صاحب نے اپنی طبیعت کے سوز و گداز اور جدت آفرینی سے اس مشکل کو بھی اپنے لئے آسان کرلیا ہے تاہم سرسری مطالعہ سے جو بعض اسقام نظر آئے ان کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری ہے صفحہ سو پر ایک شعر کا مصرعہ ہے

کسی مقتدی کی نظر ہوں میں جو لڑی ہوئی ہے امام سے

نظر کا لڑنا اس وقت ہوتا ہے جب کہ آمنا سامنا ہو، اور مقتدی اور امام میں

آمنا سامنا نہیں بلکہ آگا پیچھا ہوتا ہے

صفحہ ۱۰۲ پر ایک مصرعہ ہے

میں نے جائز کر لئے ہیں سجدۂ اصنام بھی!

سجدہ مفرد ہے اور اس کی جمع آتی ہے "سجدہا" اس لئے "کر لئے ہیں" غلط ہے

"پھر اس صفحہ اور اسی غزل میں ایک مصرعہ ہے

عاقبت اندیش دانہ بھی نہیں ہے دام بھی

اس میں بجائے "عاقبت اندیش" کے "اے تغافل کیش" یا اسی کا ہم معنی کوئی اور لفظ ہونا چاہیئے تھا "عاقبت اندیش" کا کوئی موقع نہیں ہے۔

صفحہ ۹۷ پر ہے

نہ پلٹا مگر اپنی قسمت کا پانسہ بہت جیتنے کے لئے داؤں مارے

گذارش یہ ہے کہ جیتنے کے لئے تو آدمی داؤں چلتا ہے نہ کہ داؤں مارتا ہے لیکن اس طرح کے معمولی اسقام سے کلام کی مجموعی خوبی پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے امید ہے کہ ارباب ذوق اس کے مطالعہ سے شادکام و محظوظ ہوں گے۔

وحی الٰہی (جدید ایڈیشن)

مسئلہ وحی پر ایک محققانہ کتاب جس میں اس مسئلہ کے تمام گوشوں پر ایسے دل پذیر و دلکش انداز میں بحث کی گئی ہے کہ وحی اور اس کی صداقت کا ایمان افروز نقشہ آنکھوں کو روشن کرتا ہوا دل میں سماجاتا ہے جدید تعلیم یافتہ حضرات کے مطالعہ کے لائق کتاب کاغذ نہایت اعلیٰ کتابت نفیس طباعت عمدہ صفحات ۲۰۰ قیمت تین روپے مجلد للعہ

منیجر مکتبہ برہان - اردو بازار - جامع مسجد - دہلی ۶

بُرہان

شمارہ نمبر ۶ جلد ۳۲

مئی ۱۹۵۴ء مطابق رمضان المبارک ۱۳۷۳ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

مدارسِ عربیہ میں اصلاحِ نصاب کی ضرورت ایک مدت سے ہے اور بعض مدارس میں اس کا اب تک عملی تجربہ بھی ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود ملک میں علماء کی ایک بڑی تعداد ان حضرات پر مشتمل ہے جو پرانے نصاب اور اس کے طرزِ تعلیم میں سرے سے کسی اصلاح و ترمیم کی ضرورت کو محسوس ہی نہیں کرتے اور اگر کرتے بھی ہیں تو صرف اس قدر کہ ایک کتاب کی بجائے کوئی دوسری کتاب رکھ دی، نصاب میں کسی بنیادی اصلاح کی نہ ان کے ہاں ضرورت ہے اور نہ مناسب بلکہ غالباً اس طرح کا اقدام کرنا سخت نامناسب اور مضر ہے تاہم ملک کی آزادی، قیامِ پاکستان اور عام بین الاقوامی اثرات کے ماتحت خود ملک میں اور ملک سے باہر کے حالات میں جو عظیم الشان تبدیلی پیدا ہوئی ہے اس نے ان حضرات کو بھی چونکا دیا ہے جو ابھی بیدار ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے اس کا اندازہ عام فضا کے علاوہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ گذشتہ دو تین ماہ کے ہی اندر اندر پاکستان اور ہندوستان کے مختلف گوشوں سے متعدد علماء اور اربابِ مدارس کے خطوط راقم الحروف کو ملے ہیں جن میں انھوں نے ازراہِ خلوص و محبت اصلاحِ نصاب کے بارہ میں مشورہ طلب کیا اور رائے دریافت کی ہے، ارادہ بہت پہلے سے تھا مگر اب ان خطوط کو دیکھ کر اور پختہ ہو گیا کہ الگ الگ ہر ایک کو مفصل جواب دینا بہت دشوار ہے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ اسی موضوع پر ایک مقالہ لکھ دیا جائے جس میں مذکورہ بالا حضرات نے جو سوالات کئے ہیں ان کے جوابات آجائیں تاکہ دوسرے حضرات بھی۔ اگر چاہیں تو اس سے فائدہ اٹھا سکیں چنانچہ اس اشاعت میں سب سے آخر میں ایک معزز عالمِ دین کا جو مکتوب ملا ہے اس کو بعینہٖ شایع کیا جاتا ہے۔ تاکہ قارئین کو معلوم ہو جائے کہ اب خود سمجھ دار علماء اپنے دیرینہ نصاب کو کس

نظر سے نہ گذرے ہوں اور آئندہ اشاعت سے انشاء اللہ مقالہ مذکورہ شروع کر دیا جائے گا۔ وباللہ التوفیق۔

فاضل کاتب خط لکھتے ہیں۔ اس وقت یہ مکتوب جناب کی خدمت میں ایک مشورہ حاصل کرنے کی خاطر لکھا جا رہا ہے۔ مجھے اس کا پورا احساس ہے کہ جناب والا کی ذمہ داریاں اور اشغال کے پیشِ نظر اس قسم کا خط لکھنا ایک گستاخانہ جرأت سے کم نہیں۔ لیکن ہم مجبور ہیں کہ اس سلسلہ میں اور کوئی شخص ہمیں مفید مشورہ شاید نہ دے سکے کیونکہ دورِ حاضر میں آپ کو اللہ تعالیٰ نے جو علم و فضل۔ وسعتِ نظر اور قدیم و جدید علوم کے صحیح امتزاج سے نوازا ہے اس کی مثال اور کہیں نظر نہیں آتی۔ پھر آں جناب کو عرصہ سے تعلیم سے وسیع لگاؤ بھی ہے۔ عرض خدمت یہ ہے کہ ہم جیسے کم مایہ حضرات جنھوں نے خالص قدیم طریق پر درسِ نظامیہ کے نصاب کے مطابق تعلیم حاصل کی ہے۔ اگرچہ اس لحاظ سے اپنی اپنی جگہ پر خوش ہیں کہ دین اور روحِ دین سے واقفیت حاصل ہوئی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و احسان ہے لیکن دورِ حاضر کی تغیر پسند طبیعت اور انقلاب انگیز مزاج نے ایک طرف اور گرد و پیش کے حالات۔ اور علومِ جدیدہ کی وسعت اور ہمہ گیری نے دوسری طرف بہت سی مشکلات پیش کر دی ہیں۔ اور علومِ قدیمہ اور طرزِ تعلیم کا انحطاط و ضعف ایک حقیقت ہے ان حالات میں علومِ دین کو مستقبل میں صحیح صورت میں پیش کرنے کے لئے بڑی رکاوٹیں در پیش ہیں۔ قدیم طرزِ تعلیم اور علوم کا سلسلہ ایک طرف یوماً فیوماً کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے۔ اور دوسری جانب یہ لوگ جب تعلیم سے فارغ ہو جاتے ہیں تو زمانہ کا اقتضا اور ماحول کا تغیر انھیں برداشت نہیں کر سکتا۔ ان پیچیدہ حالات میں وہ لوگ عجیب و غریب کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کا ایک معتد بہ حصہ علوم دین کی تکمیل و تحصیل میں صرف کیا۔ اس کو باقی رکھنے کا کوئی صحیح راستہ نہیں پاتے ایک اور مشکل یہ ہے کہ قدیم علوم کا وہ حصہ جو زندگی کے ساتھ کوئی زیادہ لگاؤ نہیں رکھتا سوائے اس کے کہ اس سے دماغی نشو و نما۔ یا ذہنی تشحیذ

ہو، زندگی اپنے حوالی میں دوسری قسم کے علوم کا تقاضا کرتی ہے۔ جن سے یہ لوگ یک سر بے خبر ہوتے ہیں۔

ادھر جو لوگ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان کے حالات سے پورا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ دین اور علوم دین سے بڑی حد تک بے تعلق ہوتے ہیں ان کا مطمحِ نظر بھی یہ نہیں ہوتا کہ علومِ دین کا بقا واحیاء ہو۔ ان سے کبھی توقع عبث ہے کہ ان کے توسط سے دین کے بقاء کا کوئی راستہ نکل سکے۔ علماء کا ایک گروہ ایسا ہے جو اپنے قدیم طریقِ تعلیم میں کسی اصلاح وترمیم کا قائل ہی نہیں۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو قدیم علوم کے ساتھ جدید مفید وضروری علوم کی کمی کا شدید احساس کرتا ہے لیکن اپنے سامنے کوئی واضح لائحہ نہیں رکھتا جس طرح علومِ قدیمہ، صرف ونحو۔ معانی۔ اصول فقہ۔ تفسیر۔ حدیث۔ فرائض۔ تاریخ۔ ادبیات۔ فلسفہ۔ کلام مفید اور ضروری ہیں۔ اس طرح طبیعیات۔ کیمیا۔ فلکیات۔ ریاضیات۔ معاشیات واقتصادیات حساب۔ فزیالوجی۔ نفسیات وغیرہ بھی ضروری اور مفید علوم ہیں۔ لیکن ان علوم کو حاصل کرنے کا کوئی نقشہ ہمارے سامنے نہیں۔ ان حالات کے پیشِ نظر جناب والا سے عرض ہے کہ آپ ہمیں کوئی صحیح مشورہ دیں۔ اور کوئی خاکہ ایسا پیش کریں جس کے مطابق ہم درسِ نظامیہ میں کچھ اصلاحی قدم اٹھا سکیں۔ تمام علوم تو بغیر حکومتوں کی سرپرستی کے پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتے لیکن جس قدر بھی قدیم وجدید ضروری اور مفید علوم کے امتزاج کی کوئی صورت اگر ممکن ہو تو ہماری دستگیری فرمائیں۔ ہم نے یہاں مقام گوجرانوالہ میں ایک حقیر سی کوشش اس قسم کی شروع کی ہے۔ ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس مدرسہ میں جو تعلیم ہو وہ ہمیں ان پریشانیوں سے بچائے ممکن ہے اس طرح اللہ تعالیٰ کوئی مفید کام لے لے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

علومِ جدیدہ کے لئے مضامین اور کتب کا انتخاب۔ اور درجات تعلیم کا لحاظ قدیم علوم وکتب میں ضروری اصلاح، طرز تعلیم وغیرہ کے متعلق اپنی قیمتی رائے سے مستفید فرمائیں

عبد الحمید سواتی فاضل دیوبند خطیب جامع مسجد نوا محلہ گورونانک پورہ متصل گھنٹہ گھر شہر گوجرانوالہ

خالدبن سنان العبسی

(جناب ڈاکٹر محمد خالدی ام ۔ اے ۔ ڈی ۔ لٹ)

(استاذ تاریخ اسلام جامعہ عثمانیہ)

(۲)

جیساکہ ابھی اشارتاً لکھا گیا قرآن میں ایسی متعدد آیتیں ہیں جن سے اس بات پر بطریق استنباط بے تکلف استدلال کیا جاسکتا ہے کہ اللہ نے اپنے تمام رسولوں کو خانہ بدوش گلہ بانوں یا خیمہ نشین قبیلوں سے منتخب نہیں فرمایا۔ بلکہ تمام انبیا مقیم و متمدن آبادی ہی سے چنے گئے۔ لیکن اس سلسلہ میں سب سے زیادہ واضح آیت وہی ہے جس کو راغب نے نقل کیا ہے اور علماء نے بھی اس بحث کا مرکز و مدار اسی آیت کو قرار دیا ہے کہ اس کی تفسیر و تحقیق کے بعد اس موضوع پر کسی اور آیت سے استنباط یا استخراج کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ ہم بھی اپنی تحقیق کا راستہ اسی آیت کی روشنی میں تلاش کریں گے جاحظ تو معتزلی ہے ہی۔ راغب کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ وہ مذہب اعتزال کی طرف مائل تھے۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ ان دونوں نے جو بات متکلمین سے منسوب کی ہو وہ دراصل معتزلہ کا عقیدہ ہو اور متکلمین اہل سنت یہ خیال نہ رکھتے ہوں۔ اس لئے مفسرین اہل سنت سے رجوع کریں گے۔ دیکھیں وہ کیا کہتے ہیں۔ ابن جریر متوفی ۳۱۰ھ مذکورہ صدر آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں اللہ جنگلی گنواروں سے نہیں بلکہ شہر کے باشندوں میں سے کسی کو نبوت سے سرفراز کرتے ہیں کیونکہ یہ اہل علم و حلم ہوتے ہیں (۱۹) رازی لکھتے ہیں کہ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ نے اہل بادیہ میں سے کسی کو نبی نہیں بنایا رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں کہ جس نے بادیہ نشینی اختیار کی اس نے ظلم کیا (۲۰) محمد قرطبی متوفی ۶۷۱ھ الجامع لاحکام القرآن (۲۱) میں لکھتے ہیں۔ بدویوں پر قسوہ و جفا کے غلبہ کی وجہ سے اللہ نے کبھی ان میں سے کسی کو نبی نہیں بنایا اور اہل شہر ان سے بہت زیادہ عقل مند، حلیم، صاحب فضیلت و علم ہوتے ہیں۔ حسن بصری حصر کے ساتھ فرماتے ہیں کہ اللہ نے اہل بادیہ سے کسی کو نبی مبعوث نہیں فرمایا۔

قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ عبد اللہ بیضاوی متوفی ۶۸۵ھ نے اپنی تفسیر انوار التنزیل میں (۲۲) عبد اللہ نسفی متوفی ۷۱۰ھ اپنی تفسیر مدارک التنزیل میں (۲۳) علی خازن متوفی ۷۲۵ھ نے اپنی تفسیر لباب التاویل (۲۴) میں، ابن جریر رازی اور قرطبی وغیرہ سے لفظ بہ لفظ اتفاق کیا ہے۔ محمد ابن حیان متوفی ۷۵۴ھ نے البحر المحیط (۲۵) میں مذکورہ رایوں سے اتفاق تام کرنے کے علاوہ یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ سوائے دور فتن کے معمولی حالات میں شہروں اور آبادیوں سے نکل جانا مکروہ ہے۔ ابن کثیر نے صرف اتنا ہی لکھنے پر اکتفا نہیں کی ہے کہ اہل بادیہ یعنی اعراب سے کوئی نبی نہیں ہوا، بلکہ قابل تقلید دینی نقطہ نظر کی تحت قرآن و حدیث سے استدلال کرتے ہوئے اعراب کے معائب و مثالب نقل کئے ہیں۔ قرآن میں اعراب کا ذکر تقریباً دس جگہ آیا ہے سوائے ایک آدھ جگہ کے ہر جگہ مذمت کا پہلو ہے۔ بعض جگہ ضمنی طور پر اور بعض جگہ بالکل واضح ہے۔ مثلاً سورۃ التوبہ میں ہے۔ گنوار کفر و نفاق میں بہت سخت ہیں اور اسی لائق ہیں کہ وہ قاعدے نہ سیکھیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کئے ہیں۔ سورۃ الفتح میں ہے پیچھے رہ جانے والے گنوار آپ سے کہیں گے ہم اپنے مالوں اور گھر والوں کے کام میں لگے رہے۔ اب ہمارے گناہ بخشوائیے ۔ ۔ ۔ ۔ یہ اپنی زبان سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہیں۔ سورۃ الحجرات میں آتا ہے۔ گنوار کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ آپ کہئے، تم ایمان نہیں لائے پر تم کہو ہم مسلمان ہوئے اور ابھی تمہارے دلوں میں ایمان نہیں گھسا۔

صحیح حدیثوں میں بھی کئی جگہ اہل بادیہ کی سخت دلی، ناشائستگی اور کوتاہ فہمی وغیرہ کا ذکر آیا ہے۔ ان کا نقل کرنا غیر ضروری طوالت ہوگی۔ تفصیل چاہنے والے المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث میں لفظ بدا اور اس کے مشتقات دیکھیں تو اکثر حدیثیں مع حوالہ مل جائیں گی۔ (۲۶) بپیش نظر متن میں صرف قرآنی آیتوں کے ترجمہ ہی کو کافی سمجھا گیا۔ رجوع کردہ تفسیروں میں ابن کثیر کا بیان بہت واضح، صریح اور مدلل تھا اس لئے بقدر ضرورت نقل کیا گیا۔ ماضی قریب کے مفسرین جیسے مثلاً اسماعیل حقی متوفی ۱۱۲۷ھ (۲۷) محمد شوکانی متوفی ۱۲۵۰ھ (۲۸) اور محمود آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ (۲۹) نے بھی اپنے پیشروؤں سے پورا اتفاق کیا ہے۔

اسمٰعیل حقی نے تو اس موقع پر ایک ممکنہ شبہ کا بھی ازالہ کر دیا ہے جو سورۃ یوسف کی سوویں آیت کے ایک لفظ البدو سے ہو سکتا تھا۔ اس آیت کا ترجمہ مع ضروری متن وسباق یہ ہے جب سیدنا یعقوب عم مع اہل وعیال یوسف عم کے پاس پہنچے تو آپ نے (یوسف عم) اپنے والدین کو تخت پر اونچا بٹھایا اور سب اس کے آگے سجدہ میں گر پڑے اس وقت آپ نے کہا کہ۔ اے باپ! یہ ہے تعبیر اس خواب کی جو مدت ہوئی میں نے دیکھا تھا۔ میرے رب نے اسے سچا کر دکھایا اور اس نے مجھ پر احسان کیا جب کہ مجھ کو قید سے رہائی دی اور آپ سب کو گاؤں سے لے آیا۔۔ وجاء بکم من البدو ۔ اور یہ سب کچھ اس واقعہ کے بعد ہوا کہ شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں فساد ڈال دیا تھا بے شک میرا رب ان باتوں کو جو کرنی چاہیئے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔ بلاشبہ وہی سب کچھ جاننے والا اور اپنے سارے کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے۔

بادی النظر میں البدو کے لفظ سے بعض لوگوں کو شبہ ہو سکتا ہے کہ سیدنا یعقوب عم اور آپ کے اہل وعیال اہل بادیہ سے تھے کہ وہاں سے مصر آئے۔ یہاں مفسرین کے تین قول ہیں۔ الف۔ البدو ارض کنعان واقع فلسطین کے ایک شہر کا نام ہے سیکڑوں سال بعد اس کی املائی صورت بدا ہوگئی۔ جمیل کے شعر اس پر شاہد ہیں۔

وانت الذی حببت شغبا الی بدا | الیّ واوطانی بلادٌ سواھما
حللتِ بھذا حلۃً ثم حلۃً | بھذا فطاب الوادیان کلاھما

ایک دوسری جگہ کہتا ہے۔

الا قد اری الا بثینۃ للقلب | بوادی بدا لا بحسمی ولا الشغب
ولا بیصاقٍ قد تیممتُ فاعترف | لما انت لاقٍ او تنکب عن الرکب

ب۔ یعقوب عم ارض کنعان واقع فلسطین سے براہ صحراء بے آب وگیاہ چٹیل میدان سے گزرتے ہوئے مع اہل وعیال صحیح وسلامت مصر پہنچے۔ یہ اللہ کا بڑا احسان تھا کہ نہایت مخدوش و پُر صعوبت سفر میں آپ کو یا آپ کے اہل وعیال کو کسی قسم کا کوئی گزند نہیں پہنچا۔

ج۔ یعقوب عم اپنے نااہل بیٹوں سے بیزار ہوکر اور اپنے عزیز لڑکے یوسف کے غم میں عارضی طور پر شہر سے باہر مقیم ہو گئے تھے اور جب مصر چلے تو اس وقت آبادی سے دور تھے۔

اپنے اپنے ذوق وفہم کے مطابق مفسروں نے ان ہی تینوں اقوال میں سے کسی ایک کو ترجیح دی ہے اور کسی نے محض نقل پر اکتفا کی ہے لیکن ان تمام مفسروں کا اس پر اتفاق ہے کہ سیدنا یعقوب عم بہر حال اہل بادیہ سے نہیں تھے اور بعض مفسر جیسے مثلاً قرطبی (۳۰) نے یہاں پھر متنبہ کیا ہے کہ اللہ نے اہل بادیہ سے کسی کو نبوت پر سرفراز نہیں کیا (۳۱) یہاں تمام مفسروں کی رایوں کا استقصیٰ کرنا ممکن ہے اور نہ ضروری۔ یہ آٹھ نو مفسرین بالکل کافی ہوں گے۔ یہ سب کے سب اہل سنت ہیں اور ان کی تفسیریں مقبول خاص و عام بھی۔ ان کے ذریعہ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اہل بادیہ میں سے کسی کے نبی نہ ہونے پر ان سب کا اتفاق ہے۔ ان کو متکلمین سے یا متکلموں کو ان سے اس خصوص میں کوئی اختلاف نہیں۔ اختلاف نہ ہونے کی اصلی وجہ یہ ہے کہ قرآن کی یہ آیت محکم ہے متشابہ نہیں مفسروں نے قصر کے ساتھ یہ جو لکھا ہے کہ "نبی اہل شہر ہی سے ہوتے ہیں" اس کی علت بھی پیش نظر رہے تو بات بالکل واضح ہو جائے گی۔

علت کی وضاحت کے لئے معانی کی چند اصطلاحوں سے واقفیت لازمی ہے۔ معانی میں قصر کہتے ہیں ایک شئے کو دوسری شئے سے بطریق مقررہ مخصوص کرنا۔ قصر یعنی محدود کرنا عموماً چار طریقوں سے ہوتا ہے ان میں سے ایک نفی و استثنا بھی ہے جس میں مقصود علیہ صرف استثنا کے بعد ہوتا ہے۔

قصر دو طرح ہوتا ہے۔

الف۔ صفت کا قصر موصوف پر یعنی صفت اپنے موصوف سے کسی اور کی طرف تجاوز نہ کرے البتہ یہ جائز ہے کہ اس موصوف کے لئے دوسری صفات بھی ہوں۔

ب۔ موصوف کا قصر صفت پر یعنی موصوف اس صفت سے دوسری صفت کی طرف تجاوز نہ کرے البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس صفت سے دوسری شئے بھی متصف ہو سکے۔

یہاں صفت سے صفت معنوی مراد ہے نہ کہ صفت نحوی۔

قصر کی دو قسمیں حقیقی و اضافی ہیں۔ حقیقی یہ کہ ایک شئے کو دوسری شئے کے ساتھ نفس الامر اور

حقیقت میں اُس طرح مخصوص کریں کہ پہلی شے دوسری شے سے غیر کی طرف متجاوز نہ ہو۔ اضافی یہ کہ ایک شے کی تخصیص دوسری متعین شے کے ساتھ اس طرح کی جائے کہ وہ تیسری شے تک متجاوز نہ ہو۔ گو یہ ممکن ہو کہ وہ اس کے سوا کسی اور شے تک بعض صورتوں میں تجاوز کرسکے۔ قصر اضافی، مخاطب کی ذہنی حالات کے اعتبار سے افرادی، قلبی یا تعینی ہوگا۔ مثلاً کوئی کہے کہ عبداللہ نہیں بلکہ زین الدین عالم ہے تو اس مثال میں اگر مخاطب یہ سمجھتا تھا کہ عبداللہ اور زید دونوں عالم ہیں تو قصر افرادی ہوگا اور اگر یہ سمجھتا تھا کہ دونوں عالم نہیں ہیں تو یہ قصر قلب ہوا اور اگر اس کو تردد تھا کہ معلوم دونوں میں کون عالم ہے تو یہ قصر تعینی ہوا۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوحِي إِلَيْهِمْ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ

میں نحوی لحاظ سے مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ رِجَالًا کی صفت ہے یا ضمیر مجرور ہم سے حال۔ بہرحال پورا جملہ فعلیہ نُوحِي إِلَيْهِمْ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ رجالاً کی صفت ہے۔

اس طرح معانی کے لحاظ سے رجالاً مقصور علیہ موصوف اور ان کا رسول ہونا مقصور ہے۔ یہاں صفت کا قصر موصوف پر ہے اور یہ قصر اضافی ہے۔

اس تقریر کی روشنی میں زیر بحث آیت کا توضیحی ترجمہ یوں ہوگا۔ ہم نے تم سے پہلے سوائے ایسے مہذب مردوں کے جو شہروں میں رہنے والے تھے کسی اور کو (جیسے عورت، جن فرشتہ یا اجڈ گنوار) اپنا پیغمبر نہیں بنایا (گو ہم اس پر قادر ہیں کہ جس کو چاہیں بنائیں)۔

اس سلسلہ میں لفظ قریۃ کے لغوی معنی بھی دیکھ لیجیے کہ عرب اس لفظ کا استعمال کن معنوں میں کرتا ہے۔

ق، ر، ی یہ تینوں حرف جمع اجتماع اور نظم پر دلالت کرتے ہیں جس لفظ میں یہ تین حروف آئیں گے اس میں نظم، ترتیب، جمع یا اجتماع کا مفہوم لازماً آئے گا کہتے ہیں قری الماء فی المقراۃ اس نے کنڈے میں پانی جمع کیا۔ جمع شدہ پانی یا مہمانوں کے لئے سینی میں جو مختلف قسم کے کھانے رکھے جاتے ہیں وہ مجموعی طور پر قری (بکسر قاف) کہلاتا ہے۔ کولہو قرد (بفتح قاف) اس لئے کہلاتا ہے کہ اس میں روغن دار بیج جمع کرکے تیل نکالا جاتا ہے اور کولھو میں تیل نکل کر ادھر ادھر پھیلتا نہیں۔

ایسی تمام چیزیں یا اشخاص جو منظم ہوں اور ان میں یکسانی پائی جائے وہ قرو کہلاتے ہیں۔ چونکہ جمع ہونے کی کوئی غرض ہوتی ہے اس لئے قرو کے مجازی معنی قصد یا مقصد بھی ہوتے ہیں۔ پیٹھ کو قری اس لئے کہتے ہیں کہ ہڈیاں وہاں جمع ہوتی ہیں اور ریڑھ ان کو منظم رکھتی ہے۔ پرندے کے پوٹے کو قریۃ (بفتح قاف وبتشدید را، ویا) اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں پرندہ کی غذا جمع رہتی ہے۔ بادبان کے عرض کی لکڑی قریۃ (بفتح قاف بتشدید را، ویا) اس لئے کہتے ہیں کہ وہ بادبان کو متفرق ومنتشر نہیں ہونے دیتا اور اس کو ساکن رکھتا ہے۔ اگر کوئی چھت گرنے کے قریب ہو تو اس کو منہدم ہونے سے روکنے کے لئے لکڑی یا کوئی دوسری چیز لگائی جائے یا گرتی ہوئی دیوار کو منہدم ہونے سے روکنے کے لئے نیچے سے کوئی چھوٹی دیوار گرتی ہوئی دیوار سے متصل اٹھائی جائے تو یہ قریہ (مکسر قاف وتشدید را ویا) کہلاتی ہے کہ یہ چیز چھت یا دیوار کو گرنے سے روکتی ہے۔ اہل عرب کے نزدیک حیوانوں میں سب سے زیادہ منظم زندگی چیونٹی کی ہوتی ہے اس لئے ان کے رہنے کی جگہ کو قریۃ النمل کہتے ہیں۔ جب انسان آوارہ خانہ بدوش اور مسلسل ترک مقام کرنے والے نہ ہوں بلکہ ایک جگہ آباد ہوں۔ ان میں تعاون ہو اور منظم ومہذب ہوں تو ان کو اہل قریہ کہتے ہیں اور ایسے مقام کو قریہ۔ اس کی جمع قری (بضم قاف) ہے۔ مکہ کو ام القریٰ اس لئے کہتے ہیں کہ ان کی دانست میں وہ پہلا مقام ہے جس کے گرد لوگ تنظیم وترتیب سے جمع ہوئے اور یہ کہ اجتماع تنظیم اور تعاون کے دنیوی اور اخروی فوائد سب سے پہلے اسی بستی سے معلوم ہوئے۔ (۲۲)

قرآن کی اس آیت کی وضاحت کے لئے محررہ بالا تفصیل ضروری تھی تاکہ یہ اچھی طرح ثابت ہو جائے کہ صرف معتزلہ یا متکلمین ہی نہیں بلکہ اہل سنت مفسرین بھی اس آیت سے ہی استدلال کرتے ہیں کہ اللہ نے اہل بادیہ سے کسی کو نبوت کے منصب پر سرفراز نہیں کیا۔ اسی لئے ہر وہ روایت جس میں کسی اہل بادیہ کا نبی ہونا بیان کیا جائے قرآن کے معارض ہونے کی وجہ سے صحیح نہیں ہو سکتی۔

حاصل کلام یہ کہ خالد بن سنان کا بنو عبس کے بادیہ نشینوں سے ہونا متفق علیہ ہے۔ اسی لئے جو لوگ اس کا نبی ہونا بیان کرتے ہیں صحیح نہیں ہو سکتا۔

یہ بحث ناقص رہے گی اگر چھٹی صدی ہجری اور اس کے بعد دوسرے عالموں نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اس پر بھی غور نہ کیا جائے۔ اس سلسلہ میں راغب کے بعد قاضی عیاض متوفی ۵۴۴ھ ہیں۔ الشفاء (۳۳) میں ہے کہ وہ بزرگ جن کی نبوت میں اختلاف ہے۔ لقمان، خضر زردشت اور خالد بن سنان وغیرہ ہیں۔ اگر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک کا یا سب کی نبوت کا انکار کرے تو یہ جائز ہے۔ بلکہ اگر کوئی ان پر دو قدح بھی کرے تو یہ مذموم نہیں ہوگا۔ شفاء کے شارح علی قاری متوفی ۱۰۱۴ھ نے اس پر خالد کے حالات دیتے ہوئے مصنف کی تائید کی ہے (۳۴)

قاضی عیاض کے بعد فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ نے سورۃ المائدہ کی آیت ۱۹ "یا اہل الکتاب قد جاءکم رسولنا یبین لکم علی فترۃ من الرسل ان تقولوا ما جاءنا من بشیر ولا نذیر فقد جاءکم بشیر ونذیر" کی تفسیر میں ابن الکلبی کا یہ قول بھی نقل کر دیا کہ سیدنا عیسیٰ عم اور سیدنا محمد صلعم کے درمیانی زمانہ میں جو نبی ہوئے ہیں ان میں ایک خالد بن سنان بھی ہیں (۳۵) رازی نے ابن الکلبی جیسے قصہ گو کی تردید ضروری نہیں خیال کی۔ لیکن سورہ یٰسین کی آیت "اذ ارسلنا الیہم اثنین فکذبوہما فعززنا بثالث فقالوا انا الیکم مرسلون" میں اس کو صاف کر دیا ہے کہ (۳۶) جو لوگ سیدنا عیسیٰ عم اور محمد صلعم کے درمیانی زمانہ میں کسی نبی کا مبعوث ہونا بیان کرتے ہوئے اس آیت سے استدلال کرتے ہیں وہ صحیح نہیں ہے بلکہ اس سے مراد خود سیدنا عیسیٰ کے دو فرستادے ہیں نہ کہ اللہ کے رسول۔ سورۃ المائدہ کی تفسیر میں رازی نے جو کچھ لکھا ہے اس سے غلط فہمی ہونے کا اندیشہ ہے لیکن سورہ یٰسین والی آیت کی تفسیر میں خود ہی اپنی بات واضح کر دیتے ہیں۔

رازی کے بعد قرطبی متوفی ۶۷۱ھ نے بھی سورۃ المائدہ کی زیر بحث آیت کی تفسیر میں ابن الکلبی کا قول نقل کر دیا ہے (۳۷) لیکن فوراً قشیری کی تنبیہ بھی یاد دلائی ہے۔ قشیری کہتے ہیں۔ خالد بن سنان کے نبی ہونے کی خبر ایسی ہے کہ اس کا علم سوائے سچی خبر کے کسی اور ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔ بعد میں سورہ یٰسین کی تفسیر میں پھر اس بات کو صاف کر دیا ہے (۳۸)

قرطبی کے بعد یاقوت متوفی ۶۲۶ھ نے معجم البلدان میں زقاق القناديل (مصر) کی (۲۹) تحت لکھا ہے کہ یہاں کعب بن ضبہ عبسی رہتا تھا اور یہ خالد بن سنان کی بیٹی کا بیٹا تھا۔ بنو عبس کا خیال ہے کہ خالد نبی تھے۔ یاقوت بھی پھر سوق بربر واقع فسطاط کے ذیل میں لکھتا ہے کعب بن یسار بن ضبہ عبسی کے پاس اہل بربر آکر اُترے۔ وہ اس کی تعظیم کرتے تھے اور وہ اس کے باپ خالد کو نبی سمجھتے تھے یاقوت کے بیان پر تبصرہ آگے آئے گا۔

یاقوت کے بعد علی ابن اثیر متوفی ۶۳۰ھ نے اسد الغابہ میں (۳۰) خالد کا نسب دینے کے علاوہ ابن قتیبہ وغیرہ کے بیان پر کچھ اضافہ نہیں کیا ہے۔ ابن اثیر کا دیا ہوا نسب یہ ہے خالد بن سنان بن غیث بن مریطہ بن مخزوم بن مالک بن غالب بن قطیعہ ابن عبس۔

ابن اثیر کے بعد مشہور مفکر و مصنف محی الدین بن عربی متوفی ۶۳۶ھ (یا ۶۳۸ھ) کی کتاب نصوص الحکم میں ایک فص حکمۃ صمدیہ خالدیہ ملتی ہے۔ شیخ کی معرکۃ الآرا شخصیت اس بات کی متقاضی ہے کہ یہاں اس فص کا جو دوسری فصوں کی نسبت مختصر ہے مکمل ترجمہ دیا جائے۔ وھو ہذا۔

خالد بن سنان کی واتائی یہ ہے کہ انھوں نے نبوت برزخی کا دعویٰ کیا تھا اس لئے کہ انہوں نے مرنے کے بعد ہی وہاں کے حالات سے مطلع کرنے کا ادعا کیا تھا نہ کہ اپنی دنیا کی زندگی میں۔ انہوں نے حکم دیا تھا کہ ان کی قبر کھولی جائے اور دریافت کیا جائے تو وہ خبر کریں گے کہ برزخ کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ اس دنیوی زندگی میں اس سے معلوم ہو جائے گا کہ تمام پیغمبروں نے اپنی دنیا کی زندگی میں جو خبر دی تھی اس میں وہ سچے تھے۔ خالد صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض یہ تھی کہ تمام دنیا ان چیزوں پر ایمان لے آئے جنھیں اللہ کے رسول لائے ہوں تاکہ وہ ۔ خالد سب کے حق میں رحمت ہوں ان کی نبوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے قرب کا شرف رکھتی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اللہ آپ کو بر بنائے رحمت سارے عالم کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے اور خالد رسول تھے ہی نہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ اس رحمت سے جو رسالت محمدیہ میں تھی ان کو وافر حصہ ملے۔ ان کو تبلیغ کا حکم نہیں دیا گیا۔ لہٰذا انہوں نے چاہا کہ اس کو برزخ میں حاصل کریں۔ تاکہ وہ لوگوں کے حق میں علم برزخ میں قوی تر ہوں

ان کی قوم نے ان کو ضائع کر دیا۔

نبی صلعم نے ان کی قوم کی بابت یہ نہیں فرمایا کہ وہ ضائع ہو گئی بلکہ یہ فرمایا کہ انہوں نے اپنے خبر دینے والے کو ضائع کر دیا۔ کیوں کہ ان کی قوم نے ان کی مراد پر نہیں پہنچایا۔

۔ کیا اللہ ان کو ان کی تمنا کا اجر دے گا؟ اس میں شک و اختلاف نہیں ہے کہ ان کو ان کی آرزو کا اجر ملے گا۔ البتہ اجرِ مطلوب میں شک و اختلاف ضرور ہے۔ کیا تمنا کا بالفعل واقع ہونا اور بالفعل واقع نہ ہونا دونوں برابر ہیں؟ شرع میں ایسی چیز موجود ہے جو اس بات کی تائید کرتی ہے کہ بکثرت موقعوں پر ان دونوں کے اجر میں مساوات ہے۔ جیسے کوئی شخص نماز کے لئے جماعت میں آتا ہو لیکن اس سے جماعت فوت ہو گئی تو اسی شخص کے لئے اس شخص کا اجر ملے گا جو جماعت میں حاضر رہا۔ اسی طرح ایک شخص جو باوجود ناداری کے ایسے ہی نیک کام کرنے کی تمنا کرے جو صاحبِ ثروۃ و مال کرتے ہیں تو اس کو بھی ان ہی لوگوں کا اجر ملے گا۔ مگر کیا ان کی نیتوں کے برابر اجر ملے گا یا ان کے اعمال کے برابر؟ کیوں کہ انہوں نے نیت بھی کی اور عمل بھی کیا۔ نبی صلعم نے ان دونوں یا کسی ایک کے بارے میں کوئی صراحت نہیں فرمائی۔ بظاہر تو ان دونوں کا اجر برابر نہ ہوگا۔ اسی وجہ سے خالد بن سنان نے احکام برزخ کی تبلیغ طلب کی تاکہ ان کے لئے دونوں باتوں کو جمع کرنے کا مقام ثابت ہو۔ اس طرح دونوں اجر حاصل کریں۔ واللہ اعلم (۱۴)

شیخ نے ابتداء میں لکھ دیا ہے کہ یہ کتاب بر بنائے القاء خداوندی لکھی گئی ہے اللہ نے جو کچھ القا کیا تحریر کیا گیا (۲۷)

کشف ہو یا الہام یا القا تاریخ کے بحث کی دائرہ سے خارج ہے۔ اس لئے یہاں روایت کے قاعدے چل سکتے ہیں اور نہ درایت کے قوانین۔ لیکن یہ حقیقت بہرحال فراموش نہیں کی جا سکتی کہ اللہ کے رسول کے علاوہ کسی اور کا، خواہ وہ کسی حیثیت سے کتنا ہی جلیل القدر کیوں نہ ہو۔ کشف والہام والقاء ہرگز شرعی دلیل نہیں ہے۔ البتہ صرف صاحب کشف ہی کے لئے کشف والہام دلیل ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ شریعت کے خلاف نہ ہو۔ حدیث۔ خالد بن سنان بر بنائے روایت ناقابل

قبول ہو یا بر بنائے درایت ناقابل حجت، اتنا بہر حال تسلیم کرنا پڑے گا کہ شیخ نے اس کی جو تاویل کی ہو وہ خوب بلکہ بہت خوب ہے۔

فصوص الحکم کی کئی شرحیں ہیں۔ عربی و فارسی کے علاوہ اُردو اور ترکی زبان کا دامن بھی ان سے خالی نہیں۔ اکثر شرحیں چھپ گئی ہیں جو صاحب شیخ کے نقطۂ نظر کی وضاحت چاہیں ان سے رجوع کر سکتے ہیں علمی امانت و دیانت کا تقاضہ تھا کہ خالد کے سلسلہ میں شیخ نے جو کچھ لکھا ہے نقل کر دیا جائے کہ بحث تشنہ نہ رہے۔

ابن عربی کے بعد زکریا قزوینی متوفی ۶۸۲ھ نے (۴۳) نار الحرتین کے سلسلہ میں خالد کا ذکر سرسری طور پر کیا ہے۔ اس میں کوئی بات قابل اعتنا نہیں ہے۔ بیضاوی نے رازی کی طرح سورۃ المائدہ کی ۱۹ ویں آیت میں خالد کا ذکر کر کے یہاں اور پھر سورۃ لیسین کی چودھویں آیت میں تردید کر دی ہے (۴۴)

اسماعیل ابن کثیر متوفی ۷۷۴ھ نے بھی سورۃ المائدہ کی محولا بالا آیت میں خالد کا ذکر کر کے شدت سے خالد کی نبوت کا انکار کیا ہے۔ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ صحیح حدیث سے اس بات کی تردید ہوتی ہے کہ سیدنا عیسٰی علم اور سیدنا محمد صلعم کے درمیانی زمانہ میں اللہ نے کسی کو رسول یا نبی نہیں بنایا (۴۵) ابن کثیر نے جس حدیث سے استناد کیا ہے اس کو بخاری نے الصحیح کتاب الانبیاء میں (۴۶) نقل کیا ہے۔ سیدنا ابوہریرہؓ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلعم سے سنا آپ فرماتے ہیں:- انا اولی الناس بابن مریم والانبیاء اولاد علات لیس بینی وبینہ نبی میں عیسٰی ابن مریم سے زیادہ قریب ہوں اور تمام انبیاء علاتی بھائیوں جیسے ہیں۔ میرے اور عیسٰی کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔

رازی اور اس کے بعد کے بعض مفسروں نے سورۃ المائدہ والی آیت کی توضیح کچھ اس طرح کی ہے کہ جب تک سورۃ لیسین والی آیت کی انہیں کی تفسیر نہ دیکھی جائے بات صاف نہیں ہوتی بلکہ کچھ الجھن سی ہوتی ہے لیکن خوشی کی بات ہے کہ ابن کثیر نے ایسا نہیں کیا بلکہ ہر موقع تصحیح کر دی اور بعض مفسروں کے اقوال سے اگر شبہ ہو بھی سکتا تھا تو اس صحیح حدیث نے اس کا بالکلیہ ازالہ کر دیا ہے۔ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ کوئی صحیح حدیث ایسی نہیں ملتی جو بخاری کی اس حدیث کے معارض ہو۔

اتمام بحث کے لئے اس حدیث کے شارحوں کی رائے بھی دیکھ لیجئے۔

آپ واقف ہیں کہ صحیح بخاری کی بہت سی شرحیں ہیں۔ مختصر و متوسط کے علاوہ مطول بھی کافی ہیں اس حدیث کی شرح میں ان سب کا استقصا کرنا مضمون کو بے وجہ طول دینا ہے۔ البتہ دو شرحوں یعنی فتح الباری و عمدۃ القاری پر اکتفا کی جاتی ہے کہ یہی زیادہ متداول و مستند ہونے کے علاوہ مفصل بھی ہیں۔

ابن حجر متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں (۷۸) خالد وغیرہ کے نبی ہونے کی جو روایتیں بیان کی جاتی ہیں وہ سب ضعیف ہیں۔ اس حدیث سے ان کی تردید ہوتی ہے۔ ویسے بطور تاویل و توجیہ دونوں میں توفیق و تطبیق دینے کے لئے کہہ سکتے ہیں کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کوئی صاحب شریعت نبی نہیں ہوا بلکہ جو بھی نبی ہوا ہوگا اس نے سابقہ شریعت ہی کا اقرار کیا ہوگا۔ رہی خالد کی حدیث سو میں نے اپنی ایک سابقہ تالیف الاصابہ فی تمیز الصحابہ میں اس کے طرق وغیرہ جمع کر دئے ہیں۔

اصابہ میں ابن حجر نے جن اشخاص کا ذکر کیا ہے ان کی چار قسمیں قرار دی ہیں (۸۸) قسم اول میں ان بزرگوں کے سوانح ہیں جن کے متعلق نبی صلعم کے صحابی ہونے کی روایت خود ان سے یا ان کے متعلق کسی دوسرے ذریعہ سے مل جاتی ہے۔ خواہ یہ روایتیں صحیح ہوں یا حسن یا ضعیف اگر کوئی روایت تو نہ ملے مگر کسی اور ذریعہ سے ایسا حوالہ ملے جو ان کے صحابی رسول ہونے پر دلالت کرے تو ایسے صاحب کے حالات بھی اسی قسم میں درج کئے ہیں۔ دوسری قسم میں ان اشخاص کا تذکرہ ہے جو نبی صلعم کے عہد مبارک میں پیدا ہو چکے تھے لیکن سن تمیز کو نہیں پہنچے تھے۔ چونکہ نبی صلعم کے اکثر اصحاب اپنی اولاد کو آپ صلعم کے پاس تحنیک۔ کھجور چبا کر نو مولود کے منہ میں رکھنا۔ یا نام رکھائی کے لئے لاتے تھے۔ اسی لئے خیال ہوتا ہے کہ آپ صلعم کے عہد میں پیدا شدہ لوگوں کو ان کی شیر خواری کے زمانہ میں آپ صلعم نے ان کو دیکھا ہو تیسری قسم میں ان لوگوں کا تذکرہ ہے جنہوں نے جاہلیت اور اسلام دونوں زمانے دیکھے اور اسلام لے آئے لیکن ان لوگوں میں سے کسی کا بھی نبی صلعم کو دیکھنا کسی ضعیف روایت سے بھی ظاہر نہیں ہوتا بلکہ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آپ کے عہد بابرکت میں موجود تھے۔ آخری قسم میں ان لوگوں کا تذکرہ ہے جن کو بعض غیر محتاط لوگوں نے محض بر بنائے وہم یا غلطی سے سابقہ تینوں گروہ میں سے کسی ایک گروہ میں شامل کر دیا

ہے۔ خالد بن سنان کا ذکر اسی چوتھے گروہ میں کیا گیا ہے اس لئے نہیں کہ خالد کے متعلق کسی کو آپ کے صحابی ہونے کا گمان ہوا بلکہ صرف اسی لئے کہ بعض لوگوں کا گمان تھا کہ خالد کی بیٹی نبی صلعم کے پاس حاضر ہوئی اس ضمن میں خالد بن سنان کے متعلق ابن حجر نے ان سب روایتوں کو نقل کر دیا ہے جو اُن کو مل سکیں۔ ان میں سے اکثر و بیشتر وہی ہیں جن کا تفصیلی ذکر ان اوراق میں آچکا ہے۔ ابن حجر ان روایتوں کے ساتھ ساتھ اپنے پیشرو علماء نے ان پر جو تنقید کی ہے وہ بیان کر دی ہے اور خود بھی بعض روایتوں پر تنقید کر کے انہیں غلط ثابت کیا ہے (۴۹) چوں کہ اس روایت کو اپنی بیان کردہ آخری قسم میں جگہ دے کر ابن حجر نے اس کا غلط ہونا پہلے ہی بتا دیا تھا اس لئے یہاں اس اصولی اجمال کو گویا تفصیلی طور پر واضح کیا ہے۔

صحیح بخاری کے دوسرے مشہور شارح علینی متوفی ۸۵۵ھ نے بھی یہی مذہب اختیار کیا ہے یعنی خالد سے متعلقہ روایتوں کی صحیح حدیث سے توفیق کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ مفروضہ ہے کہ سیدنا عیسیٰ عم اور محمد صلعم کے درمیانی زمانہ میں کوئی صاحبِ شریعت نبی نہیں ہوئے۔ اگر ہوئے ہوں تو انہوں نے اپنے پیشرو صاحب شریعت نبی ہی کا اقرار کیا ہوگا (۵۰)

یہاں ہم کو صرف اتنا کہنا ہے کہ دو یا دو سے زیادہ حدیثوں میں توفیق کی ضرورت اسی وقت لاحق ہوتی ہے جب کہ بظاہر متضاد حدیثیں بحیثیت روایت و درایت ایک ہی درجہ کی ہوں۔ یا کم از کم یہ کہ دونوں میں مدارج صحت کا اختلاف زیادہ نہ ہو۔ حدیث خالد روایت سے صحیح ثابت ہوتی ہے نہ درایت سے تو ایک صحیح حدیث اور ایک موضوع حدیث میں توفیق کی کوشش ہی بے اصول و بے ضرورت قرار پاتی ہے۔

زیرِ بحث موضوع سے مناسبت و مشابہت رکھنے والا موقع جہاں توفیق و تطبیق کی ضرورت ناگزیر معلوم ہوتی ہے سورہ مریم کی ۵۴ ویں آیت ہے جس میں نبی صلعم کو مخاطب کر کے حکم دیا گیا ہے۔ اور الکتاب میں اسماعیل عم کا ذکر کر بلاشبہ وہ اپنے وعدہ کا سچا اور فرستادہ نبی تھا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سیدنا اسمٰعیل عم حجاز میں بنو جُرہم میں مبعوث ہوئے تھے جو بہرحال عرب تھے لیکن ایک

سے زیادہ مقاموں پر یہ آتا ہے کہ عربوں میں کوئی نبی اللہ نے نہیں بھیجا۔ سورۃ القصص کی ۴۶ ویں آیت ہے:
وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّورِ إِذْ نَادَيْنَا وَلَكِنْ رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَا أَتَاهُمْ مِنْ نَذِيرٍ مِنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۔ پھر سورۃ السجدہ کی تیسری آیت میں فرمایا ہے أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَا أَتَاهُمْ مِنْ نَذِيرٍ مِنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ اور سورۃ سبا میں ہے وَمَا آتَيْنَاهُمْ مِنْ كُتُبٍ يَدْرُسُونَهَا وَمَا أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَذِيرٍ (آیت ۴۴) اور سورۃ یٰسٓ کی چھٹی آیت میں بھی کچھ اسی قسم کی بات کہی گئی ہے لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَا أُنْذِرَ آبَاؤُهُمْ

اسماعیل علیہ السلام کی رسالت و نبوت کے سلسلہ میں ان آیتوں پر غور و تدبر اور پھر ان میں توفیق و تطبیق کی ضرورت مسلم لیکن خالد بن سنان کے سلسلہ میں کوئی آیت کیا ایک آدھ لفظ بھی ایسا نہیں ملتا جس سے اس جیسی کسی شخصیت یا اس برگزیدہ ہوئے واقعہ جیسے کسی واقعہ کی طرف کوئی بعید اشارہ ہی نکلتا ہو۔ صحیح حدیثوں کے مستند ذخیرے بھی اس سے خالی ہیں۔ چند طریقوں سے جو ایک ہی روایت نقل کی جاتی ہے اس کی جانچ پہلے صفحات میں ہو چکی ہے جس سے اس کا موضوع و مصنوع ہونا ثابت ہو گیا۔

حیرت ہوتی ہے مدعیانِ استشراق کے ایک گروہ پر جس نے اس موضوع روایت کو تاریخی معیاً پر اچھی طرح معروضی طریقے سے جانچے بغیر افسانہ کو حقیقت فرض کر کے یہ اٹکل مارنے کی کوشش کی ہے کہ خالد بن سنان وغیرہ جیسے لوگوں کی مثال سے سیدنا محمد صلعم نے فائدہ اٹھایا۔ درآں حالیکہ اس پورے افسانہ سے یہ لوگ زیادہ سے زیادہ جو قیاسی جہاز اڑا سکتے تھے وہ یہ ہو سکتا تھا کہ دورِ جاہلیت میں، جب کہ اہلِ عرب اور خاص کر اہلِ بادیہ صدیوں سے راہب کے کرشموں اور کاہن کے طلسموں میں گرفتار تھے، حجاز کی سنگلاخ و آتش فشاں سرزمین سے کسی ہیجانِ ارضی و تحول جوی کی وجہ سے زمین کے نیچے سے پیٹرول کا چشمہ پھوٹ پڑا۔ لوؤں کی لپٹ سے اس میں آگ لگ گئی ایک جری شخص نے ہمت کر کے گڑھا کھودا پیٹرول کے بہاؤ کا رخ بدل گیا پھر وہ زمین میں جذب ہو گیا۔ اسی کے ساتھ آگ بھی ختم ہو گئی، اس ہولناک اور جان لیوا کوشش میں اعصابی شدت سے اس پر وہ کیفیت طاری ہوئی جو موت کے منہ میں جانے سے ہو سکتی ہے اگر خالد جیسا سادہ لوح بادیہ نشین اس وہم میں مبتلا ہو گیا کہ حقیقی موت کے بعد

پھر اس دنیا میں اسی طرح جی اٹھنا ممکن ہے جس طرح وہ آگ بجھا کر موت کے منہ سے زندہ و سلامت نکل آیا تو حیرت کا مقام نہیں ہے۔ روس کی ادبی پیغمبر دستوفسکی کا واقعہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ پیٹرول کی دریافت اور نفسیات کے طبعی قوانین کا انکشاف تمام تر زمانہ حال کی پیداوار ہے اگر خالد کے قصہ کی تاویل و تشریح کا حق ادا نہ ہو سکا تو یہ چنداں تعجب خیز نہیں اس طرح سادہ لوح خیمہ نشینوں یا بقول یاقوت خالد کی بیٹی کی اولاد نے یہ سمجھ رکھا کہ اگر ان کے نانا کی قبر کھولی جاتی تو وہ عالم برزخ کے احوال کی اطلاع دیتا تو یہ خیال بھی غیر متوقع نہیں تھا۔ البتہ اس بات پر حیرت ہوتی ہے جاہلیں کہ عربی جہل نے نہیں بلکہ خردمندانِ عجم کے تخیل نے خالد کی قبر کبھی جرجان میں بنا ڈالی کبھی اس کو قیروان کے پہاڑی غار میں اکڑوں بٹھا دیا اور کبھی یہ نقشہ دکھایا کہ اس کی جورو کے پیٹ کی بٹوں میں نوشتے ہیں جن میں قیامت تک کے واقعات مندرج ہیں۔

بہر حال ان خیالی حاشیوں کے گرد و غبار کو نکال دیا جائے تو قصہ میں صرف اتنی اصلیت رہ جاتی ہے کہ خالد بن سنان نے ایام جاہلیہ میں ایک محیر العقول کارنامہ انجام دیا اور اس سے وہ ایک سخت نفسیاتی آزمائش میں پڑا، اس سے زیادہ کچھ کہنا تاریخ پر ظلم کرنے کے علاوہ اپنی عقل و فہم سے بھی ناانصافی کرنا ہے کیونکہ مذکورہ توجیہ و تاویل کا درست یا نہ درست ہونا اتنا اہم نہیں جتنا یہ امر کہ خالد کے نبی ہونے کے بارے میں جو روایت بیان کی جاتی ہے آیا تاریخی تحقیق اس کی تائید کرتی ہے یا تردید۔ تاریخ و تفسیر کے مشقت طلب معروضی مطالعہ سے ہم اسی واضح نتیجہ پر پہنچے جس کو قرآن نے ایک سے زیادہ مرتبہ بیان کر دیا تھا۔ یعنی ام یقولون افتراہ بل ھو الحق من ربک لتنذر قوما ما اتاھم من نذیر من قبلک لعلھم یھتدون۔ (حوالوں کی فہرست)

---

(۱) کتاب الطبقات الکبیر ج اق ۲ ص ۴۲

(۲) واقدی کے حالات بہت سی کتابوں میں ملتے ہیں مثلاً تاریخ بغداد احمد الخطیب م ۴۶۳ھ ج ۳ ص ۳ تا ۲۱ قاہرہ ۱۳۴۹ء یا دفیات الاعیان۔ احمد ابن خلکان م ۶۸۱ھ ج ا ص ۶۰۵ قاہرہ ۱۳۱۰ سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

(۳) ج ۴ ص ۷۶ ۴ - قاہرہ ۱۳۵۹ھ -

(۴) ص ۲۹ - قاہرہ ۱۳۵۳ -

(۵) ص ۱۷ اکوتجن ۱۸۵۴ -

(۶) ج ۳ ص ۱۵۳ قاہرہ ۱۳۶۱ ہ

(۷) ج ا ص ۱۳۱، ۱۳۲ - پیرس ۱۸۶۱ء

(۸) ج ۴ ص ۱۸ تا ۲۳

(۹) عنقاء کے متعلق دوسرا فقہ لغت کی کسی مفصل کتاب جیسے لسان العرب یا ضرب الامثال کی کسی کتاب جیسے مثلاً الفاخر - المفصل ص ۱۶۱ - لیدن ۱۹۱۵ء میں ملاحظہ ہو۔

(۱۰) المستدرک ج ۲ ص ۵۹۸ حیدرآباد دکن ۱۳۴۰

(۱۱) ایضاً ج ا ص ۳

(۱۲) میزان الاعتدال - محمد ذہبی م ۸۴۷، لکھنؤ ۱۳۰۱ - لسان المیزان احمد بن حجر ۸۵۲ حیدرآباد ۱۳۲۹-۱۳۳۱ -

(۱۳) ص ۵۵ ۴ مصر ۱۳۲۶

(۱۴) ج ۲ ص ۱۷۸ لیدن ۱۹۳۴ء

(۱۵) اصول حدیث اور اصول فقہ کی ابتدائی کتابوں میں بھی محولہ صدر بیان کی تفصیل مل جائیگی

(۱۶) الحیوان ج ۴ ص ۴۷۸

(۱۷) ثمار القلوب ص ۴۵۶ -

(۱۸) ج ۲ ص ۳۶۷ - مصر ۱۳۲۶ھ

(۱۹) جامع البیان ج ۱۳ ص ۶۴ - مصر ۱۳۳۰ھ

(۲۰) مفاتیح الغیب ج ۵ ص ۱۷۲

(۲۱) ج ۹ ص ۲۷۴ مصر ۱۳۵۸

(۲۲) ج ۳ ص ۱۶۴ مصر ۱۳۷۱ھ

(۲۳) ج ۳ ص ۲۶۴ مصر ۱۳۷۱ھ

(۲۴) ج ۳ ص ۲۶۴ - مصر ۱۳۱۷ھ

(۲۵) ج ۵، ص ۲۳ مصر ۱۳۲۸ -

(۲۶) لیدن ۱۹۳۶

(۲۷) روح البیان ج ۲ ص ۲۱۶ ج ۳ ص ۱۰۷ و ۲۴۱، مصر ۱۲۸۶

(۲۸) فتح القدیر ج ۳، ص ۵۸ مصر ۱۳۵۰

(۲۹) روح المعانی ج ۱۳ ص ۶۱ مصر ۱۳۱۰

(۳۰) ج ۹ ص ۲۶۷

(۳۱) چونکہ یہ قدر ضمنی بحث تھی اس لئے تفسیروں کے تفصیلی حوالے نہیں دیئے گئے - اوپر جن مستند تفسیروں کا ذکر آیا ہے ان میں سورہ یوسف آیت ۱۰۰ میں یہ سب اقوال یکجا مل جائیں گے۔

(۳۲) لغوی بحث مندرجہ ذیل قاموسوں سے ماخوذ ہے ویسے لغت کی دوسری مفصل و مستند کتابوں میں بھی یہ مواد کم و بیش مل جائے گا۔ نامناسب طوالت سے بچنے کے لئے کلام عرب سے ہر معنی کا شاہد نقل نہیں کیا گیا۔ مرجوعہ کتابوں میں بلا استثناء ہر معنی کے شواہد مل جائیں گے۔

۱- مجالس ثعلب احمد بن یحیی م ۲۹۱ مصر - ۱۳۶۸

۲- جمہرۃ اللغہ محمد بن درید م ۳۲۱ - حیدر آباد دکن۔

۳- مقائیس اللغہ احمد بن فارس م ۳۹۵ قاہرہ ۱۳۶۶ - ۱۳۷۱

۴- الفائق زمخشری م ۵۳۸ - حیدر آباد دکن ۱۳۱۴

۵- لسان العرب ابن منظور م ۷۱۱ - مصر ۱۲۹۹ - ۱۳۰۸

۶- تاج العروس مرتضیٰ زبیدی ۱۲۰۵ - مصر - ۱۳۰۶ - ۱۳۰۷

(۳۳) ج ۲ ص ۷۴۵ آستانہ ۱۲۰۹ھ

(۳۴) ایضاً

(۳۵) مفاتیح الغیب ج ۳ ص ۳۸۴

(۳۶) ایضاً ج ۷ - ص ۷۴ .

(۳۷) الجامع الاحکام القرآن ج ۶ - ص ۱۲۲ مصر ۱۳۵۷

(۳۸) ایضاً ج ۱۵ ص ۱۴ مصر ۱۳۶۵

(۳۹) ج ۲ - ص - ۹۳۷ و ج ۳ ص ۱۹۳ طبع یوروپ ۱۸۶۸،۶۷

(۴۰) اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابۃ علی بن محمد المعروف بابن الاثیرم ۶۳۰ مصر ۱۲۸۰

(۴۱) فصوص الحکم ص ۲۱۴ مصر ۱۳۶۵ھ

(۴۲) ایضاً ص ۳

(۴۳) عجائب المخلوقات - ج ا ص ۱۴۷ مصر ۱۳۰۹

(۴۴) انوار التنزیل ج ۳ ص ۲۵۸ مصر ۱۲۷۱ و ج ص ۱۹۸

(۴۵) تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۳۱۴ - مصر ۱۳۰۱

(۴۶) باب - ۱۴ - واذکر فی الکتاب الخ -

(۴۷) فتح الباری - ج ۶ ص ۳۵۴ - مطبوعہ ۱۳۰۰

(۴۸) ج ا ص ۶ - مصر ۱۳۵۸

(۴۹) ایضاً ج ا ص ۵۶۴ -

(۵۰) عمدۃ القاری ج ۷ ص ۹۴۹ مصر ۱۳۰۸ ۱۳۱۱

تصحیح

اس مضمون کی پہلی قسط میں صفحہ ۱۹ پر جو شعر ہے اس کے دوسرے مصرعہ کو یوں پڑھیے

" وھل کان حکم اللہ الا مع النقل "

اسلامی دنیا چوتھی صدی ہجری میں

(۱)

(جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق)

مقدسی کی اَحْسَنُ التَّقَاسِیْم فِی مَعْرِفَۃِ الْاَقَالِیْم ان آٹھ جغرافیائی کتابوں میں سے ایک ہے جن کو فاضل مستشرق دی خویہ نے مکتبہ جغرافیہ کے نام سے لیدن میں طبع کیا۔ یہ کتاب عربی لٹریچر کی اہم ترین تصنیفات میں سے ہے اور چند در چند وجوہ سے مکتبہ جغرافیہ کی دوسری کتابوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ اس میں نہ صرف مسافتوں اور جغرافیہ کے بارے میں تفصیلی معلومات ہیں بلکہ مختلف اسلامی ریاستوں اور ملکوں کی سماجی، مذہبی اور اقتصادی حالت کا تقابلی جائزہ بھی لیا گیا ہے، یہ جائزہ عربی کی دیگر مطبوعہ کتابوں میں خال خال ہی ملتا ہے، اس قیمتی کتاب میں چوتھی صدی ہجری کے رسوم، روایات، فرقوں، تجارت، محصولات، اخلاق اور زبانوں کا ایک منظم گو کسی حد تک ناکافی خاکہ پیش ہوا ہے، یہ کتاب پہلی بار ۱۸۷۷ء میں ڈچ قوم کی تجارت اور جہاز رانی کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے طبع ہوئی اور پھر دوسری بار انیس سال بعد ۱۹۰۶ء میں، کتاب کی قدر و قیمت اس بات سے اور بڑھ جاتی ہے کہ اس کی اکثر معلومات خود مصنف کے ذاتی تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہیں اور مصنف ایک بڑے سیاح ہی نہ تھے بلکہ ایک عالم اور نقد راوی بھی تھے،

مقدسی نے کتاب کا ایک طویل مقدمہ لکھا ہے جس میں انھوں نے اپنے موضوع کے حدود کو واضح کیا ہے، اپنے ماخذوں کی تصریح کی ہے، اپنے پیش رو جغرافیائی مصنفوں کی کتابوں کا تذکرہ کیا ہے اور ان کی خامیوں اور نارسائیوں کو بیان کیا ہے، پھر اپنی جدوجہد، تلاش و جستجو اور صرفِ کثیر کا ذکر کیا ہے اور اپنی کتاب کی مختلف اصطلاحوں پر روشنی ڈالی ہے، مقدمہ کے خاص خاص

حصوں کا ترجمہ یہ ہے: "پچھلے مصنفوں کی تصنیفات دیکھ کر مجھے شدت سے احساس ہوا کہ ان موضوعات کو قلم بند کروں جن کی طرف انھوں نے توجہ نہیں دی یا جن کو تشنہ چھوڑ دیا ہے، اس کتاب میں ایک طرف میں نے مشہور صدر مقاموں اور بڑے شہروں اور ان کو ایک دوسرے سے ملانے والی سڑکوں اور مرحلوں کے درمیانی فاصلوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے اور دوسری طرف سامانِ تجارت کے گوداموں، کارخانوں اور منڈیوں، ہر ملک اور علاقہ کی زبانوں لہجوں اور مذہب اور ان کے باہمی فرق پر روشنی ڈالی ہے، میں نے مختلف ریاستوں اور ملکوں کے رائج وزنوں پیمانوں، سکوں کے اوزان، تبادلۂ زر کی شرحوں، غذا، پانی، پھلوں، خوبیوں اور برائیوں، درآمد برآمد، رسوم اور تجارتی وصنعتی خصوصیات کو بھی بیان کیا ہے، اس کے علاوہ میں نے مقدس مقامات کے حالات، ریگستانی پُرخطر راستوں، دلدلوں، مرتفع مقامات، میدانوں، بنجر حصوں، پہاڑیوں، دریاؤں، جھیلوں، سمندروں، زرخیز اور خوش حال، بنجر اور فاقہ زدہ علاقوں کی تفصیلات پیش کی ہیں، ان معلومات کے لئے میں نے اسلامی ممالک کی نہایت وسیع سیاحت کی جس میں میرے دس ہزار سے زیادہ درہم (تقریباً پانچ ہزار روپے) خرچ ہوئے ان کے لئے میں فاضلوں اور عالموں سے ملا، بادشاہوں کی خدمت کی، ان کے کتب خانے چھانے، قاضیوں کے ساتھ بیٹھا، فقیہوں سے درس لیا، ادیبوں کی محفلوں اور قرآن خوانوں کے حلقوں میں شریک ہوا، زاہدوں اور صوفیوں کی صحبت اختیار کی، قصہ گوؤں اور واعظوں کے ساتھ بود و باش رکھی اور ان تمام مصروفیات کے باوجود تجارت بھی کرتا رہا، اس کے علاوہ اپنے مشاہدات پیش کرنے سے پہلے میں نے تمام متعلقہ امور و حقائق اچھی طرح ہضم کئے، خود تجربہ کرکے ریاستوں اور ملکوں کے درمیانی فاصلوں کا اندازہ لگایا، خود سرحدوں اور فوجی چھاؤنیوں کو جاکر دیکھا خود مذہبوں اور فرقوں کے بارے میں تحقیقات کی، خود زبانوں، بولیوں اور لہجوں کے امتیاز دریافت کئے اور سمجھے اور جہاں تک میری اہلیت نے ساتھ دیا ضلعوں اور شہروں کی صحیح صحیح تقسیم کی، اور محصولات کے اعداد و شمار پوری تحقیق سے مرتب کئے" اس کتاب میں میں نے

جو کچھ دیکھا یا سنا سب پیش کر دیا ہے۔ جو باتیں ذاتی تجربہ یا متواتر روایات سے پایۂ ثبوت کو پہنچیں ان کو بغیر کسی تردد کے بیان کیا اور اگر کسی امر میں مجھے شبہ ہوا یا کوئی بات آحاد روایت سے ہاتھ آئی تو میں نے بلا تکلف اس کو راوی کی طرف منسوب کر دیا ہے، با ایں ہمہ احتیاط و تدبر میں نہ تو خود کو لغزش سے ماورا سمجھتا ہوں نہ کتاب کو غلطیوں سے پاک[1]"۔

اس مضمون میں دنیائے اسلام کا اطلاق ان علاقوں پر ہوا ہے (۱) جزیرۂ عرب (۲) عراق (۳) اقور (دیار ربیعہ، دیار مضر، دیار بکر) (۴) شام (۵) مصر (۶) مغرب (شمالی افریقہ، تونس، مراکش، صقلیہ، اسپین) (۷) مشرق (خراسان، سجستان اور ماوراء النہر) (۸) دیا (قومس۔ جرجان۔ طبرستان) (۹) رحاب (ران، آرمینیہ، آذربیجان) (۱۰) جبال (۱۱) خوزستان (۱۲) فارس (۱۳) کرمان (۱۴) سندھ ان میں اول کے چھ عربی علاقے ہیں اور بعد کے آٹھ عجمی (فارسی و ترکی) ذیل میں مذکورہ بالا ریاستوں اور ملکوں سے متعلق ان امور کا ذکر ہوگا جو پرانے اسلامی تمدن اور معاشرت سے دلچسپی رکھنے والوں کی معلومات میں اضافہ کا باعث ہو سکتے ہیں، مصنف کی وہ تفصیلات جن کا تعلق فاصلوں یا عام جغرافیہ سے ہے یا وہ حالات جن کی اس وقت اہمیت نہیں نظر انداز کر دیے گئے ہیں، مقدسی نے اپنی کتاب کو ۳۷۵ ہجری میں شائع کیا جب کہ ان کی عمر چالیس سال کی تھی[2]۔ اس وقت مصر میں عزیز نزار فاطمی (۳۸۹ - ۳۴۴) خلیفہ تھے اور ماوراء النہر میں نوح بن منصور سامانی کی حکومت تھی، اس سے ظاہر ہے کہ کتاب میں اسلامی دنیا کے جو حالات بیان ہوئے ہیں وہ ۳۵۰ اور ۳۷۵ ہجری کے درمیانی زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

۱۔ جزیرۂ عرب

مقدسی کی سیاحت کے وقت یہ جزیرہ چار بڑے سیاسی حصوں میں تقسیم تھا

[1] مقدسی ص ۱،۲، ۸،۹ طبع لیدن ۱۹۰۶ء [2] مقدسی ص ۹-۸

(۱) حجاز (۲) یمن (۳) عمان (۴) ہجر یا بحرین

حجاز کے اہم شہر!

۱- مکہ ۲- مدینہ ۳- طائف ۴- قرح یا وادی القریٰ ۵- جُدّہ

(۱) مکہ: اس شہر کی اکثر عمارتیں سفید یا سیاہ چکنے پتھر کی تھیں جن کی بالائی منزلیں اینٹوں سے چنی گئی تھیں، موسم گرما میں دن کے وقت یہاں سخت گرمی پڑتی ہے لیکن راتیں خوشگوار ہوتی تھیں، میٹھے پانی کے کنوؤں کے علاوہ یہاں تین تالاب تھے جن میں نہر زبیدہ کا پانی آتا تھا، مکانوں کا کرایہ باشندوں کی آمدنی کا خاص ذریعہ تھا۔[1]

(۲) مدینہ: یہ مدنیت اور رقبہ میں مکہ سے نصف تھا، شہر کا اکثر حصہ نخلستانوں اور گاؤں سے گھرا ہوا تھا اور کچھ حصہ میں کاشت بھی ہوتی تھی، شہر میں میٹھے پانی کے کنوؤں کے علاوہ ایسے حوض تھے جن میں نہروں سے پانی آتا تھا، حضرت عمرؓ نے جو نہر جامع مسجد کے دروازہ تک نکالی تھی خراب ہو چکی تھی جامع مسجد کے قریب کافی بارونق بازار تھے شہر کی آبادی کم تھی اور اکثر لوگ حضرت حسینؓ کی نسل سے تھے، یہاں کی زمین شور تھی اور مکانات کچے تھے،[2]

(۳) طائف: یہ ایک صحت بخش چھوٹا پہاڑی شہر تھا جہاں کثرت سے پھل ہوتے تھے، خاص طور پر انار، نفیس قسم کی کھجور اور انگور، مکہ میں پھل زیادہ تر یہیں سے آتے تھے باشندوں کا خاص پیشہ دباغت تھا، سخت گرمی کے زمانہ میں مکہ کے بادشاہ یہاں آکر رہتے تھے[3]

(۴) قرح یا وادی القریٰ: مقدسی کی سیاحت کے وقت سارے حجاز میں نہ تو کوئی شہر اتنا شاندار، خوش حال اور آباد تھا اور نہ کسی دوسرے شہر میں اتنی تجارت دولت اور برکت تھی، یہ ایک مضبوط قلعہ میں واقع تھا جس میں خوشنما مکانات بنے ہوئے تھے، شہر کے چاروں طرف لہلہاتے گاؤں اور نخلستان تھے یہاں پانی فراواں تھا، کھجوریں

---

[1] مقدسی ص ۷۱، ۷۴ [2] مقدسی ص ۸۰ [3] مقدسی ص ۷۹

بہت سستی تھیں اور بازار میں عمدہ قسم کی روئی ملتی تھی، شہر کے اکثر لوگ یہودی تھے [1]

(۵) جدّہ ۔ یہ بحر قلزم کے ساحل پر ایک نہایت آباد شہر تھا۔ اس کے مالدار باشندے بیشتر تاجر تھے ۔ یہ مکہ یمن اور مصر کا گودام تھا، یہاں گرمی بہت سخت پڑتی تھی اور پانی کمیاب تھا۔ اس کی تجارت زیادہ تر فارسیوں کے ہاتھ میں تھی جو شاندار محلوں میں رہتے تھے [2]

۲۔ یمن

یمن کے دو حصے تھے (۱) تہامہ یا وہ میدانی علاقہ جو بحر قلزم کے ساحل پر پھیلا ہوا تھا اور (۲) نجد جس کا اطلاق تہامہ کے عقب کے پہاڑی علاقہ پر ہوتا تھا، اہم شہر

زبید۔ یہ تہامہ کا صدر مقام اور شاہ یمن کا مستقر تھا، شہر مٹی کے قلعہ میں واقع تھا۔ یہاں خوش نما اور شاندار عمارتیں تھیں اور بڑے بڑے مالدار لوگ اور تاجر رہتے تھے، عمارتیں بالعموم اینٹ سے بنائی گئی تھیں، مکان فراخ اور دل لگاؤ تھے، شہر میں میٹھے پانی کے کنوئیں اور صاف ستھرے حمام تھے، یہاں علماء اور ادیبوں کا ایک طبقہ بھی آباد تھا اور لوگوں میں کسی قدر تمیز و شائستگی موجود تھی ان وجوہ سے اس کو یمن کا بغداد کہا جاتا مکہ کے مقابلہ میں زیادہ خوش حال آباد اور بارونق تھا، شہر کے گرد کھیت اور گاؤں تھے ۔ ان خوبیوں کے باوجود یہاں معیشت مہنگی تھی، بازار تنگ تھے اور پھل کمیاب، باشندوں کی خاص غذا باجرہ اور مکئی تھی ۔ [3]

(۲) عدن ۔ یہ یمن کا سب سے بڑا اور اہم ترین بندرگاہ تھا، مقدسی نے اس کو چین کی دہلیز اور مغرب (شمالی افریقہ اسپین اور مراکش) کے گودام سے تعبیر کیا ہے ۔ یہ خوب خوش حال اور آباد تھا۔ یہاں بہت سے محل تھے ۔ نو واردوں کے لئے یہ نہایت مبارک تھا اور مستقل آباد ہونے والوں کے لئے تموّل کا ضامن ۔ یہاں کے لوگ پاک اخلاق

---

[1] (مقدسی صفحہ ۸۳-۸۴) [2] (مقدسی صفحہ ۷۹) [3] (مقدسی صفحہ ۸۴-۸۵)

تھے، سمندر کی سمت کو چھوڑ کر عدن کے ہر طرف پہاڑ تھا، یہاں کے حمام بہت گندے اور خراب تھے، کنوؤں کا پانی کھاری تھا، میٹھا پانی بارہ میل دور سے لایا جاتا تھا، یہ ایک بنجر اور خشک مقام تھا جہاں نہ زراعت تھی نہ مویشی، نہ درخت نہ پھل، نہ پانی نہ چارہ یہاں آگ بہت لگتی تھی اور جہاز آئے دن تباہ ہوتے تھے، بسا اوقات ایسا ہوتا کہ ایک شخص رات کو مالدار سوتا اور صبح کو فقیر اٹھتا[1]

(۳) صنعاء۔ یہ یمن کے اس حصہ کا صدر مقام تھا جس کو نجد کہتے تھے، پہلے زمانہ میں یہ زبید سے زیادہ بڑا اور خوشحال تھا لیکن بعد میں ان کی اہمیت اور شان و شوکت کم ہو گئی تھی با ایں ہمہ مقدسی کے وقت میں یہاں ایسے با اثر اور ذی علم لوگ تھے جو اپنی سمجھ بوجھ اور ٹھاٹ باٹ میں یمن بھر میں نظیر نہ رکھتے تھے، یہاں کی آب و ہوا بہت عمدہ اور صحت بخش تھی۔ یہ زبید سے رقبہ میں بڑا تھا اور یہاں کے مکانات اینٹ سے تعمیر ہوئے تھے، یہاں پھلوں کی افراط تھی، نرخ سستے تھے اور تجارت فروغ پر تھی، مقدسی نے یہاں کی روٹی کی تعریف کی ہے[2]

(۴) صعدہ۔ یہ شہر گو صنعاء سے چھوٹا تھا تاہم خوب خوش حال اور آباد تھا۔ یہاں سے اعلیٰ قسم کا چمڑہ باہر بھیجا جاتا تھا اور عمدہ قسم کی مشکیں بنائی جاتی تھیں۔ یہاں علوی شیعوں کا راج تھا[3]

(۵) شحر۔ یہ ساحلی شہر تھا جہاں بکثرت بڑی مچھلیاں پکڑی جاتی تھیں اور پھر عمان، عدن، بصرہ اور عدن کو بھیجی جاتی تھیں۔ یہاں ایک درخت پایا جاتا تھا جس سے کندر نام کا گوند نکلتا تھا[4]

(۶) حضرموت۔ یہ احقاف کا سب سے بڑا شہر تھا اور ساحل سے دور ریگستان میں آباد تھا۔ یہاں کے باشندے خوارج کے شراۃ فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔

---

[1] (مقدسی ص۸۵) [2] (مقدسی ص۸۶) [3] (مقدسی ص۸۷) [4] (مقدسی ص۸۷)

عمان

یہ علاقہ دو سو پچاس میل لمبا اور اسی قدر چوڑا تھا، یہاں نخلستان اور باغ بہت تھے جن کی آبیاری کنوؤں سے ہوتی تھی، پانی نکالنے کا کام بیلوں سے لیا جاتا تھا۔ یہاں کے باشندے خوارج فرقے شراۃ سے متعلق تھے، عمان کا سب سے اہم شہر صحار تھا۔

صُحار۔ ہمارے مصنف کے زمانہ میں بحر ہند پر اس سے زیادہ بڑا، بارونق اور شاندار شہر کوئی دوسرا نہ تھا، یہ عمان کا صدر مقام اور ایک نہایت آباد، خوش آیند اور صاف ستھرا شہر تھا، شان و شوکت میں زبید اور صنعاء سے بڑھا ہوا تھا، یہاں کے لوگ مالدار تھے، تجارت فروغ پر تھی اور خوشحالی عام تھی، یہاں کے بازار خوش وضع تھے اور سمندر کے کنارے دور تک اینٹ اور ساگون سے بنی ہوئی عمارتیں پھیلی ہوئی تھیں، شہر میں میٹھے پانی کے بہت سے کنوئیں تھے اور ایک نہر بھی تھی۔ یہاں ہند اور چین سے جہاز آتے تھے۔ بقول مقدسی صحار چین کی دہلیز، مشرق و عراق کا گودام اور یمن کی رسد گاہ تھا۔ شہر پر فارسی چھائے ہوئے تھے [1]

ھَجَر

جزیرہ عرب کا یہ علاقہ خلیج فارس کے ساحل پر پھیلا ہوا تھا اور اس کے اکثر شہر یا تو ساحل پر آباد تھے یا ساحل سے قریب تھے، اس کا سب سے اہم شہر اور صدر مقام اَحساء تھا۔

اَحساء اس کو بحرین بھی کہتے تھے، یہ ایک بڑا اور آباد شہر تھا جہاں کثرت سے کھجور کے باغ تھے اس کی آب و ہوا بہت گرم تھی اور یہاں خورد و نوش کی قلت تھی یہ تجارت کا بڑا

---

[1] (مقدسی ص ۹۲)

مرکز تھا اور سمندر سے تقریباً ٢٠ میل کے فاصلہ پر آباد تھا، اس کے قریب کئی جزیرے تھے یہاں لوگوں کے چال چلن پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی اور انصاف کا دور دورہ تھا، احساء ابو سعید قرمطی کی حکومت کا مستقر تھا۔[1]

(ب) جزیرۂ عرب کی حکومتیں

١۔ حجاز پر مصر کے فاطمی خلفاء کا تسلط تھا۔ ٢۔ یمن پر زیاد بن ابیہ کے خاندان کے بادشاہ حکمراں تھے ٣۔ الثار (یمن) کے ضلع پر ایک خود مختار سلطان قابض تھا جس کی سالانہ آمدنی ۵ لاکھ دینار تھی۔ ۴۔ صنحار (یمن) پر بھی ایک خود مختار سلطان کا قبضہ تھا جو ایک مقررہ رقم کے عوض سلاطین زیاد کے نام پر خطبہ پڑھتا تھا۔ ۵۔ صعدہ (یمن) کے علوی سرداروں کے زیر اقتدار تھا مگر خطبہ یہاں بھی سلاطین زیاد کے نام پر پڑھا جاتا تھا مقدسی نے صعدہ حکومت کے انصاف کی تعریف کی ہے۔ ٦۔ عمان پر عراق اور فارس کے بُویہی بادشاہ حکومت کرتے تھے۔ ٧۔ ہجر اور احقاف پر قرامطہ کا راج تھا۔

(ج) جزیرۂ عرب کے ذمی

١۔ یہودی ٢۔ عیسائی۔ یہودیوں کی تعداد عیسائیوں سے زیادہ تھی۔

(د) زبانیں اور علاقائی بولیاں:

صُحار (عمان کے صدر مقام) کو چھوڑ کر جہاں فارسی رائج تھی سارے جزیرۂ عرب میں عربی بولی جاتی تھی حتی کہ جُدّہ اور عدن میں جہاں کی اکثر آبادی اور تجارت فارسی تھی عربی بھی استعمال ہوتی تھی۔ جزیرہ کے صحرائی قبیلوں میں عربی کی سب مشہور بولیاں رائج تھیں؟ ان سب میں قبیلہ ھُذَیل کی عربی سب سے زیادہ شستہ اور صحیح تھی اور اس کے

---

[1] مقدسی ص ٩٢

بعد حجاز اور نجد یمن کی البتہ احقاف کے باشندوں کی عربی وحشیانہ تھی [1]

(۵) **تجارت:**۔ اس ملک کی تجارت بہت اہم او مفید تھی، بقول مقدسی یہاں دو آفاقی بندرگاہ تھے عدن اور صحار، حاجیوں کا بڑا بازار منیٰ تھا، یہاں جدہ اور جار کے گودام تھے، یہاں وادی القریٰ کا شہر تھا جو عراق اور شام کی تجارت کا دوراہا تھا، یہاں یمن تھا جو یاقوت، عماموں، چمڑہ اور غلاموں کا دساور تھا، یہاں عمان تھا۔ جہاں مختلف سامان کی درآمد ہوتی اور جہاں سے یہ سامان عراق، ایران اور ماوراء النہر کے ملکوں کو بھیجا جاتا، اس سامان تجارت میں سے چند کے نام مقدسی نے دئے ہیں اور کہا ہے کہ اگر سب کا ذکر کیا جائے تو کتاب بہت بڑھ جائے گی۔ عطر تیل اور خوشبودار اشیاء کے جملہ اصناف ۲۔ بقم (ایک سرخ رنگ) ۳۔ ساگون کی لکڑی۔ ۴۔ شیشم کی لکڑی، ۵۔ ہاتھی دانت ۶۔ موتی۔ ۷۔ دیباج ۸۔ سیپی ۹۔ یاقوت ۱۰۔ آبنوس ۱۱۔ ناریل ۱۲۔ شکر ۱۳۔ اسکندروس ۱۴۔ صندل کی لکڑی ۱۵۔ سیسہ ۱۶۔ بید ۱۷۔ غضار (سبز رنگ کی لیسدار مٹی) ۱۸۔ مرچ ۱۹۔ لوہا۔ عدن کے بندرگاہ پر مذکورہ بالا اشیاء کے علاوہ اور مختلف اصناف کی درآمد ہوتی تھی جن میں سے چند کے نام یہ ہیں ۱۔ عنبر ۲۔ سٹروب (ایک عمدہ قسم کا کپڑا) ۳۔ چمڑے کی ڈھالیں ۴۔ حبشی غلام ۵۔ خوجے ۶۔ چیتے کی کھالیں، عدن سے یہ سامان قافلوں کے ذریعہ مکہ بھیجا جاتا اور وہاں سے مراکش صقلیہ اور اسپین [2]

(۶) **صنعتی اور تجارتی خصوصیات** زبید کا چمڑا اور بے نظیر تیل ۲۔ عدن کا سٹروب کپڑا جس کو مصر کے بنے ہوئے کپڑے قصب سے بہتر سمجھا جاتا ۳۔ مہجرہ کی رسیاں ۴۔ جدیب اور منحولا کی دھاری دار چادریں ۵۔ صعدہ کے تھیلے اور چرمی کپڑا ۶۔ صنعار کے عقیق اور ایک دھاری دار کپڑا جس کا صعیدی نام تھا ۷۔ حالی (یمن) کے پیالے ۸۔ ینبع (حجاز) کی چکیاں اور مہندی ۹۔ یثرب کی مسواکیں اور صیحانی کھجوریں ۱۰۔ عشر (یمن) کی

---

[1] (مقدسی صفحہ ۹۶) [2] (مقدسی صفحہ ۹۷)

ٹوکریاں ۱۱- مروہ (حجاز) کی بردی کھجوریں اور گوند ۱۲- مہرہ (یمن) کا کندر اور مچھلیاں ۱۳- عدن کا ورس (ایک پودا جس سے زرد رنگ نکلتا تھا) ۱۴- مکہ کی سنا ۱۵- قرح (وادی القری) کے قفل ۱۶- عمان کی رضین کھجوریں۔

(ز) معدنیات اور عنبر- بحر (بحرین) کے سمندر میں اوال اور جزیرہ خارک کے مقابلہ میں بڑے پیمانہ پر موتی نکالے جاتے تھے، اس سمندر میں ایک مچھلی تھی جس سے غوطہ خوروں کو سخت خطرہ رہتا کیوں کہ یہ آنکھوں پر جھپٹتی تھی، صنعاء میں عقیق، ینبع اور مروہ کے درمیانی علاقہ میں سونے کی کانیں تھیں، عنبر کی پر اسرار خوشبو عدن اور مخا کے درمیانی ساحل سے حاصل ہوتی تھی جہاں جنوبی ہوائیں لاکر ان کو ڈالتی تھیں، جو شخص عنبر پا لیتا چاہے اس کی مقدار کچھ ہوتی اس کے لئے ضروری تھا کہ حکومت کے محافظ خانہ میں جاکر ان کو جمع کرے۔ اس کے عوض حکومت کی طرف سے اس کو ایک دینار اور کچھ نیا کپڑا بطور انعام ملتا تھا۔ [۱]

(ح) پیمانے- اس ملک میں یہ پیمانے رائج تھے ۱- صاع ۲- مُد ۳- مکوک حجاز میں ان پیمانوں کے اوزان حسب ذیل تھے۔ مُد = ۱/۴ صاع، صاع = ۱/۲ مکوک اور صاع = ۵ ۱/۲ رطل (پونڈ)، مقدسی نے تصریح کی ہے کہ صاع کا وزن حضرت عمرؓ کے زمانہ میں آٹھ رطل کے بقدر تھا اور اسی وزن سے وہ اپنی قسموں کا کفارہ ادا کرتے تھے۔ پھر جب سعید بن عاص، حضرت معاویہ کی طرف سے مدینہ کے گورنر ہوئے تو انہوں نے صاع کا وزن آٹھ رطل سے گھٹا کر ۵ ۱/۲ رطل کر دیا، حجاز کا سب سے بڑا پیمانہ مُہار تھا جو تین سو رطل کے بقدر ہوتا تھا۔ [۲]

(ط) محصولات- جدہ کے بندرگاہ پر حسب ذیل ٹیکس لئے جاتے تھے۔ ۱- گیہوں کے اونٹ بھر بوجھ پر نصف دینار ۲- شطوی کپڑے کی ہر گانٹھ پر ۳ دینار (یہ عمدہ قسم کا کپڑا

---

[۱] (مقدسی ص ۱۰۱) [۲] مقدسی ص ۹۷-۹۸

مصر کے شہر شطا میں بنایا جاتا تھا) ۳۔ دبیقی کپڑے کی ہر گانٹھ پر دو دینار (یہ کپڑا مصر کے شہر دبیق میں بنتا تھا) ۴۔ اونٹ بھر اون پر دو دینار۔ عشر سے جو سامان گذرتا تھا اس پر ذیل کے ٹیکس لئے جاتے تھے۔ ۱۔ اونٹ بھر وزن پر ایک دینار ۲۔ زعفران کی چھوٹی ٹوکری پر ایک دینار ۳۔ ہر غلام پر ایک دینار، ساحلی شہروں میں محصول کی شرح نسبتاً کم تھی۔ قرین اور بطن مرّ میں اونٹ بھر بوجھ پر جو جُدّہ سے مکہ جاتا نصف دینار لیا جاتا تھا۔ زبید کے دروازہ پر مشک کی ہر مقدار پر ایک دینار اور کپڑے کی ہر گانٹھ پر نصف دینار ٹیکس تھا۔ مذکورہ بالا محصولات کے علاوہ جو ٹیکس رائج تھے وہ زیادہ سخت نہ تھے البتہ یمن کے سب ہی ٹیکس سخت تھے عدن میں سامان کی قیمت کا پہلے ڈکا دی دیناروں میں تخمینہ لگایا جاتا تھا اور پھر اسی کا دسواں حصہ عشری دیناروں میں بطور ٹیکس لیا جاتا تھا (عشری دینار کی شرح تبادلہ ڈکا دی دینار کی شرح سے زیادہ تھی مقدسی کی تحقیقات کے بموجب عدن میں تجارتی سامان کا ایک تہائی حصہ بطور ٹیکس شاہی خزانہ کی نذر ہو جاتا تھا۔ صعدہ کے منصف سلاطین تھے[1] ٹیکس کے نام سے کچھ نہیں لیتے تھے بلکہ زکاۃ کے نام سے تجارتی سامان کا چالیسواں حصہ وصول کرتے

(۳) مذاہب مکہ تہامہ، صنعاء اور وادی القریٰ کے لوگ سنی تھے، صنعاء اور عمان کے مضافات میں خوارج کے کٹر شراۃ فرقوں کا زور تھا۔ حجاز کے باقی حصے شیعہ تھے اور یہی مذہب عمان، ہجر اور صعدہ کے ان لوگوں کا تھا جو حدیث کی جگہ قیاس پر زیادہ اعتماد کرتے تھے، عمان، صعدہ، سروات مکہ اور مدینہ کے لوگ معتزلی مسلک کے تھے، یمن کے اکثر قاضی حنفی مذہب تھے، صنعاء اور صعدہ کی جامع مسجدوں پر حنفیوں کا قبضہ تھا۔ معافر کے لوگ ابن المنذر کے مسلک کے پیرو تھے اور نجد یمن کے دیہاتوں میں سفیان ثوری کے فقہ پر عمل ہوتا تھا۔ تہامہ اور مکہ میں آذان ترجیع کے ساتھ دی جاتی تھی اور زبید میں دونوں عیدوں کی نماز سے پہلے تکبیر کہنے کا دستور تھا، ہجر کے لوگ قرمطی اصولوں پر عمل

[1] مقدسی ص ۱۰۵ (۱۰۴)

پیرا اٹھنے۔[1]

(ک) مذہبی جھگڑے۔ مکہ کے شیعی درزی اور سنی قصاب بڑے متعصب تھے اور آئے دن ایک دوسرے سے لڑتے تھے۔ ایسی ہی فرقہ وارانہ لڑائیاں عدن کے ملاحوں اور حمامیس کے درمیان ہوتی تھیں، ینبع کے شیعوں اور سنیوں کے درمیان سخت عداوت تھی۔ زبید کے بچے، حبشی اور نوبی مسلمان بھی مذہب کے نام پر لڑتے تھے۔ یمامہ میں قصاب اور بدو عرب دست و گریباں تھے، جامع مسجد میں ان دو فرقوں کی الگ الگ نماز ہوتی تھی اور اگر کوئی پردیسی مسجد میں آتا تو اس کو یا تو دونوں میں سے کسی کا ساتھ دینا پڑتا یا ذلیل ہو کر مسجد چھوڑنا پڑتی۔[2]

(ل) اخلاق، عادات اور رسومات مکہ کے لوگ اکھڑ اور بدخلق تھے، یمن کے لوگوں میں ظرافت اور شائستگی کی کمی تھی؛ عمان کے لوگ کم ناپتے، کم تولتے اور بدکردار تھے عدن میں زنا کی گرم بازاری تھی، روشنی کے لئے عام طور پر صیفہ مچھلی کا تیل استعمال ہوتا تھا، یہ تیل مہرہ سے آتا تھا اس ملک میں چونا سیاہ رنگ کا ہوتا تھا، یمن کے لوگ اچھی جلدوں کے قدرداں تھے اور جلد بندی کی اچھی اجرت ادا کرتے تھے۔ مقدسی جنہوں نے اپنے سفر میں متعدد پیشے اختیار کئے کہتے ہیں کہ مجھ کو قرآن کی جلد باندھنے کی اجرت کبھی کبھی دو دینار تک مل جاتی تھی۔[3]

عدن میں رمضان آنے سے دو دن پہلے چھتیں سجائی جاتی تھیں اور ان پر نقارے بجائے جاتے تھے، رمضان شروع ہونے پر لوگ سحری سے پہلے ٹولیاں بنا کر قصیدے اور نظمیں پڑھتے گشت لگاتے اور عید کے دن گھر گھر جا کر انعام وصول کرتے تھے، فارسی نوروز کے دن لوگ ڈھول بجاتے ہوئے ان لوگوں کے گھروں پر جاتے جو نوروز مناتے اور خوب روپیہ جمع کرتے، مکہ میں عید سے ایک دن پہلے خیمے اور قناتیں لگ جاتی تھیں اور صفا اور مروہ کے درمیان بازار

---

[1] مقدسی ص ۹۶-۹۵ [2] مقدسی ص ۱۰۲ [3] مقدسی ص ۱۰۰-۹۹

سجائے جاتے تھے اور عید کی صبح تک نقارے بجتے تھے عید کی نماز کے بعد کنیزیں رنگ رنگ کے
لباس پہنے ہاتھوں میں پنکھے لئے کعبہ کا طواف کرنے جاتی تھیں رمضان کے زمانہ میں پانچ
امام تراویح کی نماز پڑھانے کے لئے مقرر کئے جاتے، جب ایک امام چار رکعت پڑھ لیتا تو مؤذن
نمازیوں کو ساتھ لے کر کعبہ کے گرد سات چکر لگاتا اور اس دوران میں مؤذن تکبیر اور کلمے کا باواز
بلند ورد کرتا رہتا، جب سات چکر ہو جاتے تو ایک چرمی کوڑا ہوا میں مارا جاتا جس کی آواز
سن کر نمازی واپس آتے اور دوسرے امام کے ساتھ چار رکعت پڑھتے اس طرح تراویح
ختم ہونے تک ہر چار چار رکعت کے بعد یہی عمل ہوتا تھا۔ [1]

---

[1] مقدسی ص۱۰۳

بوذاسف

از

(جناب مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی لکچرر تاریخ مدرسہ عالیہ کلکتہ)

معارف کے حالیہ شماروں میں قرآن کے صابئین اور بودھ مت کے تقابلی مطالعہ کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے، جس کا پہلا حلقہ دو قسطوں میں مولانا گیلانی مدظلہ العالی کی نگارش قلم کا نتیجہ ہے۔ مولانا نے مبادیاتی امور میں۔ اپنی وسیع وہمہ گیر معلومات کی بنا پر۔ الجھنے کے بجائے براہ راست نفس موضوع کے متعلق اپنی تحقیق کا خلاصہ پیش فرماتے ہوئے مبادیات کو بدیہی قرار دیا اور ان سے کچھ تعرض نہیں کیا ہے، وہ مسعودی اور بیرونی کے اقوال کی روشنی میں اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ قرآن کے صابئین دراصل بودھ مت کے معتقدین تھے۔ ہمارے خیال میں یہ عظیم دعویٰ طویل بحث و نظر کا محتاج تھا اور اس بحث میں پڑنے والوں کے لئے استخراج نتائج سے پہلے بے حد ضروری تھا کہ صابئیت اور بودھ مت کی تاریخ کا صحیح جائزہ لیتے علیٰ ہذا القیاس ان اصطلاحات کی تحقیق بھی کر لیتے جن کا استعمال اس بحث میں ناگزیر ہے:

سلسلہ کا دوسرا حلقہ رنگون کے ایک ندوی فاضل کا ہے۔ اس میں اصل مسئلہ کے متعلق ہلکا سا اشارہ کرتے ہوئے بودھ مت کے بعض خاص الفاظ کی بابت مختصر طور پر مفید باتیں پیش کی گئی ہیں لیکن موضوع کی اہمیت کے لحاظ سے یہ مختصر مضمون نہ

---

[1] معارف (اعظم گڈھ): مولانا مناظر احسن گیلانی۔ ج ۱۷، ع ۲ + ۳ (۱۹۵۳ء) جناب عبدالرحمٰن ندوی: (استدراک) ج ۲۷، ع ۱ (۱۹۵۳ء) جناب سید فضل اللہ۔ ج ۲۷، ع ۲؛ جناب حبیب اصغر قدوائی۔ ج ۳۷، ع ۱ (۱۹۵۴ء)

صرف عوام بلکہ بعض خواص کے لئے بھی اطمینان بخش ثابت نہیں ہوا چنانچہ بعد کے دو فاضل مضمون نگاروں کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ مولانا گیلانی کے اصل دعوی کو تو کیا مانتے ان ابتدائی باتوں کو بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جن کو مولانا نے بدیہیات کا درجہ دیا ہے۔

ذیل میں ہمیں تین لفظ بد بوذاسف اور سمنیہ سے بحث مقصود ہے اور ہماری تحریر کا تعلق براہ راست ان لفظوں کی لغوی تاریخ و تطور سے ہو گا،

بد سنسکرت کے الفاظ بودھی (Bodhi) = عقل، عرفان۔ بودھا (Budha) = عارف بدھا (Budha) = روشن ضمیر، عرفان بخشانندہ، آریائی ریشہ بدھ سے نکلتے ہیں[1]۔ ہند قدیم کی مشہور شخصیت سدھارتا سکیامنی کو جب اعلیٰ درجہ کا عرفان حاصل ہو گیا تو اس کا خطاب بدھا اور بودھی ستوا بمعنی صاحب عرفان و عارف النفس" قرار پایا اور اسی خطاب سے اس کی شہرت عام ہوئی۔

عربوں کی زبان پر بدھ اور بدھا کی شکل "بُدّ" ہو گئی، عربی تصانیف میں بدّ تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے تفصیل درج ذیل ہے

(۱) بُدّ = گوتما بدھ، یہ استعمال ہمارے ناقص خیال میں زیادہ شائع نہیں اسلامی مصنفین جن کا استعمال ہمارے لئے سند بن سکتا ہے وہ گوتاما کو عموماً بوداسف، البد الاول یا البد الاعظم کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ البیرونی کے الفاظ[2]: ہو البدّ الی بلاد الہند کی دلالت گوتم کی شخصیت پر ہو سکتی ہے لیکن قدرے تامل سے واضح ہوتا ہے کہ اس استعمال میں نبی یا رسول سے قریب تر مفہوم کا اعتبار ملحوظ رہا ہے اسی طرح شہرستانی کے قول: تحر بالبدۃ[3] الی ارض الھند لفظ بددہ (بصیغہ جمع)

---

[1] J. G. R. Forlong: Faiths of Man i 346-1906 ء

[2] [3] معارف: ۲/۷۲ ص ۹۹

انبیا، و رسل کے مفہوم کو متضمن ہے گویا بد یا بددہ شہرستانی یا البیرونی کے استعمال میں بھی گوتم کی معہود شخصیت کے لئے کچھ خاص نہیں۔ لہذا لفظ بد کی دلالت گوتم پر عرف عام کے لحاظ سے تسلیم کی جاسکتی ہے اور بس، یہ دعوی کہ گوتم بدھ کے لئے عربی میں بُد کا استعمال ہے اور ثبوت میں[1] مذکورہ عبارتوں کو پیش کرنا قطعاً غلط ہے۔ بدھا کے لئے البد (بلا قید زائد) کا استعمال عربی میں بہت نادر ہے اور ہمارے علم میں ابن الندیم صرف ایک جگہ گوتم کے لئے لفظ بد کا استعمال[2] کرتا ہے:

شہرستانی کے سابقہ الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ بدھا ہونے والی ہستیوں (Buddhes Successive) کا ذکر کر رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ گوتم کو "بد اول" قرار دیتا، اور اس کا نام "شکمین"[3] بتاتا ہے؛ جو بظاہر "سکیا مونی" کی تعریب ہے؛ شہرستانی کے پیشرو بھی اس نظریہ سے واقفیت رکھتے تھے چنانچہ ابن ربن طبری کتاب الدین والدولہ[4] کے ابتدائی صفحات میں مذاہب قدیمہ کا جائزہ لیتے ہوئے ہند کے بددہ (عرفانی ہستیوں) کا ذکر کرتا ہے؛ اسی طرح مسعودی کی مروج الذہب میں ہمیں اس نظریہ کا اجمالی ذکر ملتا ہے؛ پالی مصادر، اور سنسکرت ماخذ "مرکب صغیر" (Little Vehicle) سے متفقہ طور پر بدھوں[5] کا تعدد ثابت ہے اور اس حد تک یہ مسئلہ قدیم اجماع کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی تائید اثری شہادتوں سے بھی ہوتی ہے؛ البتہ پالی مصادر میں بدھوں کی فہرست بہت طویل ہے جس میں آخیر کے صرف چھ نام سنسکرت ماخذ سے متفق ہیں؛ پالی مصادر کی رو سے معلوم ہوتا ہے کہ سکیا مونی (گوتم بدھ) سے پہلے گزرنے والے بدھوں کی تعداد چوبیس[6] ہے؛ ان میں سے ایک بدھا کوناگامانا (Konagamana) کے "استوپا" کی زیارت اشوکا نے کی تھی یہ اطلاع اشوکا کے ایک پتھر سے

---

[1] معارف: ۲/۷۲ ص ۹۹ [2] کتاب الفہرست: الفن الاول: ص ۳۴۷ مصر ۱۳۴۸ھ یورپ [3] طبع مسلمانا؛ [4] [5] Ency Brit. IV, 327 [6] Ency of Relig. & Ethics-II, 739 29th edition.

حاصل ہوتی ہے جو انیسویں صدی کے اواخر میں نیپال بوا ڈر سے برآمد ہوا تھا؛ البتہ قدیم بدھی لٹریچر میں اس بات کا سراغ نہیں ملتا کہ کسی سابق بدھا کے نقش قدم پر چلنے کی دعوت خود گوتم بدھ نے دی ہو یا اس کے کسی خاص چیلے نے ماضی کے کسی بدھا کا حوالہ دیا ہو؛ بہر حال ہم یہ نہیں کہتے ہیں کہ جہاں عرب مؤرخین البد کا لفظ نبی یا مرسل کے مفہوم میں استعمال کرتے ہیں وہاں گوتم بدھ کے سوا کسی اور کو مراد لیتے ہیں، نہیں وہ غالب گمان یہی ہے کہ گوتم کو مراد لیتے ہیں البتہ وہ اس کے علاوہ بدھوں کے بارہ میں بھی بطریق اجمال ضرور واقفیت رکھتے ہیں۔ اور بہت ممکن ہے کہ بدھا کو طوفان نوح سے قبل بتانے والوں کا منشا گوتاما سے پہلے کے بدھوں کے وجود و ظہور کا نظریہ ہو ہمارے اس خیال کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ مسعودی اہل ہند[1] کی تاریخ کی ابتدار "العبد الاول" کے ظہور سے بتلاتے ہوئے ناقل ہے کہ اس کے ظہور پر ۳۶۰۰۰ × ۱۲۰۰۰ سال گزر چکے ہیں اور شہرستانی اس کی تاریخ[2] پانچ ہزار برس قبل ہجرت بتاتا ہے؛ خود بودھ مت کی تاریخی روایات کا یہ حال ہے کہ چین کے بودھیوں کے قدیم دعوی کے مطابق گوتاما ۱۰۲۷ ق م تک زندہ رہا اور تبت والوں کے حساب کی رو سے ۲۰۰۰ ق م تا ۸۸۲ ق م اس کا زمانہ[3] ہے۔

(۲) بد = مندر: انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا مضمون نگار[4] اس معنی میں لفظ بد کے استعمال کو بہت نادر قرار دیتا ہے اور اس استعمال کی شہادت میں بزرگ بن شہریار کی کتاب عجائب الہند کی ایک عبارت کا ترجمہ پیش کرتا ہے۔ مضمون نگار کا یہ دعوی سراسر غلط ہے بد بمعنی مندر عربی تصانیف میں عام طور پر استعمال ہوا ہے؛ ابن الفقیہ کے الفاظ ہیں: الهند وقفوا الجواری علی البُدّ یہاں "البد" کے صحیح معنی مندر کے ہیں ہندوستان

---

[1] التنبیہ والاشراف: ص ۱۲۹، ۱۷۱ طبع مصر [2] الملل والنحل [3] Faiths of: 1, 348-49
[4] B. Carra De Vaux. Vol: 1, 769 Man
[5] آثار البلاد للقزوینی ص گوٹنجن ۱۸۴۸ء

کی دیوداسیوں کی روایت بہت مشہور ہے؛ اس سے زیادہ واضح استعمال البلاذری کی فتوح البلدان میں ملتا ہے دیبل کے مشہور بت خانہ کے ذکر میں لکھتا ہے: وکان بالدیبل بُدٌّ عظیم (دیبل میں بڑا بت خانہ تھا) اور آگے خود ہی اس لفظ کی تفسیر میں کہتا ہے:

"والبد فیماذکروا منارة عظیمة فی بناء لهم فیه صنم لهم أو أصنام"[1] — لوگوں کا بیان ہے کہ بدّ اہل ہند کے معبد جس میں ان کے بت رکھے ہوتے ہیں اسی کے بڑے مناڑ کو کہتے ہیں"

محمد بن قاسم نے رور پر صلحاً قبضہ کیا تھا شرائط صلح میں اس بات کی تصریح تھی کہ لا یعرض لبدّهم[2] یعنی مندروں کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔ بد کی واضح تر تشریح بلاذری کے ان الفاظ میں ملاحظہ ہو:۔

ما البدّ[3] الا کنائس النصاری والیهود وبیوت نیران المجوس — "بد عیسائیوں کے کنیسہ، یہودیوں کے معبد اور آتش پرستوں کے آتش خانہ کی طرح ہوتا ہے"

غرض بد، مندر کے مفہوم میں عرب تصنیفات میں اس قدر شائع ہے کہ اس کی ندرت کا وہم وگمان بھی نہیں ہو سکتا؛

(۳) بدھ = بت، مورت؛ اس استعمال میں بدھا کی مورتی کی تخصیص نہیں۔ عرب سیاحوں کی زبان پر سندھ وہند کی ہر قسم کی مورتیوں کے لئے بُدّ اور بصیغہ جمع بددہ رائج رہا ہے۔ ہماری تاریخوں میں بھی یہ لفظ بلا تخصیص بتوں کے لئے مستعمل ہے: البلاذری کے بیان سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بتوں کے علاوہ ہر وہ چیز جس کی عبادت اہل ہند کیا کرتے تھے وہ بھی بد سے تعبیر کی جاتی تھی اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

وکل شیئ[4] اعظموه من طریق العبادة فهو عندهم بدٌّ والصنم — ہر وہ چیز اہل ہند جس کی عظمت دل میں رکھتے ہیں وہ ان کے یہاں بد کہلاتی ہے اور بت بھی بدّ ہے

---

[1] فتوح البلدان: ص ۴۳۶ طبع دی خوید ۱۸۶۶ء [2] ایضاً ص ۴۳۹ [3] ایضاً ص ۴۳۹ نیز ص ۴۴۰ ، ص ۴۴۵ [4] ایضاً

بلاذری کا سیاق بتاتا ہے کہ بد کا استعمال اس معنی میں عربوں کا ذاتی تصرف نہیں تھا بلکہ خود اہل سندھ بھی اس معنی میں اس کا استعمال کرتے تھے اور انھیں سے عربوں نے اس لفظ کا استعمال سیکھا؛ بہرحال کہنا یہ ہے کہ عربی تصانیف میں لفظ بد کا تعبیراً استعمال اس حد تک عام ہے کہ اس کے بدیہی ہونے میں شبہ نہیں تاہم مزید شہادتیں دو معتبر مصنفوں کی پیش کر دی جاتی ہیں۔

(الف) ابوعبداللہ محمد بن احمد خوارزمی کتاب مفاتیح العلوم میں[1] رقمطراز ہے:۔

البد: وهو صنم الهند الاكبر الذي يحجونه، ويسمى كل صنم بدًا[2]	بد: ہند کا سب سے بڑا بت جس کی وہ زیارت کرتے ہیں اور ہر بت بد کہلاتا ہے۔

(ب) ابن الندیم - کتاب الفہرست میں ایک خاص باب اس عنوان سے قائم کرتا ہے: اسماء مواضع العبادات ببلاد الهند وصفة البيوت وحالة البددة - اس باب میں اس نے مشہور مندروں اور ان کی مورتیوں کی مفصل کیفیت لکھی ہے؛ مانکیر، سنہری سرحد (ملتان) قمار اور مدینۃ الصنف کے مندروں اور بتوں کے بیان میں بار بار بد اور بددہ استعمال کیا ہے؛ اخیر میں ایک ذیلی عنوان الکلام علی البد کا باندھا ہے اور بد کی تشریح میں اہل ہند کے مختلف آراء و اہواء کو بیان کیا ہے اس کے الفاظ کے ضروری اجزاء مندرج ذیل ہیں:۔

اختلف الهند في ذلك فزعمت طائفة انه صورة البارى تعالى (وقالت طائفة هو...) جده وقالت طائفة صورة رسوله الكريم صورة بوذاسف الحكيم الذي	اہل ہند اس (بد) کی تشریح میں مختلف خیال رکھتے ہیں ایک گروہ اس کو باری تعالیٰ کی صورت سمجھتا ہے تو دوسرا اس کو رسول کی صورت کہتا ہے؛ ــــ اور ایک گروہ اس کو بوذاسف

---
[1] طبع فان فلوتن ص۱۲۳ ۱۸۹۵ء [2] طبعہ مصر ص۴۸۶ [3] الفہرست ص۴۸۶

انا ھم من عند اللّٰہ جل اسمہ — وحکی بعض من یصدق عنھم ان لکل ملۃ منھم صورۃ یرجعون الی عباد تھا ویعظمونھا وان البد اسم للجنس والاصنام کالانواع

حکیم کی مورتی کہتا ہے جو ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا تھا:—— اور بعض معتمد ناقلین کا بیان ہے کہ اہل ہند کے ہر مذہبی طائفہ کی ایک خاص مورتی ہوتی ہے جس کی وہ عبادت و تعظیم کرتا ہے اور بد کا لفظ بطور اسم جنس ہے جو مختلف اصنام کو شامل ہے :

بوذاسف بودھی ستوا (Bodhisattva) = جس شخص کا جوہر باطن، عرفان محض ہو بہ الفاظ دیگر "عارف النفس" یہ تشریح اصل مفہوم سے قریب تر سمجھی گئی ہے : ورنہ تاریخی طور پر اس لفظ کے معنی "طالب حق" یا "طالب عرفان" یعنی مستقبل میں بدھا ہونے والی ہستی کے ہیں ۔ اسی لفظ کی شکل قدیم ایرانی لٹریچر میں بوتاسست[۱] (Botasat) ہے : پہلوی کے ذریعہ یہ لفظ عربی میں بہ شکل "بوداسف" منتقل ہوا اور ب و ی کی مشاکلت کی بنا پر اس کی ایک شکل "یوداسف" بھی بنی ۔ مسیحیوں کا سینٹ جوسا بہت (Josaphat) جس کی یادگار میں یونانی کلیسا نے ۲۶ / اگست کا دن مقرر کیا اور روما کے (sister church) نے ۲۷ / نومبر کا خاص دن رکھا اس کی اصلیت بھی اہل تحقیق کے فیصلہ کے بہ موجب سنسکرت کا "بودھی ستوا" ہے ۔ گوتم بدھ نے اپنی ریاضت کے دوران میں "بودھی ستوا" کا خطاب پایا تھا اور اس لفظ کے اصل مفہوم کا اگر لحاظ رکھا جائے تو "بدھا" بننے کے بعد بھی گوتم بدھ پر یہ خطاب بالکل چسپاں رہا ۔ عرب مصنفین عام طور پر گوتاما کو بوذاسف لکھتے ہیں اور مسعودی[۲]، بیرونی، ابن الندیم، الخوارزمی بیک زبان اس کو ہندی الاصل قرار دیتے ہیں ۔ مسعودی کا بیان بوذاسف کے متعلق بہت صاف

[۱] Ency of Relig II-739 [۲] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام : ج ا ص۳؛ بحوالہ ترجمہ دبستان از جے ڈرمستیتر ج ۲ / ۲۵۹ [۳] VII-568 [۴] Ency of Relig [۵] معارف : ۲ / ۴۲ : ص ۹۶ ، ص ۹۷

اور صریح ہے اور اسی کا بیان مولانا گیلانی کے پورے مضمون کا سنگ بنیاد ہے۔

"بوذاسف[1] کا ظہور ہندوستان میں ہوا وہ ہندی تھا سرزمین ہند سے سندھ آیا پھر سجستان اور زابلستان کی سیر کی جو فیروز بن کبک کا قلمرو تھا پھر سندھ سے کرمان تک کا سفر کیا اور نبوت کا دعویٰ کیا اپنے کو اللہ کا رسول اور خالق و مخلوق کے درمیان واسطہ بتایا وہ طہمورث بادشاہ فارس کے اوائل عہد میں یا جمشید کے زمانہ میں فارس آیا۔ صائبہ کے مذہب کو اول اسی نے ظاہر کیا جیسا کہ اسی کتاب (مروج) میں ذکر گزرا ہے؛ (مسعودی)

ابن الندیم کا قول لفظ بد کی تحقیق میں گذر چکا ہے کہ وہ بدھا کو بوذ اسف الحکیم کہتا ہے پھر اس نے سمنیہ کے مذاہب کے بیان کے لئے الگ عنوان اختیار کیا ہے اور بوذاسف کو سمنیہ کا نبی قرار دیا ہے؛ اس کا بیان جس کتاب سے ماخوذ ہے وہ اس مذہب کے دستور کی حیثیت رکھتی تھی اور جیسا کہ آئندہ سطروں میں وضاحت کی جائے گی عرب تصانیف میں سمنیہ سے بودھ مت کے معتقدین مراد ہوتے ہیں۔

الخوارزمی، مفاتیح العلوم میں لفظ سمنیہ کی شرح میں کلدانیوں کو صابی قرار دیتا ہے اور لکھتا ہے کہ "یہ لوگ بوذاسف[2] کو جو ہندوستان میں ظاہر ہوا تھا اپنا نبی بتاتے ہیں۔ حمزہ اصفہانی طہمورث کے عہد پر روشنی ڈالتا ہوا ذکر کرتا ہے کہ اسی کے عہد میں ایک شخص بوداسف کے ماننے والوں نے روزہ رکھنے کا طریقہ نکالا[3] حمزہ نے بوداسف کی وطنیت ظاہر نہیں کی ہے، اس کی خاموشی کا خاص سبب یہ ہے کہ تاریخ کا تفصیلی بیان اس کی کتاب کے موضوع سے خارج ہے۔ بوداسف کی ایک اور شکل عربی میں بوداسب ہے جو ہمیں مسعودی کی کتاب التنبیہ والاشراف[4] میں ملتی ہے۔

ایک فاضل مضمون[5] نگار شہرستانی اور البیرونی کی عبارتیں نقل کرتے ہیں اور اپنی

[1] مروج الذہب: (برحاشیہ نفح الطیب مصر) ج ۲/۳۸؛ [2] ص ۳۶؛ [3] سنی ملوک الارض: صفحہ ۲۲ طبعہ کادیانی۔ برلن ۱۳۴۰ھ؛ [4] صفحہ ۳۸ صفحہ ۹۹ مصر؛ [5] سید فضل اللہ: معارف ۴/۲ صفحہ ۹۹

تحقیق کا نتیجہ حسب ذیل لفظوں میں پیش کرتے ہیں۔

"اس سے معلوم ہوا (؟) کہ بدھ کی تعریب بد یا بددہ ہے نہ کہ بوذاسف؛ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عربی کتابوں میں بدھ بلا تصرف تعریب استعمال کرتے ہیں کوئی شہادت ہمارے پاس ایسی نہیں جس سے سمجھا جائے کہ بوذاسف بدھ کا معرب ہے، عربی کتابوں میں جہاں بدھ کے حالات لکھے ہیں اس کو بدھ سے تعبیر کرتے ہیں اور بوذاسف کو بوذاسف سے

(معارف ج ۲۷ ص ۹۹)

مضمون نگار کا یہ دعوی کہ بوذاسف، بدھ کی تعریب نہیں، صحیح ہے اور یہ بھی بجا ہے کہ بدھ کی تعریب بد ہے لیکن تعریب کی دوسری شکل بددہ (بالواو) کو قرار دینا محض غلط ہے؛ شہرستانی کی عبارت میں — بددۃ — بصیغہ جمع وارد ہے۔ جس سے صریح اشارہ بدھا ہونے والی مختلف ہستیوں کی طرف ہے۔ اور سخت حیرت ہمیں اس دعوی پر ہے کہ "عربی کتابوں میں بدھ بلا تصرف تعریب استعمال کرتے ہیں اور بدھ کو بدھ سے تعبیر کرتے ہیں نہ کہ بوذاسف سے"۔ عربی کتابوں کا صریح استعمال تصریحات بالا سے واضح ہے جن کی روشنی میں اس فاضلانہ دعوی کی حقیقت بے نقاب ہوجاتی ہے۔

سمنیہ یہ بودھ مت کے معتقدین کے ایک خاص طبقہ کا نام ہے؛ لیکن ہمارے مورخین اس کا اطلاق بودھیوں پر بلا تخصیص کرتے ہیں۔ البیرونی کے بیان کے مطابق اہل خراسان بوذاسف کے متبعین کو "شمنان" کہتے تھے[1]۔ بودھ مت کی اشاعت ایران اور مشرق قریب میں جس کا ذکر ڈوزی[2] نے کیا ہے محل تعجب نہیں کہ خود بیرونی کے سابق بیان سے خراسان میں اس مذہب کا وجود قدیم زمانہ سے مترشح ہے: اور وہ ایک موقع پر بصراحت لکھتا ہے کہ زردشت سے بیشتر خراسان، فارس اور موصل میں مذہب سمنیہ (بودھ مت) پھیلا ہوا تھا[3] اس کے ساتھ ہی ابن الندیم کا یہ بیان ملاحظہ

---

[1] معارف ۳/۱۷ صلا [2] ایضا: صنہ [3] الہند صن۱

ہو کہ "سمنیہ کا بنی بوذاسف تھا اور قبل اسلام زمانہ قدیم سے ماوراء النہر کے لوگ اسی مذہب کو مانتے آئے تھے۔ لفظ سمنیہ کی تحقیق میں اس کے الفاظ صرف اس قدر ہیں کہ سمنیہ کی نسبت سمنی کی طرف ہے؛ اور الخوارزمی لکھتا ہے: ھم اصحاب سمن (سمنیہ سمن کے ماننے والے ہیں)

سمنی اور سمن کی اصلیت بلاشبہ پالی سمانو (samana) یا پراکرت سمنا (samana) ہے۔ جو اصطلاح میں بودھ مت کے مبلغین کا لقب ہے۔ اس لفظ کی اصل سنسکرت سرمنار (cramana) ہے۔ یہ لفظ بودھ مت کی اشاعت کے ساتھ مختلف قوموں کی زبان پر تھوڑی ترمیم کے ساتھ رائج ہوا؛ صغدی اور سجستانی میں یہی لفظ فارسی کے شمن کا ہم آواز تھا؛ چینی زبان میں اس کی شکل شامن (shamen) تھی؟ سمن اور سمنتا، تبت کے بودھیوں کے ایک دیوتا "اوالوکیت الیشورا" (Avalokitesvara) کا دوسرا نام تھا جس کی نسبت سے یہ لوگ بھی سمن کہلاتے؛ ترک، تاتار اور منگول کے عقیدہ میں ان کا سب سے بڑا دیوتا تنگری (Jangri) مشرق کی خبیث ارواح سے برسرپیکار رہنے والی ایک مخصوص جماعت کا خلاق مانا جاتا تھا یہ جماعت "شمن" کہلاتی تھی۔

ایک یورپین محقق کی رائے میں صغدی یا سجستانی کے واسطہ سے یہ لفظ فارسی زبان میں داخل ہوا، شمن = بت پرست، فارسی کا مشہور لفظ ہے جو عام طور پر اسی معنی میں مستعمل رہا ہے اور مستند فارسی شعرا مثلاً رودکی، سنائی، شمس فخری، انوری وغیرہ کے کلام میں ملتا ہے: طبقہ قدیم کا ایک شاعر کوہی مروزی کہتا ہے:

نگاہ کن بگلِ سرخ ناشگفتہ تمام ۔۔۔ چو لعبتے کہ شمن را ہمی نماز کند

---

۱ الفہرست ص ۳۴۵ ۲ مفاتیح: ص ۳۶ ۳ V. F. Buchner Faiths of man iii, 234

۴ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ج ۴ (لفظ شمن) ۵ Anglo Eng. Dict. Vol. VIII, 616; Oxford 1914.

(لباب الالباب عوفی ج ۲)

اور مجیر بیلقانی کا شعر ہے:

مست بر خاستہ ترکی کہ سپہرش ہندو ست   خواب نا کردہ بتے کش دل خاصا شمن است[1]

البیرونی کے مذکورہ بیان میں "شمنان" اسی لفظ کی جمع ہے اور ہماری تفصیل سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عربی کے سمن، سمنیہ اور فارسی کے شمن دونوں کا منبع اگرچہ ایک ہے ان میں اتنا فرق ضرور ہے کہ فارسی میں اس لفظ کا داخلہ براہ راست پالی یا سنسکرت سے نہیں ہوا جب کہ عربی میں غالب گمان یہی ہے کہ براہ راست پالی یا پراکرت سے آیا البلاذری فتوح السنہ کے باب میں سمنیہ اور سمنیوں کا ذکر کرتا ہے[2]؛ ہماری کتب کلامیہ میں جو سمنیہ کا لفظ مستعمل ہے کوئی وجہ نہیں کہ اس کو اہل خراسان کے شمنان سے ماخوذ قرار دیں یا سومنات کی طرف منسوب سمجھیں[3]؛ یہ بھی واضح رہے کہ سمنیہ کا لفظ بودھ مت کی اصطلاح میں جس خصوصیت کا حامل ہے وہ اسلامی مصنفین کے استعمال میں ختم ہو جاتی ہے؛ البیرونی مسعودی، البلاذری، ابن الندیم اور خود الخوارزمی جس کے اسلوب سے ظاہر ہے کہ وہ بودھ کے عام متبعین کو سمنیہ کا نام دینا نہیں چاہتا ان سب کی تحریریں ثبوت کے لئے کافی ہیں؛ کہ عرب بودھ کے عام متبعین کو سمنیہ کہتے ہیں۔ لہذا یہ دعویٰ کہ "بودھا کے ہر پیرو کو شمنان نہیں کہہ سکتے"[4] ناقابل اعتناء ہے ہم ان مصنفین کے استعمال کو غلط نہیں کہہ سکتے اور کسی زبان میں جب اجنبی الفاظ داخل ہوتے ہیں تو صوتی ترمیم کے ساتھ ان کے مفہوم میں کچھ ردّ و بدل مثلاً تعمیم یا تخصیص کا وقوع کچھ عجیب نہیں۔

---

[1] قصیدہ در مدح سلطان ارسلان بن طغرل: راحۃ الصدور ص ۳۱۲ گب میموریل سیریز؛

[2] ص ۴۲۷، ۴۳۰ طبعہ ڈی خویہ

[3] معارف ۳/۷۱ ص ۱۶۷، ص ۱۶۷ (حاشیہ)

[4] معارف: ۱/۷۲، ص ۷۱

تاریخی حقائق

از

(جناب مولانا محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی استاذ حدیث دار العلوم معینیہ اسٹیشن)

"آج کل "اسلامی نظام امن وامان" کے عنوان سے ایک مضمون کی فکر میں ہوں، اس سلسلہ میں مختلف کتابوں کا مطالعہ جاری ہے "مسلمانوں کا نظم مملکت" پڑھتے وقت کچھ واقعات ایسے سامنے آتے جو مجھے بہت پسند آئے، دل نے کہا یہ حقایق ناظرین برہان کے سامنے بھی پیش کر دیئے جائیں، وما توفیقی الا باللہ۔ (ظفیر صدیقی)

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت اپنی جگہ کے لئے حضرت فاروق اعظم رض کا نام نامی پیش فرمایا اور پھر عوام کے سامنے اس کو رکھ کر منظوری حاصل کی، پھر حضرت عمر رض کو بلا کر نصیحتیں کیں، ان تمام کاموں سے جب فارغ ہو چکے تو آپ نے ہاتھ اٹھایا اور رب العزت کی درگاہ میں التجا کی،

"خدا! اس سے مری نیت امت کی فلاح وبہبودی کی ہے، میں نے فتنہ سے ڈر کر انھیں حاکم مقرر کر دیا ہے تو واقف ہے، میں انتہائی غور وخوض کے بعد اپنے خیال میں سب سے بہتر، سب سے طاقتور، اور سب سے زیادہ رشد وہدایت کے دل دادہ فرد کو ان کا خلیفہ منتخب کیا ہے، میں اب موت کی گھڑیاں گن رہا ہوں، امت کو ترے سپرد کرتا ہوں، وہ ترے بندے ہیں، ان کی جان وآبرو تیرے اختیار میں ہے، ان کے حاکم فلاح وبہبودی کے کام کریں اور صراط مستقیم پر قایم رہیں۔ عمر کے وسیلے سے امت کو [illegible] اور اس کی اصلاح فرما"[1]

پوری دعا کتنی موثر اور درد انگیز ہے؟ لفظ لفظ سے وفات پانے والے خلیفہ کا اخلاص

---

[1] نظم مملکت صفحہ ۹۰ وصفحہ ۹۱

اور قومی محبت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اور دیکھنا یہ ہے کہ اپنے رب سے ہمارے اسلاف کو کتنا گہرا قلبی تعلق اور شغف ہے۔ اے کاش ہمارے اس زمانہ کے مسلمان اس اخلاص نہ درد کو اپنے اندر جذب کر لیتے، اور دنیا کے دوسرے انسان سوچتے کہ خلیفہ اور قوم کے سردار کے اخلاق و اعمال کیسے پاکیزہ ہونے چاہئیں۔

حضرت عمرؓ جب زخمی ہوئے تو چند ممتاز صحابہ کبار حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ مناسب معلوم ہو تو کسی کو اپنا جانشین متعین فرما دیجئے۔ یہ سن کر متاسفانہ لہجہ میں فرمانے لگے کسے جانشین بناؤں؟ ابو عبیدہؓ زندہ ہوتے تو ان کو مقرر کر دیتا کہ رحمت عالم نے ان کو "امین الامۃ" فرمایا تھا، ابو حذیفہؓ کے غلام سالمؓ زندہ ہوتے تو انھیں اپنا جانشین مقرر کر دیتا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ سالم خدا سے بے حد محبت کرنے والے ہیں، اپنا یہ افسوس ظاہر ہی کر رہے تھے کہ درمیان میں ایک شخص نے یہ کہہ کر دخل دیا کہ عبداللہ بن عمرؓ کو مقرر فرما دیجئے، اس مشورہ سے آپ کو بے حد تکلیف ہوئی اور فرمایا

"اس کا تو مجھے کبھی وہم تک نہیں ہوا ہے"[1]

اس سے اندازہ لگایئے، ہمارے اسلاف کا باطن کتنا پاکیزہ تھا، اور یہ کتنے دور اندیش تھے

یزید کی موت کے بعد اس کا بیٹا ثانی معاویہ جانشین مقرر کیا گیا، مگر معاویہ ثانی نے چالیس دن بعد خلافت سے علیحدگی اختیار کر لی اور اس خلافت کے مسئلہ کو جمہور پر چھوڑ دیا، انھوں نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا

"انتخاب خلیفہ کا حق صرف تم لوگوں کو حاصل ہے جس کو مناسب سمجھو اپنا خلیفہ بنا لو"[2]

حق پرستی کی مثال قائم کر گئے، اپنے خاندانی روایات کے خلاف حق کا یہ اعلان جتنا اہم ہے، وہ ہم سب کے لئے درس عبرت ہے، اس واقعہ میں جو سبق ہے اسے اپنانے کو اس زمانہ میں بڑی ضرورت ہے،

---

[1] مسلمانوں کا نظم مملکت صلا [2] ایضاً ص۶۰

مورخین حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو عدل و انصاف اور زہد و تقویٰ میں خلفائے راشدین کا ہمسر سمجھتے ہیں انھوں نے خلیفہ ہونے کے بعد جو خطبہ دیا تھا، وہ سب کے پڑھنے کے لائق ہے آپ نے فرمایا

"لوگو! قرآن کے بعد کوئی اور کتاب آسمان سے نہیں، نازل ہوگی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی اور نبی مبعوث نہ ہوگا، میں مقنن نہیں ہوں، صرف قوانین کا نافذ کرنے والا ہوں، میں کسی نئی بات کو رواج نہیں دوں گا، مگر اپنے بزرگوں کی تقلید کروں گا، میں تم میں سے کسی فرد سے بہتر نہیں ہوں ہاں مرے کندھوں پر بوجھ (بار خلافت) ضرور تم سب سے زیادہ ہے یاد رکھو خدا کی نافرمانی میں بندے کی کوئی بھلائی نہیں ہے"[1]

ایک خلیفہ نے اپنی پالیسی کا کتنا اچھا تلا پروگرام بتایا ہے، اس میں نہ اپنی بڑائی ہے، نہ اپنے علم و تقویٰ کا اظہار ہے، بلکہ عجز و انکساری ہے اور خدا کی کتاب اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے قوانین کے نفاذ کا اعلان ہے

خلیفہ متوکل جب سلطان سلیم کے تسلط کے بعد کسی حد تک نظم و نسق میں دخیل باقی رکھا گیا، تو لوگ خلیفہ متوکل کو سلطان سلیم تک رسائی کا ذریعہ بناتے، لکھا ہے

"حاجتمند سلطان سلیم تک رسائی کے لئے خلیفہ کو واسطہ بناتے اور سلطان عموماً اس کی سفارشیں رد نہ کرتا، ستم رسیدہ افراد اپنی مقصد براری کے لئے اس کثرت سے خلیفہ کے پاس آتے کہ اس کے محل میں تل رکھنے کی جگہ نہ رہتی"[2]

دیکھنا یہ ہے کہ ستم رسیدہ اور حاجت مندوں کی خلیفہ بغیر کسی حرص و غرض کے کیسی دل دہی کرتا تھا کہ لوگ اس کے یہاں ٹوٹے پڑتے تھے، اور جائز سفارش کرنے میں خلیفہ کبھی کوتاہی نہ کرتا تھا بلکہ اسے غریبوں سے بے حد ہمدردی تھی،

سنہ ۳۰۱ھ میں علی بن عیسیٰ نامی وزیر اعظم مقرر کیا گیا، کہا جاتا ہے کہ عہد عباسیہ میں یہ وزیر

---

[1] مسلمانوں کا نظم مملکت صہ۳ [2] ایضاً صہ۱۳۶

زہد و تقویٰ اور پاکیزہ صفات میں اپنا ثانی نہیں رکھتا ہے، اس کے متعلق بیان ہے۔

علی بن عیسیٰ نے نفراز اور بے بس انسانوں کی حالت سدھارنے کی طرف عملی قدم اٹھایا اور اس مقصد کے لئے اپنی ذاتی جائداد کی نصف آمدنی وقف کر دی، اس وقف کی سالانہ آمدنی اسی ہزار دینار (چار لاکھ روپیہ) سے زیادہ تھی، اس کے ماسوا اور بہت سے وقف کئے تھے اسے کہتے ہیں قوم و ملک سے محبت، صرف زبانی لکچر نہیں دیا کرتا تھا، عمل سے کر دکھاتا تھا، اب تو دوسروں سے اپیل کی جاتی ہے، اور اپنا گھر بھرا جاتا ہے، آج کل کوئی وزیر ذاتی جائداد غریبوں اور مزدوروں پر خرچ کر سکتا ہے؟ بلکہ مل جائے تو وہ سعی کرے گا کہ ذاتی آمدنی میں اضافہ ہو جائے۔ غریبوں کی ہمدردی میں لمبی تقریر، اور زوردار بیان سے زیادہ اور کچھ کرنا غیر ممکن سی بات ہے، الاماشاء اللہ ؎

تجھے آبار سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت وہ سیارا

اس کے اخلاق و اعمال کے متعلق بیان ہے

"یہ وزیر نہایت عادل تھا، عدل و انصاف کے وقت امیر و غریب، شریف و رذیل اس کی نظر میں سب برابر تھے، اس معاملہ میں کسی کی رو رعایت کا قائل نہ تھا، اکثر اوقات عدالت کا اجلاس اور جھگڑے قضیوں کا فیصلہ خود کرتا"[۲]

اس میں موجودہ دور کے وزرار کے لئے سبق ہے، کہ وزیر کے کیا صفات ہونے چاہئیں، اب یہ خوبیاں ہمارے دور کے وزیروں میں عنقا ہیں، غریب اور رذیل کے ساتھ آج کون انصاف کرتا ہے؟ اگر یہی بات ہوتی تو کمیونسٹ کا یہ زور دیکھنے میں کیوں آتا۔ اور خونی انقلاب کی یہ تیاریاں کیوں ہوتیں؟

عباسی وزرار میں ابو نصر احمد بھی بڑا مشہور وزیر گذرا ہے، یہ وزیر اعظم نظام الملک کا بیٹا تھا اس نے اپنے زمانہ میں جبر و تشدد کا خاتمہ کر دیا تھا، اس کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ

---

[۱] مسلمانوں کا نظم مملکت ص ۱۵۹ [۲] ایضاً

"مسترشد باللہ نے ایک دفعہ بغداد کی شہر پناہ تعمیر کرنے کے لئے شہریوں پر اجتماعی طور پر پندرہ ہزار دینار - ۷۵ لاکھ روپیہ کی رقم واجب کی تھی، ابو نصر نے یہ رقم ان سے لینا گوارا نہ کیا اور اپنی ذاتی دولت سے ادا کر دی۔[1]"

اللہ نے دولت دی تھی، تو انسانی ہمدردی سے بھی نوازا تھا، قوم سے ہمدردی ہو تو ایسی ہو صرف زبانی نہ ہو، ہمارے زمانہ کے وزراء کی ذاتی جائداد لاکھوں لاکھ کی ہے مگر ایک حبہ بھی غریبوں پر نہیں خرچ کرتے، اگر یہ اتنا ہی کریں کہ حکومت کے خزانہ میں جو رقم غریبوں کے لئے منظور ہوتی ہے، وہ ان کو دے دیں تو غنیمت ہے مگر اس کی امید بھی خواب و خیال سے زیادہ نہیں ہے۔

عہد مستنصر میں ایک وزیر افضل بن بدر جمالی بڑا نامی گرامی وزیر اعظم گذرا ہے اس کے متعلق لکھا ہے

"اس کے یہاں ایک کمرہ "مجلس عطا" کے نام سے موسوم تھا، جس میں افضل بذات خود بیٹھتا تھا، اور اپنے ہاتھ سے ہر مصیبت زدہ اور مفلس شخص کو ایک ایک دینار عطا کرتا تھا، مجلس عطا میں اس مقصد کے لئے آٹھ تھیلیاں روزانہ رکھی جاتی تھیں، جن میں پینتیس ۳۵ ہزار دینار ہوتے تھے، دو تھیلیاں زنان خانہ میں رکھی رہتی تھیں۔[2]"

اب تو کسی وزیر اعظم یا دوسرے وزراء کے پاس کسی مفلس کا پہنچنا ہی غیر ممکن ہے مفلس کو حکومت کے احاطہ میں قدم رکھنے کی اجازت کہاں؟ اب تو وزراء سے ان حضرات کو ملنے کی اجازت ملتی ہے، جو سرمایہ دار، سیاسی لیڈر اور کسی بڑی پارٹی کا صدر وغیرہ ہو مفلوک الحال کو چپراسی کوٹھی کے گیٹ کے اندر جانے کی اجازت دیں؟ غیر ممکن ہے، اور اگر کوئی غریب کسی ترکیب سے پہنچ بھی جائے، تو اس کی ضرورت وزیر پوری کر دے؟ آج کل یہ بات کسی کے بھی سمجھنے کی نہیں، زیادہ سے زیادہ وہ اپنے سکریٹری کے پاس بھیج دیں گے، اور

---

[1] نظم مملکت صفحہ ۱۶۲ [2] ایضاً صفحہ ۱۶۹

یہ بھول کھلیاں کے چکر میں ڈال دے گا۔

کاش ہمارے زمانہ کے وزراء اس واقعہ سے سبق حاصل کرتے، اور مفلس اور مصیبت زدہ پر اپنے دست خاص سے رحم و کرم کی بارش کرتے، اور ان کے زخم پر مرہم رکھنے کی کوشش کرتے، مگر آہ ع ایں خیال است و محال است و جنوں ۔

افضل کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ

"افضل جب اسکندریہ گیا تو اس نے اس یہودی کو گرفتار کیا، جو اسے ہمیشہ سب و شتم کرتا تھا، یہودی ڈر کر کہنے لگا، میرے پاس پانچ لاکھ درہم ہیں، انھیں لے لیجئے اور مجھے چھوڑ دیجئے، افضل نے جواب دیا لوگ کہیں گے میں نے دینار کے لالچ میں تجھے قتل کر دیا، اس لئے چھوڑتا ہوں، ورنہ کبھی نہ چھوڑتا"[1]

اب یہ پاکیزہ نفسی کہاں ہے؟ اہتمام سے اتنا ڈرنا اب کہاں باقی رہا، آج کل کوئی وزیر ہوتا تو شاید چپکے سے معاملہ کر لیتا اور اپنی جیبیں بھر لیتا۔

حضرت فاروق اعظمؓ کا معمول تھا کہ جب کسی کو گورنر بنا کر روانہ کرتے تو کچھ دور خود ساتھ جاتے اور یہ نصیحت کر کے واپس ہوتے،

"میں نے گورنر اس لئے مقرر کیا ہے کہ تم لوگوں میں نماز قایم کرو، ان کے حقوق ادا کرو، ان میں عدل و انصاف کرو، دیکھو عربوں کو درّے نہ مارنا، ...... انھیں نظر بند نہ کرنا"

اب مسلمانوں میں احساس کہاں رہا، کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے، اور ہماری کیا ذمہ داری ہے، اب تو اگر کسی کو گورنر بنانا ہوا تو خود اس کے سامنے اس کی تعریف کے پل باندھ دئے گئے،

خلیفہ عبدالملک بن مروان بنو امیہ کا بڑا مشہور خلیفہ گذرا ہے، اس کے متعلق مؤرخین کا بیان ہے۔

"عبدالملک رشوت سے سخت جلتا تھا، اور اس کے انسداد میں اس نے کوئی کسر نہیں

---

[1] نظم مملکت صفحہ ۱۷۵

اظہار کھی تھی، اگر کسی گورنر یا حاکم کے بارے میں اسے رشوت ستانی کا علم ہو جاتا تھا تو اسے کبھی نہیں بخشتا تھا۔[1]

بتایا جائے اب یہ خوبیاں ہمارے افسروں میں باقی رہیں؟ اب تو اگر کوئی برائی حکام میں نظر آئے گی تو اوپر والے پردہ ڈالنے کی کوشش کریں گے اس کی قرار واقعی سزا تو خواب و خیال سے زیادہ نہیں، اور یہ اس وجہ سے کہ اوپر سے نیچے تک کوئی بھی غرض سے پاک نہیں، جو ایک دو ایسے ہیں ان کی چلتی نہیں،

مورخین کا یہ بیان بھی ملاحظہ فرمائیے

"حکومت عثمانیہ کی طرح عباسیوں کے ہاں بھی حکومت کے تمام چھوٹے بڑے عہدے مسلمانوں یہودیوں اور عیسائیوں کو بلا کسی تفریق و امتیاز کے دئے جاتے تھے"[2]

پھر بھی شکوہ کیا جائے گا کہ مسلمانوں نے رواداری سے کام نہ لیا، حق ہے کہ مسلمانی حکومتوں نے عدل و انصاف میں مذہب و ملت کی کبھی تفریق نہیں کی حکومت کی نظر میں تمام رعایا کو برابر کا درجہ دیا گیا۔

قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) امام ابو یوسف رحمہ نے ہارون رشید کو ایک خط میں لکھا

"آپ کا فرض ہے کہ ذمیوں سے رواداری برتیں ..... ان کی ضرورتوں سے بے خبر نہ رہئے ان پر جبر و جور اور زیادتی نہ ہونے پائے، جزیہ کے علاوہ اوران کا مال نہ لیا جائے، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے ان آخری الفاظ سے ناواقف نہ ہوں گے ذمیوں سے بھلائی کرنا، ان سے رواداری برتنا، انھیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دینا"[3]

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمانی حکومتوں میں غیر مذاہب والوں کا کتنا لحاظ رکھا جاتا تھا، ان کی دل دہی، حوصلہ افزائی اور ان کے ساتھ رواداری کا کیسا عمدہ برتاؤ رکھا جاتا تھا اب تو ہمارے زمانہ میں لوگ سب سے زیادہ اپنی حکومت میں اسی کو ستاتے ہیں، جو لوگ

---

[1] نظم مملکت صفحہ ۲ [2] ایضاً صفحہ ۲۰۱ [3] ایضاً صفحہ ۲۷

اقلیت میں ہیں اور ہر طرح ہنستے اور کمزور ہیں اور اسی کو بہادری سمجھتے ہیں،

عبد الملک بن مروان کے متعلق بیان ہے

"اس نے اپنے غیر معمولی سیاسی تدبر سے ٹیکس کا نظام نہایت بلند معیار پر پہنچا دیا تھا، اور ٹیکس کے افسران کو ایک پائی بھی غبن کرنے کی جرآت نہ ہو سکتی تھی، وہ نہایت سختی سے اس کا محاسبہ کیا کرتا تھا، رشوت خور، اور بد دیانت افسروں کو معزول کر کے انھیں لرزہ خیز سزائیں دیتا تھا اور ان سے ایک ایک حبہ اگلوا لیتا تھا"[1]

فرمائیے ہمارے اس دور میں یہ اہتمام، اور افسروں کا یہ محاسبہ باقی رہا، رشوت کا بازار جتنا گرم ہے وہ کسی سے بھی مخفی نہیں، کھلے عام رشوت کا کاروبار ہوتا رہتا ہے، مگر چونکہ کوئی بھی پاک نہیں اس لئے روک تھام کون کرے؟ مرکزی وزرار کو اپنے کاموں اور بیانوں سے چھٹی نہیں، یہ بیچارے تو گروپ بندی اور پارٹی بازی کی لعنت میں اس طرح مبتلا ہیں کہ الامان الحفیظ،

دور عباسی میں خشک سالی اور قحط کے زمانہ میں ٹیکس میں تخفیف کر دی جاتی تھی لکھا ہے۔

"معتضد کے زمانہ میں جب الم انگیز قحط پڑا تو لگان کا ⅓ معاف کر دیا گیا، اور ادا کرنے کے لئے ۱۷ر جنوری سے ۱۵ر مارچ تک مہلت دے دی گئی تھی، . . . . پھر اس میعاد کو ۲۱ر جولائی تک بڑھا دیا گیا تھا،

اب رعایتیں عنقا ہیں، اب تو ہر سال نیا ٹیکس عاید کیا جاتا ہے، جب سے آزاد بھارت کی حکومت ہے، اللہ کے فضل سے کوئی سال نئے ٹیکس سے خالی نہیں، اب تو کوئی چیز ٹیکس سے محفوظ ہی نہیں، پھر بھی حکومت کا بجٹ خسارہ کا ہی بنتا ہے، خدا کرے ہمارے دیش کے وزرار کا پیٹ جلد بھر جائے، اور ملک خوش حالی کی طرف قدم بڑھائے

---

[1] نظم مملکت ص۲۷۶

حالات حاضرہ

سیاسی حالات و واقعات پر تبصرہ

از

(جناب اسرار احمد صاحب آزاد ایڈیٹر جدوجہد)

پاکستان اور افغانستان کا وفاق

بعض اوقات بہت معمولی باتیں بڑے بڑے واقعات کا پیش خیمہ اور اہم ترین نتائج کی حامل ثابت ہوتی ہیں۔ گذشتہ ماہ اخبارات میں ایک چھوٹی اطلاع شائع ہوئی تھی جس کا مفہوم یہ تھا کہ ــــــ پاکستان اور افغانستان کی حکومتوں کے مابین ان دونوں ممالک کا ایک وفاق بنانے کے مسئلہ پر گفت و شنید ہو رہی ہے اور اگرچہ چند روز کے بعد ہی اس خبر کی تردید بھی ہو گئی تھی اور سفیر افغانستان مامور کراچی نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ ــــــ مسئلہ پختونستان کے تصفیہ کے بغیر پاکستان اور افغانستان کے مابین حقیقی دوستی کا قیام ممکن نہیں ہو سکتا مگر پاکستان کے بعض ذمہ دار جرائد کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ــــــ کراچی اور کابل کے مابین معتمد و ممتاز مدبرین کی آمد و رفت جاری ہے اور دونوں ملکوں کے درمیان کسی اہم مسئلہ پر گفت و شنید ہو رہی ہے بظاہر، مذکورہ بالا اطلاع ایک غیر اہم اطلاع تھی اور اب بیشتر اخبار بین حضرات اسے فراموش بھی کر چکے ہوں گے لیکن اگر اسے حالات حاضرہ کے دائرہ میں داخل کر کے اس پر غور کیا جائے تو نہ صرف اس کی اہمیت ہی واضح ہو جاتی ہے بلکہ یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ یہ خبر بالکل بے بنیاد نہیں ہے پاکستان اور امریکہ کے حالیہ معاہدہ کو کسی زاویۂ نظر سے کیوں نہ دیکھا جائے لیکن اب وہ ایک حقیقت ثابتہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اگر ہندو پاکستان کے تعلقات کے زاویۂ نظر سے اس کے خوشگوار ردعمل کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس معاہدہ کا مقصد

ایشیا کے اس خطہ میں ان قوتوں کا استحکام ضرور ہے جو آج سوویٹ یونین کی سرکوبی کو اپنا اہم ترین فریضہ تصور کرتی ہیں اور جو اپنے اس عقیدہ کو چھپانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتیں۔

دوسرے الفاظ میں اس طرح کہنا اور سمجھنا چاہئیے کہ آج ہمارا ہم سایہ ملک پاکستان براہ راست اس کے گروہ میں شامل ہو چکا ہے جو ہر قیمت پر اپنے حریف گروہ کو ہراساں کرنا، کمزور رکھنا اور موقع ملنے پر اس کا قلع قمع کر دینا چاہتا ہے اور ظاہر ہے کہ اجتماعی زندگی کے ضوابط کے مطابق اب امور داخلہ و خارجہ میں پاکستان جو قدم بھی اٹھائے گا وہ اجتماعی مقصد براری کے تصور سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اور انھیں تشریحات کی روشنی میں ہمیں مذکورہ بالا چھوٹی سی خبر کا تجزیہ بھی کرنا چاہیے۔

یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ افغانستان، سوویٹ یونین کی سرحد پر واقع ہے اور اس طرح سوویٹ یونین کو محصور کرنے کے عسکری منصوبہ میں ایشیا کے اس چھوٹے سے ملک کو برصغیر ہند کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اہمیت حاصل ہے اور اگر کسی نہ کسی طرح اس ملک کو اس گروہ کے ساتھ وابستہ کیا جا سکا جس کے ساتھ پاکستان وابستہ ہو چکا ہے تو پھر اس گروہ کے ارباب حل و عقد اس ملک کو بھی اپنے مذکورہ بالا عسکری منصوبہ کی تکمیل کے لئے استعمال کر سکیں گے افغانستان کو امریکی گروہ میں شامل کرنے کی ایک صورت تو یہ تھی کہ امریکہ براہ راست افغانستان کو اپنے گروہ میں شمولیت کی دعوت دیتا لیکن اس صورت میں یہ حقیقت زیادہ واضح ہو جاتی کہ امریکہ سوویٹ یونین کو محصور اور اس کے خلاف جنگ برپا کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے اور جو لوگ اب تک اس حقیقت کو نظر انداز کرتے رہے ہیں وہ بھی اس کے اعتراف پر مجبور ہو جاتے اور اس طرح امریکہ کے رو بہ زوال اخلاقی اثر پر ایک اور کاری ضرب پڑتی اس لئے فی الحال وہ اس معاملہ میں براہ راست حصہ لینے پر آمادہ نہیں ہو سکتا تھا اور دوسری صورت وہی ہے جو اس نے اختیار کی ہے۔ اس صورت کے مطابق دو ہم مذہب ممالک کے سیاسی اور انتظامی اتحاد پر بظاہر کسی کو کوئی اعتراض

بھی نہیں ہو سکتا، اس کے برعکس مسلمانانِ عالم کو مسلمانوں کی دو ریاستوں کے اتحاد کے فریب میں مبتلا کر کے ان کی اخلاقی حمایت اور اعانت حاصل کی جا سکتی ہے اور پھر اس مجوزہ وفاق میں بالادستی اور برتری پاکستان ہی کو حاصل ہو گی اس لئے وہ امریکہ اور پاکستان کے حالیہ معاہدہ یا مستقبل میں ہونے والے معاہدات کے اثرات سے بھی متاثر ہو سکے گا

مختصر یہ کہ ان سطور کے آغاز میں میں نے جس چھوٹی سی خبر کا ذکر کیا ہے اس کی تردید کے باوجود اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور اگر مستقبل میں یہ خبر من وعن صحیح ثابت نہ بھی ہوئی تو یہ کسی دوسری شکل میں منظرِ عام پر ضرور آئے گی۔

کانفرنسیں اور کنونشن

اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ بین اقوامی تعلقات روز بروز کشیدہ تر ہوتے جا رہے ہیں اور آج دنیا کے سامنے اہم ترین سوال یہ ہے کہ اس کشیدگی کو کم کرنے اور اس کے نتیجہ میں برپا ہونے والی متوقع عالم گیر جنگ کو روکنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں؟

اس سلسلہ میں جنوبی مشرقی ایشیا کے پانچ ملکوں — ہند، پاکستان، انڈونیشیا برما اور سیلون — کے وزرائے اعظم کی ایک کانفرنس کولمبو اور کانڈی میں منعقد ہوئی تھی، "پاکستان اور امریکہ کے فوجی معاہدہ کے خلاف نیز بین اقوامی کشیدگی کو کم کرنے سے متعلق "نیشنل کنونشن" کے نام سے ایک اجتماع دہلی میں منعقد کیا گیا تھا اور ایک کانفرنس جنیوا میں ہو رہی ہے۔

دنیا کی ہر بات اسباب و علل پر مبنی ہوا کرتی ہے اور عہدِ حاضر کی بین اقوامی کشیدگی جن اسباب و علل پر مبنی ہے انھیں مختصراً اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ — دنیا کی چند بڑی طاقتیں موجودہ جمہوری دور کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے صدیوں پہلے کے اس نظامِ سیاست و معاشرت کو برقرار رکھنا چاہتی ہیں جسے آج کی سیاسی اصطلاح میں، نوآبادیاتی یا نیم نوآبادیاتی نظام کہا جاتا ہے اور جس کی بنیاد استحصال بالجبر پر قائم ہے،

لیکن عوام اس ظالمانہ نظام ریاست و معاشرہ سے تنگ آگئے ہیں وہ دنیا کے ہر گوشہ میں اس نظام کے خلاف صف بستہ ہو کر جد وجہد کر رہے ہیں اور ان کی اس جد وجہد کو ان کی اشتراکیت پسندی اور اشتراکیت دوستی سے تعبیر کر کے عہد حاضر کی تمام تر تباہ کن قوتوں کو ان کے مقابلہ میں جمع کیا جا رہا ہے۔

دوسرے الفاظ میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ـــــ اگر نو آبادیات خواہ طاقتیں عہد حاضر کے جمہوری تقاضوں کو سمجھ کر اپنے اس مستعمرانہ نظریہ کو تبدیل کر دیں کمزور قوموں کی آزادی کو تسلیم کر لیں انھیں ان کے نظام ریاست و معاشرہ کے انتخاب میں آزاد چھوڑ دیں اور ہر قوم کو اقوام عالم کی صف میں اس کا جائز اور صحیح مقام دے دیا جائے تو بین اقوامی کشیدگی دور ہو سکتی ہے اور مستقبل میں جنگ کا کوئی امکان باقی نہیں رہ سکتا۔

جنوبی مشرقی ایشیا کے وزراء اعظم نے کولمبو کانفرنس میں حالات حاضرہ کا تجزیہ اسی زاویہ نظر سے کیا ہے اور اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ ایک جانب تو مغربی مستعمرین کو ایشیائی ممالک میں اپنی مستعمرانہ حکمت عملی سے دست بردار ہو جانا چاہئے اور دوسری طرف اس خطۂ ارض کے سیاسی اختلافات کو دور نیز معاشی مسائل کو حل کرنے کے لئے اسی خطۂ ارض کے رہنماؤں کو باہم گفت و شنید کرنی چاہئے اس کے علاوہ اس کانفرنس نے ہائڈروجن بم اور دوسرے تباہ کن اسلحہ کے ۔ ۔ ۔ تجربات اور استعمال کو ملتوی کر دینے اور عوامی چین کی حکومت کو ادارہ اقوام متحدہ میں اس کا جائز مقام دیئے جانے کے جو مطالبات کئے ہیں وہ بجائے خود موجودہ بین اقوامی کشیدگی کو دور کرنے کی ضمانت کی حیثیت رکھتے ہیں اور دہلی میں جو سہ روزہ کنونشن منعقد ہو چکا ہے اس کا مقصد بھی موجودہ بین اقوامی کشیدگی کو دور اور بقاء امن کی مساعی کو تقویت پہنچانے کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

یہاں اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہئے کہ کولمبو کانفرنس اور دہلی کنونشن کو قومی اور بین اقوامی زاویہ نظر سے کتنی ہی اہمیت کیوں نہ دی جائے لیکن ان اجتماعات میں جتنی

قرار دادیں منظور کی گئی ہیں جنیوا کانفرنس کی کارروائیوں کے مقابلہ میں ان کی حیثیت سفارشات سے زیادہ نہیں اور اگرچہ جنیوا کانفرنس کے انعقاد کا منشا جنوبی مشرقی ایشیا کے اہم ترین مسائل کو حل کرنا ہے لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر جنیوا کانفرنس ان مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہو سکی تو اس سے دوسرے بین اقوامی تنازعات کے حل ہونے میں بہت زیادہ سہولتیں پیدا ہو جائیں گی اور اگر جنیوا کانفرنس نے کم از کم کولمبو کانفرنس کے فیصلوں کی حقیقی روح کو سمجھنے اور ان فیصلوں کے بین سطور جنوبی مشرقی ایشیا کے عوام کے حقیقی رجحانات کو سمجھنے کی کوشش کی تو اسے ان مسائل کے حل کرنے میں کوئی ایسی دشواری پیش نہ آئے گی جس پر قابو نہ پایا جا سکے۔

کولمبو کانفرنس کے فیصلوں اور جنیوا کانفرنس کے تعلق کے سلسلہ میں یہ بات بھی عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتی ہے کہ جنیوا کانفرنس کو ناکامیاب بنانے کی خواہ کتنی ہی کوششیں کیوں نہ کی جا رہی ہوں لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کولمبو کانفرنس کے بعد ایک جانب تو برطانیہ کے لئے ۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکمت عملی کی پوری پوری تائید اور حمایت ممکن نہیں ہو سکتی اور دوسرے خود امریکہ بھی کولمبو کانفرنس کے فیصلوں کو آسانی کے ساتھ نظر انداز نہیں کر سکتا اور اس طرح جنیوا کانفرنس کی فضا میں اعتدال کا پیدا ہو جانا لازمی امر ہے۔

بہر حال آج ... مستقبل کی تمام تر توقعات جنیوا کانفرنس کے ساتھ وابستہ ہو کر رہ گئی ہیں اور اگر یہ کانفرنس حصول مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی تو جنگ اور تصادم کے امکانات قوی تر ہو جائیں گے۔

التقریظ والانتقاد

عورت اور اسلامی تعلیم

(جناب مولانا ابو سلمہ شفیع احمد البہاری)

(۲)

پھر شاید کاتب کی غلطی سے "د" چھوٹ گیا ہے قرآن پاک میں ولیس الذکر کالانثیٰ ہے

(۳) تعلیم و تربیت کے باب میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے وہ اصولاً صحیح ہے مگر استنباط صحیح نہیں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ

"اگر قرآن نے لڑکیوں کے قتل کی اس قدر مذمت کی اور عربوں کو اس برے کام کے ارتکاب سے روکا تو وہ ان کے بقائے روحانی کو کیسے نظر انداز کر سکتا تھا بلکہ اس کی نظر میں تو یہ بھی قتل کے مرادف ہے فرماتا ہے

قد خسر الذین قتلوا اولادھم سفھاً بغیر علم

یقیناً وہ لوگ سخت نقصان اٹھانے والے ہیں جنہوں نے اپنی اولاد کو اپنی حماقت سے جاہل اور بے علم رہ کر ہلاک کیا (ص ۹و ۱۱۵)

آیت کا تعلق علم سے قطعاً نہیں ہے صحیح ترجمہ یوں ہوگا

بے شک خراب ہوئے جنہوں نے قتل کیا اپنی اولاد کو نادانی سے بغیر سمجھے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ

قرآن نے جہاں ان یتامی کی تربیت کا ذکر کیا ہے جو دوسروں کی ولایت میں ہیں وہیں یہ تاکید بھی کی ہے کہ۔

وارزقوھم وا کسوھم وقولوا لھم قولاً معروفا — تم انھیں ان کے مال سے (اچھا) کھانے کو دو (اچھا) پہننے کو دو اور انھیں نیک اور اچھی باتیں سکھاؤ

یہاں قولوا لھم قولاً معروفا کا ترجمہ غلط ہے صحیح ترجمہ یہ ہے کہ تم ان سے اچھی باتیں کہو پھر ابن ماجہ کی مشہور حدیث "طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ کو پیش کیا گیا ہے "مسلمۃ" کا لفظ محدثین کے نزدیک غیر محفوظ ہے

قال السخاوی فی المقاصد الحق بعض المصنفین باخر ھذا الحدیث "ومسلمۃ" ولیس لھا ذکر فی شئ من طرقہ وان کانت صحیحۃ المعنی (حاشیہ سندی علی ابن ماجہ ص ۹۹) — سخاوی نے مقاصد میں کہا ہے کہ اس حدیث کے آخر میں بعض مصنفوں نے "ومسلمۃ" کا لفظ بڑھا دیا ہے حالانکہ اس حدیث کے کسی طریق اسناد میں اس کا ذکر نہیں ہے اگرچہ معنی کے اعتبار سے یہ صحیح ہے

اگر لائق مصنف قرآن وحدیث کے عمومات سے استدلال کرتے تو بات زیادہ واضح ہو جاتی اور اس طرح کی آیتیں مل جاتیں مثلاً ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون و خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ (الحدیث)

صفحہ ۱۸۱ پر لکھتے ہیں

زردشتی مذہب کے پیرو خیر اور شر کے دو خداؤں یزداں اور اہرمن کو مانتے ہیں عیسائی (اور ان کے تتبع میں بعض مسلمان بھی) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بعض صفات خداوندی مثلاً احیاء موتی، خلق وغیرہ سے متصف کرتے ہیں

مصنف نے قوسین کے ذریعہ خواہ مخواہ زردشتیوں اور عیسائیوں کے ساتھ بعض مسلمانوں کو بھی گھسیٹ لیا ہے ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان کے تتبع میں نہیں بلکہ قرآن حکیم کے اتباع میں بعض مسلمان ہی نہیں بلکہ جمہور مسلمان حضرت عیسیٰؑ کی نسبت احیاء موتی، خلق طیر، ابراء

اکمہ ابرص باذن اللہ کے قائل ہیں چنانچہ خود قرآن میں ہے

واذ تخلق من الطین کھیئۃ الطیر

باذنی فتنفخ فیہا فتکون طیرا باذنی

وتبرئ الاکمہ والابرص باذنی

واذ تخرج الموتی باذنی

(پارہ ۷، رکوع ۴ آیت ۲)

(۵) مہر کے متعلق مؤلف کا ذہن صاف نہیں ہے چنانچہ لکھتے ہیں۔

مہر وہ رقم یا چیز ہے جو مرد اپنی منکوحہ کو بلا کسی معاوضہ کے بطور ہدیہ دیتا ہے (ص ۹۲)

مہر ایک حق ہے جو نکاح کے ساتھ ہی بیوی کو ادا کیا جاتا ہے (ص ۱۰۴)

واتوا النساء صدقتھن نحلہ — اور عورتوں کے مہر خوش دلی سے بلا کسی معاوضہ کے انھیں دے دو (ص ۹۳)

اسلام میں نکاح عقد معاوضہ مثل بیع کے ہے ایک جانب سے مہر دوسری جانب سے تمتع

واحل لکم ماوراء ذلکم ان تبتغوا باموالکم — اور اس کے علاوہ تمہارے لئے حلال کر دیا گیا ہے کہ تم اپنے اموال کے بدلہ میں چاہو

یہاں احلال کو ابتغاء اموال کے ساتھ مقید کر دیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ عقد کے وقت اگر نفی مہر کی شرط لگا دی تو امام مالکؒ کے نزدیک صحیح نہیں ہوگا۔

لانہ عقد معاوضۃ ملک متعۃ بملک مھر فیفسد بشرط نفی عوضہ کالبیع بشرط ان لا ثمن (عنایہ علی الہدایہ باب المہر)

آیت میں "نحلۃ" مصدر ہو یا حال جیسا کہ مصنف نے خود لکھا ہے بہر حال یہ ایک "قرض" ہے جو مرد کو ادا کرنا پڑے گا اور اگر وہ اسے ادا کرنے سے پہلے وفات پا جائے تو تقسیم جائداد سے پہلے دوسرے قرضوں کی طرح یہ بھی ادا کرنا پڑے گا (ص ۹۵)

(۶) "طلاق کی قسمیں" اور "حلالہ" کے زیر عنوان جو کچھ لکھا ہے وہ اس قدر پیچیدہ ہے کہ اس سے مسئلہ صاف نہیں ہوتا۔ لکھتے ہیں:۔

"مگر بعض لوگوں نے اس سے (طلاق) عجیب و غریب استنباط کیا ہے انھوں نے طلاق کی تین قسمیں بیان کی ہیں احسن، حسن، بائن (ص ۱۴۸)

جو لوگ ایک ہی مجلس میں طلاقوں کو طلاق بائن قرار دیتے تھے انھوں نے اس کے نتائج سے بچنے کے لئے حلالہ کی راہ نکالی (ص ۱۵۰)

اس کے ساتھ ہی مصنف یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ

(۱) طلقہ ثالثہ کے بعد رجوع بغیر حلالہ جائز ہے

(۲) حلالہ جاہلیت کی رسم تھی جسے اسلام نے منسوخ کیا

اول تو گذارش یہ ہے کہ احسن حسن کے ساتھ بدعی کا جوڑ زیادہ صحیح ہے نیز طلاق کی تین قسمیں اور ہیں رجعی، بائن، مغلظ طلاق مغلظہ کے لئے حلالہ شرط ہے اور یہ خود قرآن کا حکم ہے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی کے مطابق امر فرمایا ہے ائمہ متبوعین کا بھی یہی مسلک ہے البتہ اس میں اختلاف ہے کہ اگر ایک شخص ایک نشست میں تین مرتبہ طلاق کہہ کے اسے مکمل کر دیتا ہے تو یہ ایک طلاق ہوگی یا تین؟ قرآن حکیم نے طلاق کا ذکر اس ترتیب سے کیا ہے کہ

"الطلاق مرّتان فامساک بمعروف او تسریح باحسان اس سے دو طلاق اور اس کا حکم پھر ولا یحل سے اولئک ھم الظالمون تک خلع کا ذکر پھر فان طلقھا سے طلقہ ثالثہ کا حکم بیان فرمایا قاضی بیضاوی لکھتے ہیں کہ ویحتمل ان یفسر النکاح بالاصابۃ ویکون العقد مستفادا من لفظ الزوج امام بخاری رض نے ترجمۃ الباب ہی قایم کیا ہے اذا طلقھا ثلاثا ثم تزوجت بعد العدۃ زوجا غیرہ فلم یمسھا اور اس کے ماتحت حضرت رفاعہ والی مشہور حدیث لاتے ہیں جس میں آپ نے فرمایا کہ فقال لا

حتی تذوقی عسیلۃ ویذوق عسیلتک اسی بنا پر جمہور امت کا مسلک ہے کہ واتفق الجمہور علی انہ لابد من الاصابۃ ۔ قرآن و حدیث دونوں سے ایک ہی چیز ثابت ہو رہی ہے فالایۃ مطلقۃ قیدتہا السنۃ ۔ اور اس میں حکمت یہ ہے کہ والحکمۃ فی ھذا الحکم الردع عن التسرع الی الطلاق والعود الی المطلقۃ ثلاثا والرغبۃ فیہا (بیضاوی)

اسی طرح فاذا بلغن اجلھن کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا کہ جب عدت ختم ہونے کو آئی ای قرب انقضاء عدتھن للاجماع علی ان لا رجعۃ بعد الانقضاء (فتح القدیر ص ۱۶۰ ج ۳)

ادبیات

قند پارسی

(جناب الم مظفر نگری)

بگذر از سینۂ اغیار کہ تنگ است ہنوز
صلح در جنگ مپندار کہ جنگ است ہنوز

لخت لختِ جگرم چوں نہ رسد تا مژگاں
در خلیدن بہ جگر نوکِ خدنگ است ہنوز

وقتے آید کہ دلم در غمِ تو خوں گردد
بہ تقاضائے وفا رہن درنگ است ہنوز

ناخدا خطرہ در خطرہ بہ موجِ دریا
در تہِ حلقۂ گرداب نہنگ است ہنوز

دردِ عشقِ تو بگو من بکجائے بہ برم
عرصۂ عالمِ ہستی ہمہ تنگ است ہنوز

وقتِ پیری بدلم یادِ جوانی باقی است
در خزاں دیدہ چمن جلوۂ رنگ است ہنوز

رستگاری بہ حقیقت مرا حاصل نشدہ
دامنِ شوقِ الم در تہ سنگ است ہنوز

جنونِ حیات (غزل)

(جناب شمس نوید)

انساں جنوں ہے اور حدِ امکاں ہے زندگی
عصیاں کہاں ہے حسرتِ عصیاں ہے زندگی

پنہاں ہے زندگی نہ نمایاں ہے زندگی
یوں تیرے بس میں اے غمِ جاناں ہے زندگی

اے دوست اشک و آہ میں غلطاں ہے زندگی
خود جرم زندگی پہ پشیماں ہے زندگی

نغموں کی گونج، حسن کے خوابوں کی بازگشت
رومان کے بعد حاصلِ روماں ہے زندگی

اب تک ہمارے ساتھ ہیں یا عنی کے صبح و شام
کیسے کہیں کہ خوابِ گریزاں ہے زندگی

نظروں سے روح تک ہے پر اسرار سوز و ساز
اک داستانِ راز کا عنواں ہے زندگی

امید دور دور ہے، ہر خواب چور چور
کس ساز پر ہنوز غزل خواں ہے زندگی

بُرہان

جلد ۳۲ شمارہ ۶

جون ۱۹۵۴ء مطابق شوّال المکرم ۱۳۷۳ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

مدارس عربیہ کے لئے ایک لمحۂ فکر

(۱)

ہندوستان پر انگریزوں کے اقتدار سے پہلے ملک میں جو طریقہ تعلیم رائج تھا اور جس کے لئے جگہ جگہ مدارس کھلے ہوئے تھے اس میں نہ قدیم و جدید کی کوئی تفریق تھی اور نہ مولوی اور غیر مولوی کا کوئی جھگڑا تھا ملک کے تمام لوگ صرف دو ہی طبقوں پر منقسم تھے ایک تعلیم یافتہ اور دوسرا غیر تعلیم یافتہ! آج کل کی طرح یہ اندھیر نہیں تھا کہ تعلیم یافتہ ہونے پر بھی یہ بتانا پڑتا ہے کہ تعلیم یافتہ لوگوں کے کس طبقہ اور کس گروہ سے یعنی قدیم سے یا جدید سے تعلق رکھتا ہے، جس طرح آج جدید تعلیم یافتہ کے معنی بہت وسیع ہیں جس میں انجنیر، ماہر طبعیات، ڈاکٹر، وکیل غرض کہ سائنس اور آرٹ کے کسی شعبہ کے گریجویٹ سب تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں اور ان میں کوئی تفریق نہیں ہوتی ٹھیک اسی طرح مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں علوم دینیہ اور علوم و فنون غیر دینیہ سب کے جاننے والوں کو علماء کہتے تھے لیکن جس طرح مطلق تعلیم یافتہ ہونے کے بعد خاص خاص علوم و فنون میں کمال و مہارت کے اعتبار سے اس علم کی طرف نسبت کرکے ہر ایک کا جدا جدا نام ہوتا ہے مثلاً فلسفہ کے ماہر کو فلسفی (فلاسفر) منطق کے فاضل کو منطقی (لوجیشین) سائنس کے باکمال کو سائنٹسٹ کہتے ہیں اسی طرح زمانہ زیر بحث میں حدیث کے مبصر کو محدث، تفسیر کے فاضل کو مفسر، علم کلام کے ماہر کو متکلم اور تاریخ کے امام کو مؤرخ کہتے تھے۔

پھر جس طرح آج چند علوم و فنون ایسے ہیں جن کا جاننا ہر تعلیم یافتہ کے لئے ضروری

ہے اور وہ وہی مضامین ہیں جو سکنڈری ایجوکیشن تک پڑھائے جاتے ہیں اسی طرح اُس زمانہ میں چند علوم وفنون تھے جن کے بغیر کوئی شخص تعلیم یافتہ ہونے کی سند حاصل ہی نہیں کرسکتا تھا۔ ان علوم وفنون میں تاریخ، جغرافیہ۔ حساب۔ مادری زبان، ریاستی زبان، دینیات اور خطاطی شامل تھے،

غرض کہ انگریزوں کی حکومت سے پہلے ہمارے جو مدارسِ عربیہ تھے وہ آج کل کی یونیورسٹیوں اور کالجوں سے کسی طرح کم نہ تھے ان مدارس میں تعلیم کا مقصد جس طرح دینی ہوتا تھا علمی بھی ہوتا تھا اور دنیوی بھی ہوسکتا تھا جس طرح انگلینڈ کی پرانی یونیورسٹیوں میں غیر مذہبی علوم کے ساتھ مذہبی علوم (Divinity) کا بھی شعبہ ہوتا تھا جس کے باعث جس شخص کو پادری یا بشپ کی حیثیت سے مذہبی زندگی بسر کرنی پڑتی تھی تو اسے بھی اسی یونیورسٹی سے سندِ تکمیل وفراغت حاصل کرنی ہوتی تھی، اسی طرح ہمارے مدارس میں علومِ دینیہ کے ساتھ وقت کے مروجہ علوم غیر دینیہ بھی پڑھائے جاتے تھے اور جس طرح آج خاص خاص علوم وفنون میں مہارت وکمال پیدا کرنے کے لئے یورپ وامریکہ کے دور دراز ملکوں میں خاص خاص ادارے اور یونیورسٹیاں ہیں جس کو جس کسی خاص علم یا فن میں کمال حاصل کرنا ہوتا ہے وہ وہاں کا سفر کرتا ہے اسی طرح اسلامی عہد میں ایک ایک فن اور علم کا امام خود مستقل ایک ادارہ اور درسگاہ ہوتا تھا اس علم کے مشتاق طلبا، دور دراز کے ملکوں سے سفر کی صعوبت ومشقت برداشت کرکے وہاں پہنچتے تھے اور علم وتحقیق کی تشنگی بجھاتے تھے۔

ان مدارس کے فارغ التحصیل طلبار میں جہاں بعض محدث، مفسر، فقیہ اور مفتی ہوتے تھے، بعض مورخ، فلسفی، ماہرِ طبعیات، طبیب اور ماہرِ ریاضیات بھی ہوتے تھے ان میں سے بعض درس وتدریس اور فقہ وافتا کے مسند کی رونق بنتے تھے تو انھیں میں کچھ ہوتے تھے جو امارت ووزارت اور حکومت کے دوسرے شعبوں کی ذمہ داری

اٹھاتے تھے، پھر شاعر، ادیب اور مصنف بھی انھیں میں سے اٹھتے تھے اور مبلغ و خطیب اور کاتب بھی انھیں میں ہوتے تھے یہی وجہ ہے کہ ہندو بھی ان مدارس میں مسلمانوں کے ساتھ تعلیم پاتے تھے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ مدارسِ عربیہ کا مقصد وجود صرف دینی نہیں بلکہ علمی بھی ہوتا تھا اور حکومت کی ملازمت اور عہدے وغیرہ بھی انھیں مدارس میں تعلیم پانے کے بعد حاصل ہوتے تھے۔

اس موقع پر تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں سر رادھا کرشن یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ کا ایک اقتباس ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں اس سے ہمارا مقصد اور واضح ہو گا

"پھر جب مسلمانوں کی حکومت قایم ہوئی تو انھوں نے ہندوستان میں علوم و فنون کی نشر و اشاعت اور ان کے درس و تعلیم کے لئے مدارس (جو اس زمانہ کے کالج تھے) مختلف شہروں مثلاً لاہور۔ دہلی۔ رام پور۔ لکھنؤ۔ الہ آباد۔ جونپور۔ اجمیر اور بیدر وغیرہ میں کھولے، شیر شاہ جو بعد میں ہندوستان کا شہنشاہ بن گیا اس نے جونپور کے مدرسہ میں ہی تعلیم پائی تھی اور وہاں اس نے جو مضامین پڑھے تھے ان میں تاریخ، فلسفہ، عربی اور فارسی ادب بھی شامل تھے ان مدارس کا نصاب یورپ کی تعلیم گاہوں کے متوازی اور مساوی ہوتا تھا اور اس نصاب میں صرف و نحو۔ معانی و بلاغت۔ منطق۔ قانون۔ علم ہندسہ، فلسفہ علم نجوم۔ جنرل سائنس۔ مابعد الطبعیات۔ دینیات۔ یہ سب مضامین شامل ہوتے تھے علاوہ بریں شعر و شاعری تو ایک ایسا مضمون تھا جس سے ہر ایک ہی دلچسپی لیتا تھا۔

ان عام مدارس کے علاوہ ملک کے مختلف گوشوں میں بعض خاص مدارس تھے جہاں خاص خاص علوم و فنون کی تعلیم دی جاتی تھی اور وہ مدارس ان علوم کا مرکز سمجھے جاتے تھے مثلاً رام پور کا مدرسہ منطق اور طب کے لئے مشہور تھا لکھنؤ کی شہرت دینی علوم و فنون کے لئے تھی اور لاہور علم نجوم اور ریاضیات میں نامور و مشہور تھا ان مدارس میں ذریعۂ تعلیم عربی زبان تھی اور ان میں تعلیم کی خدمت جن لوگوں کے سپرد ہوتی تھی ان میں بعض بڑے

بڑے نامور علماء ماہرین علوم و فنون ہوتے تھے (جلد اول ص ۸)

برطانوی راج کے قایم ہو جانے کے بعد مدارسِ عربیہ کے نظام میں یہ ہمہ گیری نہیں رہ سکی اور ان کا شیرازہ پراگندہ ہو گیا اس کا اثر مسلمانوں کی اقتصادی حالت پر بھی پڑا کیونکہ تعلیم نہ پا سکنے کی وجہ سے وہ حکومت کے صیغوں میں کوئی عہدہ نہیں لے سکتے تھے۔

وارن ہیسٹنگز نے جو ہندوستان کا پہلا گورنر جنرل تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر کلکتہ میں "کلکتہ مدرسہ" کے نام سے ایک مدرسہ قایم کیا جس کا سنگِ بنیاد ۱۷۸۰ء میں رکھا گیا تھا۔ اس کلکتہ مدرسہ کی غرض تاسیس کیا تھی؟ اسے خود مذکورۂ بالا یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ کی زبان سے سنیے:-

"اپنی حکومت کے قیام کے بعد اہل برطانیہ نے سوچا کہ اب یہاں کے لوگوں کو تعلیم یافتہ بنانے کے لئے کچھ کرنا چاہئے چنانچہ وارن ہیسٹنگز نے ایک شاندار کارنامہ یہ کیا کہ کلکتہ مدرسہ قایم کیا جس کا مقصد (خود وارن ہیسٹنگز کے لفظوں میں) یہ تھا کہ مسلمان شرفا کے بچے تعلیم یافتہ ہو کر حکومت کے ذمہ دار اور بیش قرار تنخواہوں والے عہدوں پر سرفراز ہو سکیں چنانچہ مسلمانوں کے عہدِ حکومت کے مدارس میں جو جامع اور ہمہ گیر نصاب پڑھایا جاتا تھا وہی نصاب کلکتہ مدرسہ میں رائج کیا گیا یہ نصاب علوم دینیہ اور غیر علوم دینیہ سب پر مشتمل تھا" (جلد اول ص ۸)

قومی مدارس کا قیام

لیکن اس عہد میں مسلمانوں کے جو قومی مدارسِ عربیہ قایم ہوئے اور ان میں سبقت و تقدم کا سہرا دار العلوم دیوبند کے سر ہے وہ اپنے نظامِ تعلیم کو پہلے زمانہ کے مدارس کی طرح زیادہ وسیع اور ہمہ گیر نہیں بنا سکے اور ادھر انگریزی اسکولوں اور کالجوں کے قیام کی وجہ سے ایک تعلیم جدید کا آغاز ہو گیا اس کا نتیجہ لازمی طور پر یہی ہونا تھا کہ تعلیم یافتہ گروہ دو حصوں میں بٹ گیا اور یہ دونوں طبقے ایک دوسرے کے حلیف نہیں بلکہ حریف بن گئے۔

مدارسِ عربیہ کا نظامِ عمل صرف دینی اغراض تک محدود ہو کر رہ گیا اور حق یہ ہے کہ اس کے اسباب طبعی اور قدرتی ہیں جن کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

ہندوستان میں برطانوی راج کے پاؤں جم جانے کے بعد بعض دور اندیش اور درد مند علما نے محسوس کیا کہ اس انقلاب کا سب سے بُرا اثر مسلمانوں کے دین اور مذہب پر پڑ سکتا ہے۔ اب نئی حکومت کے ماتحت نئی زبان اور نئے علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کا سر و سامان کیا جائے گا۔ اس بنا پر اگر اس وقت مسلمانوں کے دین کو محفوظ رکھنے کی کوشش نہ کی گئی تو اس کا نتیجہ ارتداد کی شکل میں ظاہر ہو سکتا ہے اس خطرہ کے انسداد کے لئے ان علما نے مدارس کا اجرا کیا اور پہلے دیوبند اور مراد آباد میں اور اس کے بعد دوسرے شہروں اور قصبوں میں مدارس کا ایک طویل سلسلہ قایم کر دیا۔

جہاں تک مدارسِ عربیہ کے قیام و تاسیس کے اس مقصد کا تعلق ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ مقصد باحسن وجوہ حاصل ہو گیا اور علمائے کرام کی مساعی بار آور ہو کر رہیں۔ چنانچہ ان مدارسِ عربیہ کا ہی یہ اثر ہے کہ آج ہندوستان کے مسلمانوں میں بحیثیت مجموعی جو دینداری۔ خدا پرستی، مذہب سے لگاؤ، اسلامی روایات و کلچر کا احترام پایا جاتا ہے وہ خود حجاز کے لوگوں میں نہیں ہے۔ عراق، شام اور مصر و فلسطین کا تو ذکر ہی کیا ہے؟

لیکن ان مدارس کے قیام سے اصل مقصد چونکہ دین کا تحفظ تھا اور انقلابِ حکومت نے جو خطرات پیدا کر دیئے تھے ان کے پیشِ نظر علما کے نزدیک اس سے زیادہ ضروری کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی تھی کہ مسلمانوں کی دنیا تو خیر برباد ہی تھی کسی طرح ان کا دین بچا رہے اس بنا پر مدارسِ عربیہ سے جو علمی یا دنیوی فوائد پہلے حاصل کئے جاتے تھے اب وہ بہت مضمحل۔ ناقابلِ اعتنا اور ناشائستہ التفات ہو گئے اور مدارسِ عربیہ کا قیام ان کے نصاب و طریقہ تعلیم ہر چیز کا مقصد صرف دین اور اس کا تحفظ ہو گیا۔ چنانچہ دینیات کے علاوہ جو اور علوم پڑھائے جاتے تھے ان کا نام علومِ آلیہ رکھا گیا۔ یعنی گویا یہ ایسے علوم ہیں

جن کی بذات خود کوئی اہمیت نہیں ہے لیکن چونکہ ان کے پڑھنے پڑھانے اور درس و مطالعہ سے قرآن و حدیث کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے اس لئے ان کو بھی نصاب میں شامل رکھا گیا ہے۔ اس ذہنیت کا اثر بجز اس کے اور کیا ہو سکتا تھا کہ خود مدرسہ کے وجود میں جو پھیلاؤ تھا وہ سکڑ جائے اس کے مقاصد میں جو جامعیت اور ہمہ گیری تھی وہ ختم ہو جائے اور اس کے نصاب میں جو وسعت و پہنائی اور افادیت و سودمندی تھی وہ محدود ہو کر رہ جائے۔ (باقی آئندہ)

قدیم اور جدید تعلیم کے بعض خصوصیات و امتیازات

از

(جناب مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی)

ہندوستان کی موجودہ طرز تعلیم اور یورپ وامریکہ کی طرز تعلیم پر نظر ڈالی جائے تو بڑا فرق نظر آتا ہے جس کی یہاں تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے یہاں ہم صرف ہندوستان کی قدیم اور موجودہ تعلیم پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔

سب سے پہلے ہمیں مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے پہلے یہاں کی قدیم تعلیم کا ایک جائزہ لینا ہے قدیم حالات ویدوں سے معلوم ہوتے ہیں اس خصوص میں ہمارے آں جہانی پروفیسر بابو امرت لال صاحب سیل نے جو تحقیقات کی تھی اس کا اقتباس پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ پروفیسر صاحب اگرچہ ریاضی اور سائنس کے ماہر تھے مگر تعلیم سے خاص دلچسپی تھی اور انھوں نے دارالعلوم کے رسالہ "ثمرۃ الادب" میں کئی تحقیقی مضمون لکھے تھے

جس زمانہ کا ذکر وید میں آیا ہے اس زمانہ کی طرز تعلیم اور موجودہ زمانہ کی طرز تعلیم میں بہت اختلاف ہے۔ اس زمانہ میں اکثر راجاؤں یا علماء کے جلسوں میں طلباء کا امتحان لیا جاتا تھا اور جب وہ معلم بننے کے قابل ثابت ہوتے تو ان کو آچاریہ یا پروفیسر کا درجہ دیا جاتا تھا۔ بلا کامیابی کوئی طالب علم معلمی کا کام انجام نہیں دے سکتا تھا۔ حاکم وقت کا فرض تھا کہ ایسے کامیاب شخص کے لئے ایک مدرسہ قائم کر دے اور اس کی ذات اور طلباء کے اخراجات پرورش کے لئے جاگیر مقرر کرے۔ طالب علم کو درخواست کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی بلکہ کامیابی کی شہرت کے ساتھ ہی چاروں طرف سے دعوتیں آنے لگتیں۔ مدرسہ کے

نے لئے اکثر دریا یا چشمہ کے کنارے زمین ملتی تھی تعلیم کے لئے ایک بڑا دالان یا چھپر اور معلم اور اس کے اہل وعیال کے لئے ایک مکان ہوتا۔ طلبا کے لئے متعدد کمرے یا جھونپڑیاں بنائے جاتے۔ طلبار کے لئے خواہ وہ قریب کا رہنے والا ہو یا دور کا غریب ہو یا امیر استاد کے مکان پر بطور مہمان قیام کرنا لازمی تھا۔ تعلیم کے زمانہ میں طلبار استاد ہی کے لڑکے بن جاتے تھے۔ استاد کا دیا ہوا کھانا اور دئے ہوئے کپڑے پہنتے۔ جب لڑکوں کی عمر تحصیل علم کے لایق ہوتی تو اس کو جنیو یعنی زنار پہنا کر استاد کے سپرد کر دیتے تھے اس طرح "زنار" طالب علمی کی علامت ہے مذہب سے اس کو تعلق نہیں ہے۔ زنار سے یہ معلوم کیا جاتا تھا کہ زنار دار یا تو طالب علم ہے یا طالب علمی کر چکا ہے تعلیم کے زمانہ میں طالب علم کو استاد کی خانگی خدمت انجام دینی ہوتی تھی۔ مثلاً مدرسہ کے احاطہ میں کچھ پھولوں اور میووں کے درخت۔ کچھ ترکاری کی کاشت ضرور ہوتی۔ چند گائے پالے جاتے۔ معلم کی سواری کے لئے گھوڑا یا ٹٹو ہوتا۔ ان سب کی داشت کا کام طلبار کو کرنا ہوتا۔ اور یہ کام طلبار میں تقسیم ہوتا تھا۔ کوئی درختوں کی دیکھ بھال کرتا کوئی جانور کے دانے چارہ کا انتظام کرتا۔ یہ کام طلبار نہایت خوشی اور مسرت سے انجام دیتے تھے اس کو اپنی ذلت یا ہتک نہیں سمجھتے تھے۔

طالب علم قبل طلوعِ آفتاب بیدار ہوتا اور ضروریات سے فارغ ہو کر عبادت کرتا۔ اس کے بعد جو خانگی کام اس کے سپرد ہوتا اس کو انجام دیتا۔ اس کے بعد اس دالان میں حاضر ہو جاتا جہاں استاد تعلیم دیتا تھا۔

جب کوئی معلم اپنی قابلیت اور لیاقت سے زیادہ مشہور ہو جاتا اور اس کی شہرت دور دور تک پھیل جاتی تو اس کی جاگیر میں اضافہ کر دیا جاتا تھا۔ اس طرح شہرت کے ساتھ معلموں کی خوش حالی اور فارغ البالی میں ترقی ہوتی تھی۔ اگر مدرسہ کے لئے کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو معلم راجا سے درخواست اور خواہش کرتا تھا۔ طلبار کے والدین سے طلب کرنے کا رواج نہیں تھا۔ طلبار اور ان کے والدین یا سرپرست سے کوئی مدد یا معاوضہ لینا یا اجرت

تعلیم طلب کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ البتہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد جو طلباء کے والدین ذی استطاعت ہوتے وہ استاد کو نذرانہ پیش کرتے تھے اس کو قبول کیا جاتا تھا۔ غریب کے والدین پھول نذر کرتے امراء یا راجاؤں کے لڑکے۔ گھوڑا گائے نذر کرتے یا استاد کی بی بی بچوں کو کوئی چیز دیتے مگر یہ بھی معمولی چیز ہوتی تھی۔ مہابھارت میں ایک استاد کا ذکر آیا ہے کہ ان کی بی بی نے جو ایک راجہ کی دختر تھی۔ ایک دوسرے راجہ کے لڑکے کی ختم تعلیم پر ایک چارپائی کی فرمائش کی جب استاد کو معلوم ہوا کہ اس کی بیوی نے پلنگ کی فرمائش کی ہے تو وہ بہت خفا ہوا اور کہا غریب برہمن کی بیوی کو پلنگ کی ضرورت نہیں ہے اور بیوی سے کہا کہ اگر آپ کو آرام طلبی کی خواہش ہے تو آپ اپنے والدین کے یہاں چلی جائیں میں بخوشی اجازت دیتا ہوں اس کے بعد بیوی نے چارپائی لینے سے انکار کر دیا۔ بہر حال قبل از اختتام تعلیم نذر دینا اور لینا یعنی آج کل کی طرح تعلیم اجرت سے لینا اور دینا دونوں ناجائز تھے۔

زمانۂ تعلیم میں طلباء کے لئے حسب ذیل امور ممنوع تھے۔

(۱) زمانۂ تعلیم میں شادی کرنا یا .... کچھ قریب کے رشتہ داروں کے علاوہ عام دوسری عورتوں سے ہم کلام ہونا۔

(۲) لذیذ غذا یا شیرینی کھانا۔

(۳) شہوت دلانے والی چیزیں یعنی گوشت وغیرہ کھانا۔

(۴) گانا بجانا۔ ناچ دیکھنا اور عشقیہ کلام پڑھنا۔

(۵) نشہ کرنا۔

(۶) آرام طلبی کرنا

(۷) شوخ لباس پہننا۔

(۸) بدزبانی کرنا۔ اور فحش کلمات زبان پر لانا۔

(۹) دوسروں کی غیبت کرنا

(۱۰) بے رحمی یا سخت دلی کا کام کرنا

جو طالب علم ان تمام امور کی پابندی کرتا اس کو برہم چاری کہتے تھے، معلم یا استاد کا یہ فرض ہوتا تھا کہ طلباء کی اپنے لڑکوں کی طرح پرورش کرے۔ پاک وصاف اور مقوی غذا کھلائے۔ بیماری میں علاج اور تیمار داری کرے۔ طلباء کے دماغی اور جسمانی تعلیم کی نگرانی اور خبر داری کرے۔

اکثر طالب علم ایک فنی ہوتے تھے جب ایک فن سے فارغ ہو جاتے تو دوسرے فن کے لئے کسی دوسرے معلم کے پاس جاتے۔ بعض معلم ایسے ہوتے تھے جو ایک سے زیادہ فنون کی تعلیم دیتے تھے۔ ان مدرسوں پر راجا یا بادشاہ کی نگرانی نہیں ہوتی تھی۔

اس قسم کے مدرسوں کے علاوہ بعض دوسرے مدرسے تھے جن کو سرکاری مدرسے کہنا چاہیے۔ ان مدرسوں میں طلبار کے ساتھ استاد بھی بادشاہ یا راجہ کے مہمان بن کر رہتے تھے بعض استاد تعلیم کے ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بھی انجام دیتے تھے۔

یہ ہے قدیم ہندوستان کی تعلیم کا مختصر حال۔ اب مسلمانوں کے عہد کا ذکر بھی سنو۔

پیغمبر اسلام نے ہر مسلم مرد اور عورت پر علم کا حاصل کرنا فرض گردانا ہے۔ اس لیئے مسلمان بادشاہ تعلیم کی جانب خاص توجہ مبذول کرتے تھے۔ مسلمانوں کے زمانہ میں ہندوستان میں دو قسم کے مدرسے تھے ایک تو وہ مکتب یا ابتدائی مدرسے جو اکثر مساجد مسئیوں اور دھرم سالوں میں ہوتے تھے۔ دوسرے کالج اور دار العلوم جہاں اعلیٰ تعلیم ہوتی تھی مسلمانوں کے زمانہ میں جنوبی ہند (دکن) اور شمالی ہند کے شہروں میں درسگاہیں تھیں اس خصوص میں ابو الحسنات ندوی مرحوم نے اپنی کتاب "ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں" میں نہایت تفصیل کے ساتھ اسلامی عہد کی درسگاہوں کا تذکرہ کیا ہے چنانچہ انھوں نے اجمیر۔ دہلی۔ پنجاب۔ اور آگرہ۔ بہار۔ بنگال۔ دکن۔ مالوہ۔ ملتان۔ کشمیر گجرات۔ سورت کے (۱۰۸) مدرسوں کا تذکرہ کیا اور حال لکھا ہے مگر یہ صرف مشہور

مدرسے تھے۔ کیوں کہ ہندوستان کے طول و عرض میں مسلمانوں کے زمانہ میں جو مدارس قایم ہوتے تھے وہ سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ مثلاً اس کتاب میں پورے دکن جس میں احمد نگر۔ بیجاپور اور ارکاٹ بھی شامل ہے۔ صرف بارہ مدرسوں کا حال لکھا ہے۔ ہم نے صرف آصفیہ دور کے قدیم (۲۰) سے زیادہ مدرسوں کی صراحت اپنی کتاب میں کی ہے۔ بہمنی اور قطب شاہی عہد کے مدرسوں کا تذکرہ اس کے سوا ہے اور فیروز شاہ بہمنی کی علم دوستی کا ثبوت اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ فی ہفتہ پیر اور چہارشنبہ کو درس دیا کرتا تھا یورپ اور ایشیا کی تاریخ میں ایسے تاجدار علما، جو جہاں بانی کے گراں بار فرائض کے ساتھ علمی خدمت انجام دیتے ہوں بہت کم پیدا ہوئے ہیں۔ محمد تغلق کے زمانہ میں صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے موجود تھے جن کا تذکرہ مصری سیاح نے کیا ہے اور عالم گیر کے عہد کے ایک انگریز سیاح الگزنڈر ہملٹن نے صرف شہر ٹھٹھہ میں چار سو مدرسے ہونے کا ذکر کیا ہے۔

بہر حال اسلامی عہد کی تعلیم کے متعلق بہت کچھ مواد موجود ہے اور اس کی صراحت طوالت کا موجب ہے، نہ صرف تنخواہ یاب معلم اس کام کو انجام دیتے تھے بلکہ علماء اور فضلاً کے ساتھ صوفیاء کرام بھی علمی مشاغل میں مصروف و منہمک رہتے تھے۔ ان کی خانقاہیں درس اور تدریس کے لئے وقف رہتی تھیں۔

اس تفصیل کے بعد ہم اب ان امور کا تذکرہ کرتے ہیں جو قدیم اور جدید تعلیم کے امتیازی خصوصیات کہے جا سکتے ہیں۔

(۱) جب ہم قدیم اور جدید تعلیم کے اہم خصوصیات اور امتیازات پر نظر ڈالتے ہیں تو سب سے پہلے جو چیز سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ زمانۂ حال میں تعلیم کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے اور زیادہ سے زیادہ اصحاب تعلیم کی جانب مائل ہو گئے ہیں۔ تعلیم کا شوق دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ زمانہ گذشتہ میں یہ بات نہیں تھی۔ تعلیم کا دائرہ محدود ہوتا تھا۔ تعلیم یافتہ

اصحاب کم نسبے کم تر پائے جاتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہوگا کہ بعض طبقے یا بعض خاندان اور گھرانے علم حاصل کرتے تھے باقی اہل ملک کو علم سے رغبت نہیں ہوتی تھی، لیکن اس کے ساتھ جو بات گذشتہ تعلیم میں عام طور سے پائی جاتی تھی اور اب عمومیت نہیں رکھتی وہ علم کا عمق اور گہرائی ہے۔ زمانہ گذشتہ کا فارغ التحصیل مختلف علوم اور فنون میں ماہر ہوتا تھا۔ آج کل کے گراجویٹ سے زمانہ سابق کے فارغ التحصیل کے علمی، فنی معلومات زیادہ ہوتے تھے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پانی کی سطح جب پھیل جاتی ہے تو جس طرح اس کا عمق اور گہرائی کم ہو جاتی ہے وہی حال گذشتہ اور موجودہ تعلیم کا ہے

موجودہ زمانہ میں کسی ایک فن میں ریسیرچ کر کے اس فن میں امتیاز حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے مگر زمانہ سابق کا فارغ التحصیل مختلف علوم کا ماہر ہوتا تھا۔ ادب۔ صرف ونحو۔ بلاغت۔ ریاضی۔ فلسفہ۔ کلام۔ حدیث۔ فقہ کے ساتھ ساتھ اکثر اس کو طب میں بھی مہارت ہوتی تھی۔ اس قسم کے بیسیوں مثال پیش کئے جا سکتے ہیں جو اپنے وقت کے عالم وطبیب بھی تھے۔ اور جو طبابت کرتے تھے وہ دیگر علوم کا درس بھی دیتے تھے، اگر صبح کو ان کا مطب بیماروں اور مریضوں کے لئے وقف ہوتا تھا تو سہ پہر اور شام کو شائقین علم وفن ان سے درس لیا کرتے تھے۔

لیکن یہ بات یاد رہنی چاہئے کہ موجودہ زمانہ میں ایک فن میں ماہر ہو کر ریسیرچ کر کے اپنے علم کی نئی تحقیقات کرنے کے لئے جس قدر میدان وسیع ہے اور جس قدر سہولتیں اور آسانیاں فراہم ہیں یہ بات زمانہ سابق کے متعلم فارغ التحصیل کو حاصل نہیں تھیں۔ اس کو دشواریاں تھیں ذرائع نہیں ہوتے تھے اور تحقیقات کے موقعے نہایت کم ملتے تھے۔

(۲) دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ زمانہ سابق میں تعلیم مفت حاصل کی جاتی تھی شاگرد کو استاد کی ماہوار تنخواہ یا اجرت اور فیس ادا کرنی نہیں ہوتی تھی۔ تعلیم اور علم کا معاوضہ لینا سخت معیوب تھا۔ جو سرکاری مدرسے قائم تھے ان میں کوئی فیس طلبار سے نہیں لی جاتی تھی بلکہ

بعض کو وظائف اور روزینے دئے جاتے تھے تاکہ وہ اپنی قوت بسری کر سکیں۔ بعض سرکاری مدرسوں میں قیام کا انتظام ہوتا تھا۔ طلبار کے خورد و نوش کا انتظام حکومت کی جانب سے یا خود استاد کرتا تھا اور کوئی معاوضہ اس کا نہیں لیا جاتا تھا۔ جو سرکاری مدارس تھے ان مدارس کے مدرسین کو تنخواہ حکومت دیتی تھی یا جاگیریں مدرسوں کے لئے عطا کی جاتیں جس سے مدرسہ اور بورڈنگ کے اخراجات پورے ہوتے تھے کسی تعلیم پر حکومت کی نگرانی نہیں ہوتی تھی۔ دوسرے وہ علمار اور پنڈت جو طلبار کو تعلیم دیا کرتے تھے وہ بھی مفت دیتے تھے بلکہ اکثر مدرسین طلبار کو اپنے یہاں قیام کراتے اور ان کے مصارف کے خود کفیل ہوتے تھے البتہ ان سے خدمت لی جاتی تھی جس کا تذکرہ قبل ازیں کر دیا گیا ہے۔ موجودہ عہد میں اجرت یا فیس سرکاری اور خانگی مدارس میں لی جاتی ہے جو دوسرے مصارف کتابوں، کاپیوں امتحان کی فیس وغیرہ کے لاحق ہوتے ہیں وہ زمانۂ سابق میں کچھ بھی نہیں ہوتے تھے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ عہد میں تعلیم گراں سے گراں تر ہو گئی ہے اور زمانہ سابق میں تعلیم اس قدر گراں قیمت نہیں ہوتی تھی۔

(۳) تیسری خصوصیت تعلیمی ذوق اور علمی شوق ہے۔

عصر حاضر میں عام طور سے جو تعلیمی شوق اور ذوق پایا جاتا ہے وہ زمانہ سابق میں نہیں تھا۔ زمانۂ سابق میں تعلیم اور علم کی جانب عام طور سے ہر کس و ناکس متوجہ نہیں ہوتا تھا بلکہ اس میں خصوصیت ہوتی تھی اور پھر دقتیں زیادہ نہیں۔ اکثر علمار طلبار کے ذوق اور شوق کا پہلے امتحان لیا کرتے اور اس کے بعد اس کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ مثلاً میرے نانا کے والد قاضی بدر الدولہ نے جب ملک العلمار مولانا عبد العلی فرنگی محلی سے درس لینے کی خواہش کی تو موصوف نے ادل فرمایا تھا ان کے پاس کوئی وقت نہیں ہے البتہ جب وہ اپنے مکان سے ارکاٹ کے نواب کے یہاں جاتے ہیں تو راستہ میں چلتے ہوئے درس لیا جا سکتا ہے چنانچہ یہ تیار ہو گئے اور دو ایک دن تک موصوف کے میانہ کے ساتھ پیدل چلتے ہوئے درس لیا۔

جب مولانا نے ان کے ذوق اور شوق کو پوری طرح جانچ لیا تو پھر اپنے مکان پر درس دینے لگے۔ اس طرح زمانہ سابق میں طلبار کے ذوق اور شوق کا امتحان لے کر درس دیا کرتے تھے۔

(۴) موجودہ زمانہ میں جس طرح سائنس کے آلات کے ذریعہ عملی طور پر تجربات اور مشاہدات سے تعلیم دی جاتی تھی اور تحقیقات کرنے کا موقع حاصل ہے یہ زمانہ سابق میں میسر نہیں تھا۔ آج کل جس طرح صدہا طلبار سائنس۔ ریاضی۔ طب وغیرہ کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور ہر سال صدہا ڈاکٹر۔ انجنیر اور پروفیسر بنتے ہیں۔ یہ بات زمانہ سابق میں میسر نہیں تھی۔ طبیب کو علم حاصل کرنے کے بعد کئی سال تک کسی بڑے طبیب کے پاس رہ کر عملی تجربہ حاصل کرنا ہوتا اس کے بغیر صرف تعلیم پاکر ...... اپنے طور پر مطب قایم کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔

(۵) زمانہ سابق میں جو اصحاب علمی ذوق اور تعلیمی شوق رکھتے تھے وہ مذہبی علوم بھی بلا تخصیص مذہب حاصل کرتے تھے۔ یعنی ہندو اصحاب مسلمانوں کے مذہبی علوم حدیث تفسیر۔ فقہ کی تعلیم حاصل کرتے اور ان علوم میں پوری دست گاہ رکھتے تھے۔ اور اس طرح مسلمان علمار سنسکرت کی تعلیم پاکر وید پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ راجہ مکھن لال جو دولت رام منشی کے فرزند تھے علم نجوم اور ریاضی میں مہارت کے ساتھ شاعری اور خوش نویسی میں ید طولیٰ رکھتے تھے، حیدرآباد سے جب مدراس گئے تو مولانا عبد العلی ملک العلمار اور مولوی محمد غوث شرف الملک سے دینی علوم کا استفادہ کیا اور شرح ملا تک تعلیم پائی ان کو تاریخ گوئی میں مہارت حاصل تھی، مسجد والاجاہی مدراس کے تعمیر کی تاریخ آپ ہی نے نکالی تھی جو آج بھی مسجد مذکور پر کندہ ہے۔

مسلمانوں نے برہمنوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام بھی فرمایا تھا جو برہمن وید کی تعلیم دیتے تھے وہ "شاستری" سے موسوم ہوتے تھے۔ ان کا کام وید اور شاستر پڑھنا اور پڑھانا ہوتا تھا ایسے اصحاب کو یومیے اور انعام دیے گئے ہیں جو آج تک ان کے خاندان میں باقی ہیں۔

ان سب امور سے قطع نظر سب سے زیادہ جو بات زمانۂ سابق میں عام تھی اور اب مفقود ہے وہ یہ ہے کہ استاد اور معلم لڑکوں کی کردار سازی کا زیادہ خیال رکھتے تھے ان کو اپنی اولاد کی طرح سمجھ کر تعلیم دیا کرتے اور اسی طرح ان کی تربیت کرتے تھے اور طلبا بھی استاد کو اپنے باپ سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں نہ تو ایسے شفیق استاد میسر ہوتے ہیں اور نہ سعادت مند طلبار ملتے ہیں۔ شفیق استادوں کی کمی وجہ ہے کہ تعلیم کی سرعت کے ساتھ وسعت کے باوجود کردار سازی کا فقدان پایا جاتا ہے۔

آج سے پچیس تیس سال پہلے بھی جو بات حاصل تھی اور جس طرح استاد اور شاگرد میں رابطہ ہوتا تھا آج اس کا عشر عشیر بھی نظر نہیں آتا۔ معلم یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا کام مقررہ اوقات میں لکچر دے دینا یا سبق پڑھانا ہے اور طلبار یہ سمجھتے ہیں کہ فیس ادا کر دی گئی ہے حاضری دے کر لکچر سن لیا جائے یا درس کی سماعت کر لی جائے۔

کردار سازی اور تربیت کی طرف نہ تو استاد اور پروفیسر متوجہ ہوتے ہیں اور نہ ان کو موقع ملتا ہے۔

آئندہ ہم کو سب سے زیادہ جس امر کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے وہ کردار سازی ہے۔ کردار سازی ہی سے ہماری اولاد اور ان کی نسل اچھے سپوت بن سکتے ہیں۔ چنانچہ مولانا ابو الکلام آزاد نے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں اس طرف توجہ بھی دلائی ہے۔ یہ ہیں چند خصوصیات اور امتیازات جو ہمارے قدیم اور جدید معلم کے فرق کو ظاہر کرتی ہیں۔

وحی الٰہی (جدید ایڈیشن)

مسئلۂ وحی پر ایک محققانہ کتاب جس میں اس مسئلہ کے تمام گوشوں پر ایسے دل پذیر و دلکش انداز میں بحث کی گئی ہے کہ وحی اور اس کی صداقت کا ایمان افروز نقشہ آنکھوں کو روشن کرتا ہوا دل میں سما جاتا ہے جدید تعلیم یافتہ حضرات کے مطالعہ کے لائق کتاب ہے کاغذ نہایت اعلیٰ۔ کتابت نفیس طباعت عمدہ صفحات ۲۰۰ قیمت ۵/- مجلد ۶/-

عثمانؓ

صرف تاریخ کی روشنی میں

از
ڈاکٹر طٰہٰ حسین

مترجم
(مولانا عبدالحمید صاحب نعمانی)

مصر کے مشہور و معروف اہل قلم ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے حال ہی میں الفتنۃ الکبریٰ کے عنوان سے تین کتابیں لکھی ہیں عثمانؓ، علیؓ، اور معاویہؓ ان کتابوں میں موصوف نے خلافت راشدہ کے تیسرے دور سے شروع ہو جانے والی آویزش پر صرف تاریخ کی روشنی میں بحث کی ہے اردو میں غالباً اس نوع کی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ناظرین "برہان" کے لئے ہم پہلی کتاب کے چند ابتدائی اوراق پیش کرتے ہیں جس سے مصنف کے فکر کا کچھ اندازہ ہو جائے گا۔

عبدالحمید نعمانی

اپنے بس بھر کوشش کروں گا کہ جو کچھ پیش کروں پورے اخلاص کے ساتھ اور حق و صداقت کی خاطر، میں پوری قوت صرف کروں گا کہ میرے پیش نظر صرف حقیقت حال ہو، اصلیت اور انصاف ہو، میں حضرت عثمانؓ کے قضیئے میں حصہ لینے والے اسلامی فرقوں میں سے کسی ایک کی ہواخواہی اور طرفداری نہیں چاہتا، عثمانی حمایت، اور علوی شیعیت، میں دونوں سے علیحدہ ہوں، میرے فکر و نظر کا گوشہ اس معاملے میں وہ نہیں جو خود حضرت عثمانؓ کے معاصرین کا تھا جنہوں نے اس کشمکش کے مصائب برداشت کئے اور ان کی وفات

کے بعد بھی اس سے پیدا ہونے والے نتائج کا شکار بنے رہے۔

میں جانتا ہوں کہ لوگ آج بھی اس مسئلے میں اسی طرح مختلف خیالات رکھتے ہیں جس طرح حضرت عثمانؓ کے عہد میں رکھتے تھے، ایک طرف عثمانی ہیں جو صحابہ میں شیخین کے بعد حضرت عثمانؓ کا درجہ سب سے اونچا جانتے ہیں، دوسری طرف شیعی ہیں جو نبی کریم صلعم کے بعد حضرت علیؓ ہی کا درجہ مانتے ہیں، ان کے خیال میں شیخین کے لئے بھی قدر و منزلت کی کوئی گنجائش نہیں، کچھ لوگ بیچ میں ہیں، کچھ تھوڑی سی عثمانیت اور کچھ ذرا سی علویت اور دونوں میں درمیانی راہ، یہ لوگ تمام صحابہ کی عظمت و احترام کے قائل ہیں، السابقون الاولون کا درجہ بھی پہچانتے ہیں، پھر صحابہ میں باہمی فضیلت ان کے نزدیک ضروری نہیں، ان کا خیال ہے کہ تمام صحابہ نے پوری سرگرمی کے ساتھ کام کیا، اللہ کی راہ میں، رسول کی محبت میں، اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں رشد و ہدایت کی منزلیں طے کیں، بعضوں سے کچھ کوتاہیاں بھی ہوئیں لیکن وہ سب کے سب اجر عظیم کے مستحق ہیں اس لئے کہ ان کا مقصد نیک تھا، ان کی نیت قصور اور کوتاہی کی نہ تھی، اسلام کے مختلف فرقوں کے یہ خیالات ہیں جن پر وہ پوری شدت کے ساتھ جمے ہوئے ہیں اور جن کی مدافعت اور حفاظت میں مر مٹنے کو تیار ہیں اس لئے کہ ان خیالات کا مرکز دین و ایمان ہے اور ایک بندۂ مومن کے اعمال و معتقدات کی تمنا اپنے دین کی حفاظت، اپنے یقین کی مضبوطی اور خدا کی خوشنودی کے سوا کچھ نہیں،

میں اس معاملے کو ایک ایسی نگاہ سے دیکھنا چاہتا ہوں جو جذبات اور تاثرات کی عینک سے ہو کر نہ گزرتی ہو، جو مذہب کی تاثیر اور عقیدے کے اثر سے خالی ہو، یہ نگاہ ایک مورخ ہی کی ہو سکتی ہے جو اپنے آپ کو رجحانات، جذبات اور خواہشوں سے بالکل الگ کر لیتا ہے

مسلمانوں کی ایک جماعت اور کہنا چاہئے بہترین مسلمانوں کی جماعت اس فساد

آفرین حادثے سے قبل ہی اللہ کی رحمت کو پہونچ چکی تھی، اس کا دنیا سے اٹھ جانا اس کے ایمان اور قدر و منزلت میں کسی کمی کا باعث نہ ہو سکا بلکہ ان کی موت نے ان کو لغزش کے مواقع اور مشتبہ پوزیشن سے بچالیا، اور وہ دنیا سے کامیاب اور بامراد، شر و فساد سے محفوظ رخصت ہوئے، لیکن اصحاب رسول صلعم کی ایک پوری جماعت قضیۂ عثمانی کے وقت موجود تھی، جب مسلمان اپنی تاریخ میں شدید ترین فساوت اور عداوت کے ساتھ اس قضیہ میں حصہ لے رہے تھے بعض صحابہ رضؓ نے اس میں حصہ نہیں لیا وہ اس میں شرکت کے بالکل روادار نہیں ہوئے، نہ کم نہ زیادہ، وہ حصہ لینے والوں سے کنارہ کش رہے، انھیں میں کے ایک خدا کی ان پر رحمت ہو سعد بن ابی وقاص ہیں جنہوں نے فرمایا" میں تو

لا اقاتل حتی تاتونی بسیف یعقل ویبصر وینطق فیقول اصاب ھذا واخطاء ذاك

اس وقت لڑوں گا جب تم مجھے ایسی تلوار لاکر دوگے جو فکر و نظر رکھتی ہو اور جو یہ بولتی ہو کہ اس نے غلطی کی اور یہ حق بجانب ہے۔

میں حضرت سعد اور ان کے ساتھیوں کی راہ چلنا چاہتا ہوں رضی اللہ عنہم، طرفین میں سے مجھے نہ ایک سے پرخاش ہے نہ دوسرے سے بحث و تکرار، میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ اپنے علم اور لوگوں کی اطلاع کے لئے ان حالات کا پتہ چلاؤں، اس ماحول تک پہنچوں جس نے طرفین کو فتنے میں مبتلا کر دیا اور باہمی خصومت کا ایک ایسا سلسلہ جاری کر دیا جس نے بڑی بے دردی کے ساتھ ایک کو دوسرے سے جدا کر دیا اور غالب گمان ہے کہ یہ جدائی آخر زمانے تک باقی رہے گی، اس کتاب کے پڑھنے والے آگے چل کر پڑھیں گے۔ کہ حالات کی نزاکت اور معاملات کی خطرناکی حضرت عثمان رضؓ اور حضرت علی رضؓ اور ان کے موافقین و مخالفین سب کے بس سے باہر تھی، وہ واقعات میں پڑھیں گے کہ جن حالات میں حضرت عثمان رضؓ مسند نشین خلافت ہوئے اگر ان میں کسی دوسرے کو بھی تخت خلافت پر بٹھا دیا جاتا تو وہ بھی انھیں کی طرح فتنہ و فساد کے مصائب اور آلام میں مبتلا ہوتا اور لوگ اس سے

بھی جدال و قتال کرنے۔

میں تو اس خیال کا ہوتا جا رہا ہوں کہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے تخیل میں جو اسلامی خلافت تھی وہ ایک دلیرانہ تجربہ اور خدا کارانہ اقدام تھا جس کی تکمیل نہ ہو سکی اور شاید اس کی تکمیل کے مواقع ممکن نہ تھے اس لئے کہ یہ تجربہ وقت سے بہت پہلے شروع کر دیا گیا۔

اب تک انسانیت نے تجربہ اور آزمائش کی کتنی ہی منزلیں طے کر لی ہیں حکومت اور تشکیل حکومت کے سلسلے میں تو اس کی ترقی اور تجربہ کی پرواز اونچی سے اونچی چوٹی تک پہنچ چکی ہے لیکن کیا فرماتے ہیں آپ کیا انسانیت ان ترقیوں اور تجربوں کے بعد بھی ایک ایسے نظامِ حکومت کی تشکیل میں کامیاب ہو سکی، جس میں سیاسی اور سماجی انصاف کے تقاضے ٹھیک اسی طرح پورے ہوتے ہوں جس طرح حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ اپنے اپنے عہد میں پورا کرنا چاہتے تھے۔

انسانیت نے طرح طرح کی حکومتیں بنائیں، ایک حکومت تو وہ بنائی جس میں بادشاہ اپنے آپ کو خدا تصور کرتے تھے دوسری حکومت ایسی بنائی جس میں بادشاہ خدا تو نہیں لیکن دیوتاؤں اور خدا کا سایہ تسلیم کیا گیا، اس سلسلے کی ایک کڑی یہ ہے کہ بادشاہ کی ذات کسی ایک خدا کا اوتار ہے، یہ سارے بادشاہ سچ مچ یا غلط خیال کرتے تھے کہ ان کا اقتدار عوام کا عطیہ نہیں ہے بلکہ یہ تو ان کے آباء و اجداد سے ان کو ملا ہے جو خدا تھے، یا ان دیوتا، یا دیوتاؤں کا عطیہ ہے جن کا روپ انھوں نے دھارن کیا ہو،

اب اس قسم کے بادشاہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں جو احکام بھی صادر فرماتے اس میں صرف ان کے دل کی خوشی کارفرما ہوتی عوام خوش ہوں گے یا ناراض؟ اس کی ذرا بھی پرواہ نہ ہوتی اور ہوتی بھی کیسے عوام تو پیدا ہی اس لئے ہوئے ہیں کہ اطاعت کریں، حکم بجا لائیں؛ انھیں ناراض یا خوش ہونے کا کوئی حق نہیں، ان کی مرضی یا ناپسندیدگی بادشاہوں کی طبیعت میں کسی تبدیلی کا باعث نہیں ہو سکتی تھی بالکل اسی طرح جیسے آفتاب

کے نکلنے سے خوش اور اس کے ڈوب جانے پر ناراض ہوتے ہوں لیکن وہ نہ آپ کی خوشی پر طلوع ہوگا اور نہ آپ کا غصہ اس کو غروب ہونے سے روک سکتا ہے،

انسانیت نے اس قسم کے بادشاہوں اور ان کی حکومتوں کا تجربہ کیا ان سے اس کو کچھ برائے نام راحت ملی زیادہ تر تو عذاب ہی عذاب رہا۔ تب اس نے اس میں انقلاب لانے کی کوشش کی، اس کی یہ کوشش کہیں کہیں کامیاب بھی ہوئی، چنانچہ مٹھی بھر اشراف اور امراء کی حکومت ظہور میں آئی جو اپنے درمیان مساوات کے قائل تھے لیکن عوام میں وہ بھی اس کے روادار نہ تھے اسی طرح مطلق العنان ظالموں اور سفاکوں کا دورِ حکومت آیا جو مظلوم عوام کی دستگیری کے نام سے میدان میں آئے انھوں نے اعلان کیا کہ وہ ان گنے چنے امرا اور سرداروں کے مظالم سے عوام کو نجات دلائیں گے وہ عدل و مساوات پھیلائیں گے۔ قوی اور کمزور، غریب اور امیر کا فرق مٹا دیں گے مضبوط اور معذور دونوں ان کی نگاہوں میں ایک ہوں گے لیکن وہ یہ سب تو نہ کر سکے الٹے لوگوں میں مظالم کا دائرہ کچھ زیادہ وسیع کر دیا اور عوام کے ساتھ اشراف کو بھی ذلیل کر کے انسانیت کو اسی ذلت اور بدبختی کے گڑھے میں پہنچا دیا جہاں سے وہ نکلنا چاہتی تھی بلکہ اس سے بھی زیادہ گہرے غار میں۔

اس کے بعد انسانیت نے ایک ایسے نظامِ حکومت کا منہ دیکھا جس کے متعلق اس کا خیال ہے کہ وہ بہترین اور معقول ترین دستورِ حکومت ہے عوام اس کے ذریعے سیاسی انصاف اور سماجی مساوات کا پورا پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں وہ نظام حکومت یہی جو عوام کو اپنے معاملات کا خود مختار بناتا ہے اور ان کو حق دیتا ہے کہ وہ اپنے لئے جیسا نظم چاہے بنائیں انسانیت نے اس نظام کا تجربہ کیا بلاشبہ اس کے ذریعہ اس کو انصاف کی ایک قسط مل گئی۔ لیکن پوری پوری قسط وصول نہ ہوسکی اور جو ہوئی وہ بھی بالکل سطحی اور سرسری، چنانچہ آج بھی لوگ کسی ایک رائے پر متفق نہیں ہوسکے اور یک جہتی اور اشتراک سے محروم ہیں، عوام کی لگام بظاہر بلاشبہ عوام کے ہاتھ میں ہے لیکن حقیقت کچھ بھی نہیں، پوچھا یہ جاتا ہے کہ عوام

کیا چاہتے ہیں؟ اب اگر جواب میں اختلاف ہوا اور اختلاف کا ہونا یقینی ہے تو فیصلہ اکثریت کے حق میں ہو جاتا ہے اقلیت کی پرواہ نہیں کی جاتی اس طرح اکثریت کو موقع دیا جاتا ہے کہ وہ اقلیت کو پامال کرے اس کی مرضی کے خلاف اس پر حکمراں ہو، اگر اکثریت کو یہ موقع دیا جاتا کہ وہ براہ راست اپنے اوپر اور اقلیت پر حکمرانی کرتی تو شاید یہ نظام انصاف سے قریب تر اور مظالم سے بڑی حد تک خالی ہوتا لیکن اکثریت کی براہ راست حکومت کی کوئی شکل نہیں اس لئے ہوتا یہ ہے کہ اکثریت حکومت کرنے کے لئے اپنے نمائندے چنتی ہے، یہ چناؤ بسا اوقات جبر و تشدد اور دہشت کی فضا میں، مکر و فریب، رشوت اور لالچ کی تاریکی میں انجام پاتے ہیں اور کبھی ایسا نہیں بھی ہوتا لیکن اس سے تو مجالِ انکار نہیں کہ یہ نمائندے جنہیں اکثریت پسند کرتی ہے اور حکومت کی لگام ان کے ہاتھ میں دیتی ہے انسانوں ہی میں سے کچھ انسان ہوتے ہیں جن میں پختگی بھی ہوتی ہے اور خامی بھی، سختی بھی ہوتی ہے اور نرمی بھی، قناعت بھی ہوتی ہے اور حرص بھی، ایثار بھی ہوتا ہے اور خود غرضی بھی، پس یہ ہر وقت راہ سے ہٹ جانے کی زد میں ہیں اور ان سے خطرہ ہے کہ حدِ اعتدال سے بڑھ جائیں اور اپنے ساتھ عوام کو بھی غلط راہ پر لے جائیں اور بالآخر بے انصافی کی وہی فضا پیدا کر دیں جو مستبد بادشاہوں، خود غرض اشراف، خون خوار ظالموں اور سفاکوں کے عہد حکومت میں تھی،

اتنی ساری مشکلات اور ابھی ہم سیاسی انصاف کی منزل ہی میں ہیں پھر آپ اندازہ کیجئے کہ سماجی مساوات کی امید کس طرح کی جا سکتی ہے جس کا مقصد صرف یہی نہیں کہ سب لوگ حکومت کی نگاہ میں برابری کا درجہ رکھتے ہوں بلکہ تمام لوگ زندگی کے وسائل اور ذرائع سے بھی یکساں مستفید ہو سکیں، اب تک انسانیت نے مختلف زمانوں، مختلف خاندانوں اور مختلف حالات میں جتنے نظامِ حکومت بھی دیکھے ان میں سے ایک بھی اس سماجی مساوات کا حامل ثابت نہیں ہو سکا جو عوام میں وہ اطمینان، وہ خوش گواری اور وہ امن پیدا کر دے جو بے چینی، بے زاری اور خوف سے خالی ہو پھر عہدِ حاضر کی انسانیت کو جو کچھ حاصل ہے

وہ کسی طویل بحث کا محتاج نہیں، ڈیماکریسی نے قانون کی نگاہ میں عوام کو ضرور کسی حد تک آزاد اور مساوی بنا دیا ہے، لیکن وہ ان کے لئے سماجی مساوات کی ضامن نہیں، اشتراکیت نے ضرور کم وبیش سماجی مساوات اور انصاف کے تقاضے پورے کئے، چنانچہ اس نے طبقاتی فرق کو دور کیا مزدوروں کو اپنی محنت سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا۔ محتاجوں اور معذوروں کے لئے باعزت زندگی گذارنے کی سبیل نکالی لیکن یہ سب دے کر ان سے آزادی چھین لی۔ اور ڈکٹیٹرشپ نے تو سبھی کچھ غصب کر لیا، نہ آزادی باقی رکھی نہ مساوات، عوام کو بری طرح شرمناک حد تک غلام اور حکومت کا آلۂ کار بنایا اور اس غلامی کے بدلے میں بھی اس نے عوام کو کچھ نہیں دیا،

ایک صالح حکومت کی تلاش میں انسانیت نے یہ سارے راستے طے کئے اور نظامِ حکومت کے خوب خوب تجربے کرتی رہی لیکن ہنوز دلی دور است، اب تک وہ ظلم وستم کی شاکی ہے اور غلامی کی ذلتوں سے تنگ آچکی ہے۔ وہ متلاشی ہے ایک ایسے صحیح اور مستقیم نظامِ حکومت کی جو انسانوں کو آزادی اور انصاف کی نعمت عطا کرے، یہ صحیح اور مستقیم نظامِ حکومت وہی ہے جس کے قیام کی کوشش اسلامی خلافت نے صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کے عہد میں کی تھی لیکن ابھی اس تجربے کی ابتدا بھی نہ ہو سکی تھی کہ صدیق اکبرؓ اس عالمِ فانی سے رخصت ہو گئے، ابھی اس تجربے کی راہ میں چند بڑے بڑے قدم ہی اٹھائے تھے کہ فاروق اعظمؓ شہید کر دئے گئے مزید برآں حضرت عمرؓ ان اقدامات سے پوری طرح مطمئن بھی نہیں ہو سکے، اپنی خلافت کے آخری دنوں میں آپ فرماتے تھے کہ جو کچھ میں نے آخر میں کیا اگر وہ پہلے کرتا

لو استقبلت من امری ما	تو دولت مندوں سے ان کی پڑی ہوئی بے کار
استدبرت لاخذت من الاغنیاء	دولت لے لیتا اور محتاجوں تک پہنچا دیتا
فضول اموالھم فرددتھا علی الفقراء	

اس کے معنی یہی ہیں کہ حضرت عمرؓ سماجی مساوات کا تقاضہ اچھی طرح پورا نہیں کر سکے

پھر کسی امیر یا والی کا کیا ذکر ؟ مسلم اور غیر مسلم سبھی جانتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی طرح قیام عدل کا نہ کسی امیر نے ارادہ کیا اور نہ پورا کر دکھایا پھر یہ کہ لوگ بھی حضرت عمرؓ کے تجربات سے خوش نہ تھے، عوام آپ سے خائف اور مرعوب تھے اور ڈر کر آپ کے احکام کی تعمیل کرتے تھے آپ کا بڑے سے بڑا چاہنے والا ہو یا آپ کا زیادہ سے زیادہ محبوب، کسی کو بھی اس بات کی کامیاب سفارش کا حوصلہ نہ تھا کہ حضرت عمرؓ خود اپنی ذات کے متعلق یا دوسروں کے بارے میں کچھ نرمی اور چشم پوشی سے کام لیں، کیونکہ آپ عدل کو ہر چیز پر مقدم رکھتے تھے، اور آخری بات یہ کہ مفتوحین کو بھی یہ تجربات خوش نہ رکھ سکے، وہ خیال کرتے تھے کہ ان کی مرضی کے خلاف اور ان کی طاقت کے باہر ان سے کام لیا جاتا ہے، انھیں یہ بھی خیال تھا کہ تمدن اور تہذیب میں ان کا درجہ پہلے ہے عرب تو نو تہذیب ہیں اور ابھی ابھی ان میں تمدن آیا ہے پس یہ بات ان کی مرضی کے بالکل خلاف تھی کہ متمدن اور مہذب لوگوں پر وحشی دیہاتیوں کو مسلط کر دیا جائے، حضرت عمرؓ اسی قسم کی ناراضگی کے نتیجے میں شہید کر دیئے گئے، انھیں مفتوحین میں سے ایک نے جب اپنے آقا مغیرہ بن شعبہ کی شکایت کی اور تحقیق کے بعد حضرت عمرؓ نے کچھ عتاب نہیں کیا تو اس نے آپ کے خنجر بھونک دیا جب کہ آپ نماز کے لئے بڑھ رہے تھے،

لیکن یہ بڑی زیادتی ہوگی کہ ہم اس دلیرانہ تجربے پر اس قدر غیر معمولی عجلت کے ساتھ رائے قائم کر لیں، اس تجربے کا ہم پر حق ہے کہ ہم پوری توجہ اور بصیرت کے ساتھ غور کریں کہ کیا یہ کوئی پائدار چیز تھی اور کیا یہ ممکن تھا کہ یہ تجربہ کامیاب ہو جاتا اور اس سے جو مقصد تھا وہ پورا ہو جاتا ہم غور و فکر کے بعد ہی اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہو سکتے ہیں جو انصاف کی خاطر ہم نے اپنے سر لی ہے اور پھر یہ غور و فکر بہت سی ان مشکلات کے سمجھنے میں ہماری مدد کرے گا جو حضرت عثمانؓ کے زمانے میں فتنہ و فساد کا باعث بنیں یا بنائی گئیں اس لئے نہیں کہ حضرت عثمانؓ خلیفہ تھے بلکہ اس لئے کہ وہ وقت ہی ایسا تھا کہ فتنہ ہو اور بعض لوگ کریں۔

مسلمانوں کے لئے تا حدِ امکان نبی کریم صلعم کی سیرت کا نمونہ پیش کر دینا حضرت ابوبکرؓ

اور حضرت عمرؓ کے نظام حکومت کی بنیاد تھی سیرت نبوی کا ہر رخ مسلمانوں پر اچھی طرح روشن ہو چکا تھا جس کا مرکزی پہلو یہ تھا کہ تمام انسانوں کو سچا اور بے لاگ انصاف مل سکے اس کے لئے ہمیں کسی بحث اور دلیل کی ضرورت نہیں بھول جانے والوں کے لئے ہمارا یہ کہہ دینا کافی ہے کہ اسلام نے دنیا کے سامنے سب سے پہلے دو باتیں پیش کی ہیں، ایک توحید اور دوسری انسانی مساوات ارشاد خداوندی ہے

إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ

ہم نے تم کو نر اور مادہ سے پیدا کیا اور تمہیں پہچاننے کے لئے قبائل اور شعوب میں تقسیم کر دیا، تم میں سب سے زیادہ برگزیدہ اللہ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہے

قریش کو سب سے زیادہ غصہ آپ کی اسی دعوت پر تھا کہ آپ لوگوں کو اس عدل اور مساوات کی طرف بلاتے تھے، آپ کی نگاہ میں حاکم و محکوم کا، آزاد اور غلام کا، قوی اور کمزور کا امیر اور غریب کا کوئی فرق نہ تھا اور سبھی کنگھی کے دانتوں کی طرح ایک سے تھے، آپ لوگوں کو ہدایت فرماتے تھے کہ آپس میں نیچ اونچ کا برتاؤ نہ کرو، شاید کوئی اعتراض کرے کہ آپ نے غلامی کا خاتمہ تو نہیں کیا اور نہ اس کی ممانعت کی کہ کوئی کسی کا مالک نہ رہے، لیکن جو لوگ اسلام کو جانتے ہیں اور اس کی حقیقت کے آشنا ہیں ان کے نزدیک خدا کے دربار میں آقا اور غلام کا درجہ ایک کر دینا ہی اسلام کا وہ اقدام ہے جو تاریخ انسانیت میں ایک عظیم الشان واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اگر پیش آنے والے واقعات فتنہ و فساد بن کر مسلمانوں کی راہ میں حائل نہ ہو گئے ہوتے تو یہ واقعہ اپنی عظمت بعد میں بھی باقی رکھتا اس لئے کہ خدا نے آقا اور غلام دونوں پر نماز فرض کی، دونوں کو روزے کا حکم دیا، دونوں کو تاکید کی کہ دلوں کو پاک اور نیتوں کو خالص کریں، اس نے دونوں کے لئے ایک ہی دین کا اعلان کیا، دونوں کے خون کو حرام کیا، ایسا نہیں کیا کہ غلاموں کا دین الگ ہو اور مالکوں کا الگ، اگر

مسلمانوں کے معاملات اپنے رخ پر چلتے تو یہ باتیں غلامی کو ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیتیں مزید براں خدا نے غلاموں کے آزاد کر دینے کو ان نیکیوں میں شمار کیا ہے جن کے لئے مسلمان پیش قدمی کر کے خدا سے اجر عظیم کے مستحق بنیں، اس نے دین میں بہت سے ایسے مواقع پیش کئے جہاں تک پہنچنے کے بعد غلام آزاد بن جاتا ہے۔ غرض غلاموں کی آزادی عملِ صالح بتائی گئی بعض گناہوں کا کفارہ قرار دی گئی اس طرح ہر وہ دروازہ کھولا گیا جس میں داخل ہو کر مسلمان ذوق اور شوق کے ساتھ اس فرض کو پورا کریں۔

یہی وہ باتیں ہیں جن کو سن کر قریش آگ بگولا ہو جاتے تھے، اور آں حضرت صلعم پر غصے میں دانت پیستے تھے، میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر آپ قریش کو صرف توحید کی دعوت دیتے اور ان کے سماجی اور اقتصادی نظام کو نہ چھیڑتے، قوی، کمزور، امیر، غریب، آقا اور غلام کا فرق بدستور باقی رہنے دیتے، سود خوری کو حرام قرار نہ دیتے، دولت مندوں سے مال لینے اور فقیروں پر تقسیم کر دینے کا کام نہ کرتے تو قریش کی اکثریت بڑی آسانی کے ساتھ آپ پر ایمان لے آتی، اس لئے کہ قریش کے لوگ مخلصانہ طور پر بتوں سے نہ عقیدت رکھتے تھے اور نہ سچا جذبہ ان کی کیفیت تو تذبذب کی سی تھی اور وہ بھی شوخی اور تمسخر کے انداز میں یہ سارے بت ان کی نگاہ میں اصل مقصود نہ تھے، بلکہ عام عربوں کو قابو میں رکھنے کا ایک ذریعہ تھے، پھر اگر قریش کی بڑی اکثریت ایمان نہ لاتی تو جو بھی ایمان لاتے، لاتے جو نہ لاتے وہ رک کے رہتے، لیکن آپ کے لئے کسی آویزش یا عناد کا باعث نہ بنتے الغرض قریش کا غیظ و غضب جس قدر بتوں کی مذمت سے تھا اس سے کہیں زیادہ اس لئے تھا کہ آپ ان کے سماجی نظام پر بحث اور نقد و نظر فرماتے تھے اور آپ ایک ایسے انصاف کی دعوت دیتے تھے جو ان کی سیادت اور قیادت کے مفاد کے خلاف تھا۔

سب جانتے ہیں کہ آپ نے محض اسلام کی طرف رغبت کی خاطر بعض سرداران قریش کی طرف توجہ کی جس میں غریبوں سے کچھ بے التفاتی کا رنگ پیدا ہو گیا تو اللہ نے شدید

ہنجے میں اپنا عتاب نازل کیا آج تک لوگ وہ آیتیں تلاوت کرتے ہیں جو اُمِ مکتوم کے واقعے سے متعلق وارد ہیں۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰیٓ اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی — تیوری چڑھائی اور روگردانی کی اس بات پر کہ آگیا
وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰیٓ اَوْ یَذَّکَّرُ — ان کے پاس نابینا اور آپ کو کیا خبر کہ شاید یہ سنور
فَتَنْفَعَہُ الذِّکْرٰی اِلٰی مَرْفُوْعَۃٍ — جائے یا نصیحت حاصل کرے پس فائدہ پہنچائے
مُّطَهَّرَةٍ — اس کو نصیحت، مرفوعۃ مطہرۃ تک

پس انسانوں کی مساوات کی دعوت، توحید و عدل کی ان دو بنیادوں میں سے ایک کا مظہر تھی، جس پر اسلامی عمارت کا قیام ہے، نبی کریم صلعم کی اپنے صحابہ کے ساتھ مکہ مکرمہ میں اور پھر مدینہ طیبہ میں جو زندگی رہی خود اس کا قوام اور مزاج تمام اہم معاملات میں عدل کا تقاضا پورا کر تا رہا اور وہ بھی اس اہتمام اور توجہ کے ساتھ کہ عام مسلمان اس بات کا یقین کرنے لگے کہ اسلام کے بنیادی ارکان میں عدل بھی ایک رکن ہے، جس سے سرتابی اسلام سے سرتابی اور جس میں کوتاہی دین میں کوتاہی ہو گی، یہی جذبہ تھا جس نے اس وقت جب کہ خود نبی کریم صلعم غزوۂ حنین کے بعد مالِ غنیمت کی تقسیم فرما رہے تھے اور دل جوئی کی خاطر بعض عربوں کو ان کے حق سے کچھ زیادہ دے دیا تو ایک مسلمان حقیقت سے بے خبر اس پر معترض ہوا اور بول اٹھا

اعدل یا محمد فانک لم تعدل یعنے انصاف فرمایئے یہ انصاف نہیں ہے

پہلے تو آپ نے توجہ نہیں کی لیکن جب اس نے دوبارہ کہا اور پھر کہا تو آپ کے چہرۂ انور پر غصے کے آثار نمایاں ہو گئے اور آپ نے فرمایا افسوس تجھ پر اگر میں انصاف نہیں کروں گا تو پھر کون کرے گا۔

یہ دیکھ کر بعض مسلمانوں نے چاہا کہ اس کو دبوچ لیں لیکن آنحضرتؐ نے لوگوں کو اس سے باز رکھا اس لئے کہ آپ اپنے ساتھیوں کے لئے مشورے کی آزادی اور تنقید و اعتراض

کا حق تسلیم فرماتے تھے، اور پھر آپ نے یہ دل جوئی کا عمل اللہ کی وحی اور قرآن کی اجازت سے کیا تھا، سورۂ برأت میں صدقات سے بعض لوگوں کی دل جوئی کی اجازت ہے اور مصارفِ صدقات میں تالیفِ قلوب بھی ایک مصرف بتایا گیا ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے اگر مالِ غنیمت میں سے بعض عربوں کو کچھ زیادہ دے دیا تو یہ انصاف کے خلاف کوئی بات نہ تھی، آپ نے تو عدل کا تقاضا پورا کرنے میں انتہائی باریک بینی سے کام لیا ہے، حد یہ ہے کہ خود اپنی ذات تک بدلہ میں پیش کر دی ہے۔

(باقی آئندہ)

اسلامی دنیا چوتھی صدی ہجری میں

(ایک سیاح کے مشاہدات)

عراق اور اقور

جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق ایم اے

(۲)

مقدسی نے عراق کو چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) کوفہ

(۲) بصرہ

(۳) بغداد

(۴) واسط

(۵) حلوان

(۶) سامرّا

ہر حصہ کی انتظامی سرکردگی میں متعدد شہر، قصبے اور گاؤں تھے۔ پیہم لڑائیوں اور سیاسی انقلابوں سے ان میں سے اکثر کی حالت زبوں تھی۔ عراق کا تعارف کرتے ہوئے سیاح لکھتا ہے:۔

"یہ ظریفوں اور عالموں کا ملک ہے۔ یہاں کی آب و ہوا نہایت صحت بخش ہے، یہاں بڑے بڑے فقیہ، مفسر، ادیب، فیاض، دانش مند اور زاہد پیدا ہوئے لیکن اب یہ فتنوں اور گرانی کا گھر ہے اور روز بروز اس کی حالت خراب ہوتی جارہی ہے، ظلم اور بھاری ٹیکسوں کی وجہ سے لوگ مصیبت میں ہیں، پھل کم ہوگئے ہیں اور

بے حیائیاں بڑھ گئی ہیں"۔

(۱) **کوفہ** - ایک زمانہ میں یہ شہر شان وشوکت اور مدنیت میں بغداد کا مقابلہ کرتا تھا لیکن مقدسی کے وقت میں اس کی حالت خراب تھی اور شہر کے بیرونی حصے اجڑے ہوئے تھے۔ تاہم اس کے بازار اب بھی شاندار تھے۔

(۲) **بصرہ** - اس شہر عظیم کا ایک سرا صحرا سے ملتا تھا اور دوسرا دریائے فرات اور دجلہ کے دہانہ سے۔ شہر میں تین بازار تھے اور تین ہی جامع مسجدیں تھیں جن میں ایک بازار میں واقع ہوئی تھی اور اپنی وسعت اور حسنِ تعمیر کے لحاظ سے سارے عراق میں بے نظیر تھی۔ بصرہ میں گرمی کا موسم سخت ہوتا تھا ہمارے سیاح کو یہ شہر بغداد سے زیادہ پسند آیا کیوں کہ یہاں ارزانی تھی اور نیک لوگ بڑی تعداد میں آباد تھے۔[۱]

(۳) **واسط** - یہ بڑا شہر دجلہ کے مشرقی اور مغربی کناروں پر آباد تھا اور ایک بڑا پل دونوں حصوں کو ملاتا تھا۔ اس شہر کو حجاج نے عراق کے وسط میں انتظامی سہولت کی خاطر بنوایا تھا، اس کی تعمیر کرائی ہوئی جامع مسجد ہنوز موجود تھی۔ مقدسی کے وقت میں انحطاط کے آثار شہر پر پوری طرح نمایاں تھے۔ تاہم یہاں اہلِ علم اور اہلِ ادب اب بھی کافی تعداد میں موجود تھے۔ شہر میں میٹھے پانی کی افراط تھی، آب ہوا اچھی تھی اور بازار بھی دل کش تھے۔ بصرہ اور بغداد سے آنے والی کشتیاں یہاں سے گزرتی تھیں، واسط کے انتظامی دائرہ میں جو شہر اور قصبے تھے وہ سب مائل بہ زوال تھے۔[۲]

بغداد - کسی زمانہ میں یہ شہر علم، فنون، اور ادب کا مخزن اور اسلامی تمدن کا سب سے بڑا گہوارہ تھا لیکن ہمارے مصنف کے وقت میں یہ اجڑ رہا تھا یہاں کی آبادی بہت کم ہو گئی تھی اور جامع مسجد میں آبادی صرف جمعہ کے دن ہوتی تھی۔ شہر کے کچھ حصے اب بھی آباد اور خوش حال تھے جیسے کرخ اور باب الطاق، آخرالذکر محلہ کے قریب

---

[۱] مقدسی ص۱۱۷ [۲] مقدسی ص۱۱۸

عضدالدولہ بویہی نے ایک ہسپتال بنوایا تھا۔ شہر تنزل کی طرف تیزی سے گامزن تھا، مقدسی نے وہ علامتیں دیکھیں جن کی بدولت سامّرا (دوسرا عباسی پایہ تخت)، برباد ہو چکا تھا، فتنے، فسادات، جہالت، بدکرداری اور مظالم کے سیاہ بادل شہر پر چھائے ہوئے تھے [1]

(۵) سامّرا۔ اس حسین شہر کو معتصم خلیفہ عباسی نے (۲۲۷ - ۲۱۸) اپنی فتنہ پرور ترکی فوج کے لئے بنوایا تھا اور بعد میں خلیفہ متوکل نے اس کو مزید وسعت دی اور خوبصورت بنایا۔ یہ بیس میل میں پھیلا ہوا تھا اور فن تعمیر کا ایک دلکش اعجوبہ تھا اس لیے اس کا نام سُرّ من رأی (دیکھنے والے کی خوشی) پڑ گیا۔ لیکن اب سیاح لکھتا ہے "یہ بالکل اجڑ چکا ہے، آدمی دو تین میل چلا جائے لیکن کہیں اس کو عمارت یا آبادی نظر نہیں آئے گی" معتصم کو اپنے فتنہ پرور فوجی افسروں پر اعتماد نہ تھا اور اس ڈر سے کہ مبادا حج کے لئے مرکز خلافت سے دور ہو کر وہ بغاوت پر آمادہ ہو جائیں اس نے یہاں حج کے لئے کعبہ، عرفات اور منیٰ تعمیر کرائے تھے۔ شہر برباد ہونے کے بعد ساءمن رأی کہلایا (یعنی بدصورت) اور لوگ مختصراً اس کو سامرّا کہنے لگے [2]

(۶) حُلوان۔ یہ شہر عراق کی شمالی سرحد پر واقع تھا۔ اس کی آب و ہوا معتدل تھی اور کچھ حصہ پہاڑی تھا اور کچھ میدانی تھا، اس کے گرد انگور، انجیر وغیرہ کے باغوں کا ایک دل کش سلسلہ تھا۔ شہر ایک پرانے قلعہ میں آباد تھا شہر کے باہر یہودیوں کا ایک معبد تھا پتھر سے بنا ہوا جس کی بہت تعظیم کی جاتی تھی، حلوان کے دائرہ انتظام میں جو شہر تھے وہ چھوٹے اور اُجاڑ تھے [3]

حکومت:۔ فارسی بُویہی سلاطین حکمراں تھے،

ذمی: عیسائی، یہودی اور پارسی، موخر الذکر کی تعداد زیادہ تھی،

زبانیں: عربی کے مختلف لہجے رائج تھے، کوفہ کی عربی سب سے زیادہ شستہ اور

---

[1] مقدسی صفحہ ۲۰-۱۱۹ [2] مقدسی صفحہ ۲۳-۱۲۲ [3] مقدسی صفحہ ۲۴-۱۲۳

صحیح تھی۔ بغداد کی عربی بھی اچھی تھی لیکن اس میں غیر عربی عناصر آگئے تھے، بطائح (نشیبی دلدلی علاقہ جو واسط کے ماتحت تھا) میں چونکہ نبطی آبادی زیادہ تھی اس لئے وہاں کی عربی بہت خراب تھی۔[1]

تجارت

عراق کی خوش حالی کے تین سبب تھے۔

(۱) دریائے فرات اور دجلہ۔

(۲) ان کے ذریعہ ہونے والی تجارت

(۳) تجارت کے بڑے سمندر یعنی بحر ہند سے اس کا اتصال، عراق کی تجارت کا سب سے بڑا مرکز بصرہ تھا، جہاں ریشم، بابلین، ململ اور دیگر بہت سے عمدہ اصناف تجارت تیار ہوتے تھے۔ یہاں چاول کی کاشت بھی ہوتی تھی، بصرہ۔ موتی اور جواہرات کی منڈی بھی تھا، اس کے علاوہ یہاں سرمہ، زنجفر (پارہ اور گندھک کا مرکب) زنجار اور مراسنج کی بڑی صنعت تھی اور مہندی، کھجور، بنفشہ اور گلاب دور دراز ملکوں میں بھیجے جاتے تھے اس کے بندرگاہ اُبلّہ میں اعلیٰ قسم کا کپڑا جو مصری قصب کا ہم پلہ تھا بنایا جاتا تھا، کوفہ سے عمدہ بابلیتی عمامے باہر بھیجے جاتے تھے اور یہاں کا بنفشہ بہت مشہور تھا، بغداد کے بازار ہر قسم کے تفریحی اور آرائشی سامان نیز ریشم اور سوتی پارچہ کی تمام اصناف سے پُر تھے عبادان میں بہت اچھی چٹائیاں بنائی جاتی تھیں،

تجارتی اور صنعتی خصوصیات

(۱) کوفہ کا بنفشہ اور ازاذ نامی کھجوریں۔

(۲) بغداد کا محکم کپڑا، تفریحی و آرائشی سامان۔ یکائی عمامے اور تہبند۔

---

[1] مقدسی صفحہ ۱۲۸

(۳) بصرہ کی معقلی کھجوریں

(۴) حلوان کے انجیر۔

(۵) واسط کی بنیّ اور شیم مچھلی اور پردے،

(۶) نعمانیہ کا اعلیٰ کپڑا، اور خوبصورت اونی چادریں،

(۷) وصرا اور بوسیب کے رومال۔

(۸) تکریت کا اُون۔

محصولات

محصولات بھاری اور چند در چند تھے، ان میں سے کچھ قدیم تھے اور اکثر نوایجاد، محصول بری اور بحری دونوں طرح کے تھے، بصرہ میں آنے جانے والے قافلوں کا نہایت سخت اور تکلیف دہ معائنہ ہوتا تھا اور ایسا ہی معائنہ بطائح میں کیا جاتا تھا اور سامان کا سرکاری تخمینہ لگایا جاتا تھا، بصرہ کے ایک دروازہ پر قرمطی حکومت کا ٹیکس گھر تھا اور دوسرے پر بُویہی سلطان کا، دوطرفہ ٹیکس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ایک بکری پر چار درہم تک ادا کرنا پڑتا تھا، یہ دروازے دن میں صرف ایک گھنٹہ کے لئے کھولے جاتے تھے یہی نہیں وہ قافلے جو حج کر کے گھر لوٹتے اور اپنے ساتھ عربی مدبوغ چمڑا یا عربی اونٹ لاتے ان پر بھی بصرہ، کوفہ اور بغداد میں ٹیکس لیا جاتا تھا، بغداد میں ہر کجاوہ پہ جو حج کے لئے جاتا ساٹھ درہم لئے جاتے، ہر اونٹ بھر کپڑے کے بوجھ پہ سو درہم اور اونٹ بھر چھوٹے بوجھ پر پچاس درہم اور بصرہ اور کوفہ میں سو درہم وصول کئے جاتے تھے،[۱]

مذاہب

بغداد کے بڑے فرقے حنبلی اور شیعی تھے اور چھوٹے مالکی، اشعری، معتزلی اور نجاریؒ

---

[۱] مقدسی صفحہ ۱۳۴

کوفہ میں شیعی مذہب رائج تھا، صرف کناسہ کے محلہ میں سنی آباد تھے، بصرہ میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو قدری تھے یعنی ارادہ کی آزادی کے قائل تھے، بصرہ کا ایک دوسرا فرقہ جس کو عوام میں بڑی مقبولیت حاصل تھی سالمیہ تھا، اس کا بانی سُہل بن عبداللہ تستری کا غلام سالم تھا جو امام ابوحنیفہ کے فقہ کا پیرو تھا، اس فرقہ کے پیرو خود کو متکلم اور تارک الدنیا کہتے تھے، شہر کے اکثر خطیب اور واعظ اسی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے، یہ لوگ فقہی مباحث سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتے تھے اور جو لوگ رکھتے وہ امام مالک کے فقہ میں مہارت حاصل کرتے تھے، یہ لوگ مال دار اور صالح تھے لیکن ان میں ایک بری عادت یہ تھی کہ اپنے پیشواؤں کی غیر معتدل مدح سرائی کرتے تھے، چونکہ مجھ کو تارک الدنیا اور خدا پرست لوگوں سے دلچسپی ہے خواہ ان کا تعلق کسی فرقہ سے ہو میں ان لوگوں کے ساتھ بہت دن تک رہا، ان کے رازوں سے واقفیت حاصل کی اور ان کے دل میں محبت و عزت کا مقام پیدا کیا، یہ لوگ کلامی اور جدلی کتابوں کے مصنف تھے، ان کی علمی مجلسیں بلند پایہ ہوتی تھیں اور یہ لوگ اپنے کلامی مباحث بڑے شستہ اور دل کش پیرایہ میں پیش کرتے تھے، عراق کے حنبلی بڑے متعصب اور تشبیہ کے قائل تھے، معاویہؓ سے خاص عقیدت رکھتے اور ان کی تعریف میں حدیثیں بیان کرتے تھے۔ مقدسی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ واسط کی جامع مسجد میں میں نے دیکھا کہ لوگ ایک شخص کے گرد جمع ہیں، میں نے قریب جا کر دیکھا تو وہ یہ حدیث بیان کر رہا تھا: اللہ قیامت کے دن معاویہؓ کی بڑی عزت کرے گا اور اپنے برابر بٹھائے گا، اپنے ہاتھ سے ان کو دلہنوں کا لباس پہنائے گا اور اس طرح خوبصورت بنا کر ان کو دنیا والوں کے سامنے پیش کرے گا، یہ سن کر میں نے حقارت سے کہا: کیا یہ اعزاز معاویہ رضی اللہ عنہ کو حضرت علیؓ کے ساتھ لڑنے کے صلہ میں ملے گا؟ تو جھوٹا ہے اے گمراہ" ان الفاظ سے مشتعل ہو کر اس نے للکار کر کہا: "لوگو پکڑ لو اس رافضی کو، اور لوگ ہر طرف سے میری طرف دوڑے، خوش قسمتی سے ایک کاتب (دفتری اہل کار) میرا واقف

تھا اس نے مجھے بچا لیا۔ اس ملک کے اکثر فقہاء اور قاضی ابوحنیفہ کے مسلک کے پیرو تھے[1]

مذہبی جھگڑے اور تعصبات

بصرہ میں قبیلہ ربیعہ کے شیعوں اور قبیلہ سعد کے سُنیوں میں سخت عداوت تھی اور اس کا اثر قریب کے دیہاتوں تک پہنچ گیا تھا، عراق کا کوئی شہر ایسا نہ تھا جہاں فرقہ وارانہ عداوت اور تعصب نہ پایا جاتا ہو،[2]

رسومات

عراق کے لوگ عمدہ لباس اور فارسی طیلسان کے شوقین تھے، وہ زیادہ تر جوتے (چپل کی جگہ) استعمال کرتے اور بڑھیا شُروبی کپڑے پہنتے اور عماموں کے سرے پیٹھ پر کافی لمبے لٹکاتے، ان کے یہاں عورتوں کے تابوت پر اونچے اور بھدے قُبّے لگانے کا دستور تھا ہرلیسہ (کھچڑا) فروشوں کی دکانوں پر بیٹھنے کے لئے چٹائیاں، کھانا رکھنے کے لئے تپائیاں ہوتیں، ہاتھ دھونے کے لئے سلیچیوں، لوٹوں اور سرڈے کا انتظام ہوتا، اور ہرلیسہ کھانے کے لئے مختلف چٹنیاں بھی ہوتیں، خدمت کے لئے نوکر ہوتے جو شخص دکان میں بیٹھ کر ہرلیسہ کھاتا اس کو ایک دانق قیمت ادا کرنی پڑتی (بقدر ڈیڑھ آنہ) جب بنفشہ پھولتا تو لوگ اچھے اچھے کپڑے پہن کر بنفشہ کے گل دستے بازاروں سے لے کر نکلتے۔ جامع مسجدوں کے دروازوں پر وضو کرنے کی جگہیں ٹھیکہ پر اٹھادی جاتیں اور ہر وضو کرنے والے کو وضو کی کچھ قیمت ادا کرنی پڑتی تھی، یہاں کے خطیب اور مبلغ مقرر قبا پہنتے اور پٹکے باندھتے تھے، دوسرے ملکوں کے برخلاف یہاں اذان بلا ترنم دی جاتی تھی۔

---

[1] مقدسی ص ۱۲۷-۱۲۹ [2] مقدسی ص ۱۲۹-۱۳۰

أقُور

اس علاقے کے تین بڑے حصے تھے :-

(۱) دیارِ ربیعہ (قبیلۂ ربیعہ کی آبادیاں، عراق سے متصل)

(۲) دیارِ مُضر (قبیلۂ مضر کی آبادیاں)

(۳) دیارِ بکر (قبیلۂ بکر کی آبادیاں)

اس کا تعارف کرتے ہوئے سیّاح لکھتا ہے: یہ ایک عمدہ علاقہ ہے اور اس کو متعدد وجوہ سے دوسرے علاقوں پر فوقیت حاصل ہے: یہاں نبیوں اور اولیاء کے متعدد مشاہد ہیں، یہاں جُودی کا وہ تاریخی مقام ہے جہاں کہ حضرت نوحؑ کی کشتی لنگرانداز ہوئی تھی اور اس کے مسافر آباد ہوئے تھے۔ یہیں وہ ظلمات ہے جہاں ذوالقرنین سکندر داخل ہوا تھا اور یہیں سے اسلام کا مبارک دریا فرات نکلتا ہے اس کے علاوہ اقُور ایک اہم ترین اسلامی سرحد ہے اور آمِد وہ فوجی چھاؤنی ہے جہاں سے مسلمان بازنطین دشمن سے جہاد کرنے نکلتے ہیں۔ یہاں مَوصِل جیسا عظیم الشان شہر ہے اور جزیرۂ عمر جیسی خوش آیند اور صحت بخش تفریح گاہ ہے، اس کے علاوہ یہ عراق اور شام کو ایک دوسرے سے ملاتا ہے اور کئی طاقتور عرب قبیلوں کا مسکن ہے، یہاں اعلیٰ نسل کے گھوڑے بڑی تعداد میں پالے جاتے ہیں اور عراق کا اکثر غلہ یہیں سے جاتا ہے، اس علاقہ میں نیک لوگ بھی بہت ہیں، نرخ سستے ہیں اور پھلوں کی بہتات ہے[1]

خاص شہر

۱۔ مَوصِل۔ یہ دیارِ بکر کا صدر مقام اور أقور کا سب سے بڑا شہر تھا اس کا قدیم

---

[1] مقدسی ص ۱۳۶

نام خولان تھا جو عرب فتوحات کے بعد بدل کر موصل ہو گیا یہاں خوبصورت اور خوشنما قطع عمارتیں تھیں، اور آب و ہوا نہایت صحت بخش تھی، اہلِ علم وادب نے شہر کو چار چاند لگا دیئے تھے، اچھے بازاروں اور سراؤں کے علاوہ یہاں بہت سی تفریح گاہیں بھی تھیں یہاں کے پھل بہت لذیذ ہوتے تھے، حمام خوب صاف اور شاندار تھے، گوشت بہت اچھا ہوتا اور حکومت منظم تھی، بغداد کا اکثر غلہ یہاں سے جاتا تھا، مواصلات اور تجارتی راستوں کا محور تھا باایں ہمہ یہاں کے باغات دور تھے جب جنوبی ہوا چلتی تو موسم تکلیف دہ ہو جاتا اور دریا دور ہونے کی وجہ سے پانی دقت سے ملتا تھا،[1]

۲- رقہ۔ یہ دیار مضر کا صدر مقام تھا اور شام کی سرحد سے متصل دریائے فرات پر واقع تھا، یہ ایک قدیم، خوش آیند شہر تھا جہاں اچھے بازار اور باغات تھے، یہاں ہر چیز کی افراط تھی اور عمدہ قسم کا صابن اور زیتون کا تیل تیار ہوتا تھا، یہ علم وفن کا مرکز بھی تھا لیکن مضافات میں بدو عرب ڈاکو چھائے ہوئے تھے اور رہ زنی کرتے تھے،[2]

۳- آمد۔ یہ خوب صورت شہر دیار بکر کا صدر مقام تھا اور ایک مضبوط قلعہ میں واقع تھا، اس کی فوجی اہمیت بہت تھی۔ مقدسی کے خیال میں اس وقت اس سے زیادہ مستحکم اور شاندار کوئی دوسری اسلامی سرحدی چھاؤنی نہ تھی،[3]

اقور کی آب و ہوا اور رسم ورواج شام وعراق کے مماثل تھے، ملک بھر میں سب سے اچھی آب و ہوا موصل کی تھی، یہاں کے اکثر شہر پتھر سے تعمیر ہوئے تھے، اس ملک میں پارسی بالکل نہ تھے، حرّان اور رُہا صابئی مذہب کے معدن تھے، اقور میں نہ کوئی جھیل ہے نہ یہ کسی سمندر سے متصل ہے اور نہ یہاں واعظوں کو زیادہ شہرت ومنزلت حاصل ہے مجھے یاد نہیں میں نے یہاں کبھی خراب پانی پیا ہو، یا کوئی وبائی وادی دیکھی ہو، یا بدمزہ و مضر صحت کھانا کھایا ہو،[4]

---

[1] مقدسی ص۱۳۹ [2] مقدسی ص۱۴۱ [3] مقدسی ص۱۴۰ [4] مقدسی ص۱۴۲

حکومت و ذمی۔ مصنف نے حکومت اور ذمیوں کا ذکر نہیں کیا۔

زبانیں۔ چونکہ ملک کے لوگ عربی النسل تھے ان کی عربی اچھی تھی، شام کی عربی سے زیادہ صحیح اور فصیح، موصل کی زبان اقور کے سب شہروں سے بلند پایہ تھی[1]

تجارت

اقور کی تجارت خاصی تھی، سارے ملک میں موصل سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا یہاں سے ذیل کی چیزیں باہر بھیجی جاتی تھیں۔

۱۔ غلہ ۲۔ شہد ۳۔ نمک سود (خشک گوشت) ۴۔ کوئلہ ۵۔ چربی ۶۔ پنیر ۷۔ منّ (منّ و سلوی) ۸۔ انار دانے ۹۔ کوستار ۱۰۔ طریخ (ایک اعلیٰ قسم کی مچھلی) ۱۱ تانبے کے جگ ۱۲۔ چاقو ۱۳۔ تیتر ۱۴۔ لوہا ۱۵۔ زنجیریں

۲۔ سنجار (دیار ربیعہ) سے ۔ ۱۔ کاغذی بادام ۲۔ انار دانے ۳۔ نرکل ۴۔ سُماق

(۳) نصیبین (دیار ربیعہ) سے ۔ ۱۔ شاہ بلوط (پھل) ۲۔ خشک پھل ۳۔ ترازو ۴۔ قلمدان ۵۔ دوغلے گھوڑے۔

(۴) رقہ سے (دیار مضر)۔ ۱۔ صابن۔ ۲۔ زیتون کا تیل ۳۔ نیزے کے قلم

(۵) حرّان سے (دیار مضر)۔ قُبّیط مٹھائی ۲۔ شہد ۳۔ روئی ۴۔ ترازو

(۶) جزیرہ عمر سے (دیار ربیعہ) ۱۔ اخروٹ ۲۔ بادام ۳۔ گھی ۴۔ اچھی نسل کے گھوڑے۔

(۷) حسنیہ سے (دیار ربیعہ) ۱۔ پنیر ۲۔ تیتر ۳۔ چوزے ۴۔ خشک پھل ۵۔ کشمش

(۸) معلثایا سے (دیار ربیعہ) ۱۔ دودھ ۲۔ کوئلہ ۳۔ انگور ۴۔ تازے پھل ۵۔ خشک گوشت ۶۔ سَنّ

---

[1] مقدسی ص ۱۴۶

(۹) آمد سے (دیار بکر) ۱- اونی کپڑے ۲- سوتی کپڑے

تجارتی و صنعتی خصوصیات

۱- گھوڑے ۲- اون ۳- زنجیریں ۴- تسمے ۵- قُبَیط مٹھائی (حرّان) ۶- روئی (حرّان) ۷- ترازو (حرّان)

محصولات اور رسومات کا سیاح نے ذکر نہیں کیا۔

مذاہب

اقور کے لوگ زیادہ تر اہل سنت والجماعت تھے، حنفیوں اور شافعیوں کے علاوہ یہاں کوئی دوسرا فرقہ قیاس ورأی کی طرف مائل نہ تھا۔ اس علاقہ میں حنبلی اور شیعہ مذاہب بھی موجود تھے لیکن خوش قسمتی سے فرقہ وارانہ جھگڑے اور مذہبی عداوتیں مفقود تھیں، یہاں کے فقراء کلامی اور اختلافی مباحث سے دلچسپی نہ رکھتے تھے۔

لہ مقدسی ص ۱۴۲

تاج محل آگرہ

از

(جناب ڈاکٹر محمد عبداللہ صاحب چغتائی)

"حال ہی میں ہندوستان گورنمنٹ نے پبلک کی اطلاع کے لئے یہ نشر کیا ہے کہ کئی سالوں کی لگاتار کوشش کے بعد تاج محل آگرہ کی مرمت مکمل ہو گئی ہے اور اب اس میں کسی قسم کا نقص وغیرہ نہیں رہا اور عنقریب گورنمنٹ اس کی تین سو سالہ برسی منائے گی، یہ خبر بہت مسرت کا باعث ہے پاکستان بننے سے پیشتر میرے پونہ میں قیام کے زمانہ میں ہندوستان گورنمنٹ کی سنٹرل پی ڈبلیو ڈی کے محکمہ کے انجنیر اعلیٰ جناب خان بہادر محمد سلیمان صاحب نے راقم کی مطبوعہ فرنچ زبان کی کتاب "تاج" کو طلب کیا تھا اور چند امور استفسار کئے، میں نے آپ کے جواب میں فوراً جو میری ذاتی معلومات تھیں بہم پہنچائیں اور کتاب مطلوبہ بھی ارسال کر دی تھی اسی طرح پونہ کے انجنیرنگ کالج کے اسٹاف میں سے ماہرین مسٹر گپ جپ۔ مسٹر گوشی وغیرہ جب خان بہادر محمد دین انجنیر کے ایماء پر آگرہ جانے لگے تب بھی انھوں نے مجھ سے مشورہ کیا تھا۔ واضح رہے کہ تاج کے گنبد میں جو نقص بیان کیا جاتا تھا اس کا حوالہ اورنگ زیب کے خط کتابت میں بھی ملتا ہے جو اس نے اپنے والد شاہ جہاں کو اس کی زیارت کرنے کے بعد لکھا ہے جب کہ تاج اس سے تھوڑا عرصہ پہلے تعمیر ہو چکا تھا۔

میں نے تاج محل آگرہ کو ثقافتِ اسلامی کا بہت بڑا شاہکار تصور کرتے ہوئے اس پر جو تحقیقی مقالہ لکھا وہ بصورت مبسوط مصور کتاب ہرسل (بلجیم) فرنچ زبان میں ۱۹۳۸ء میں طبع ہو چکا ہے جس میں قریب دو سو صفحات اور قریب ایک سو ضروری تصاویر بھی ہیں، چونکہ آج

یہاں طباعت کی بے شمار دقتیں ہیں اس لئے اب تک اسے اردو یا انگریزی زبان میں پیش نہیں کر سکا حالانکہ ہر دو بالکل تیار ہیں۔ احباب کا شکر گذار ہوں کہ ان کا تقاضا برابر جاری ہے توقع ہے کہ عنقریب شایع ہو جائیں گی بہر حال میں ذیل میں چند سطور بطور تمہید تاج کی تین سو سالہ برسی کے موقع پر اپنی تحقیقات کا لُبِّ لباب پیش کرتا ہوں، تاج ۱۰۴۱ھ سے شروع ہو کر ۱۰۵۷ھ میں اختتام کو پہنچا یعنی کچھ سال اوپر تین سو سال آج تعمیر تاج کو گذر چکے ہیں اس لئے میں بھی ہندوستان کے جشن تین سو سالہ میں اس مختصر مقالہ ذیل بعنوان "تاج محل آگرہ" ہدیہ ناظرین کرنا فرض سمجھتا ہوں۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ تاج محل آگرہ اپنی بے مثال تعمیری خوبیوں کی وجہ سے عجائبات عالم میں شمار ہوتا ہے اور انھیں خوبیوں کی بنا پر بہت سی غلط فہمیاں بھی اس کے متعلق پیدا ہو گئی ہیں، افسوس اس امر کا ہے کہ صحیح تحقیق سے کام نہیں لیا گیا اور اصل ماخذ سے رو گردانی کی گئی ہے۔

سب سے پہلے لفظ تاج کے متعلق عرض ہے کہ یہ دراصل لفظ ممتاز کی بگڑی شکل ہے جس کا آغاز زیادہ تر گذشتہ صدی سے ہوتا ہے ورنہ اسے روضہ ممتاز محل کہنا بجا ہوگا، ارجمند بانو بیگم جس کا خطاب ممتاز محل تھا شاہجہاں بادشاہ کی چہیتی بیوی تھی جو نور جہاں کے بھائی آصف خاں کی بیٹی تھی۔ اس کا انتقال ۱۰۴۰ھ میں بمقام برہان پور ہوا اور اس کی نعش کو آگرہ میں لایا گیا جہاں اس کے روضہ کی تعمیر جمنا ندی کے کنارے ۱۰۴۱ھ میں شروع ہوئی اور ۱۰۵۷ھ میں مکمل ہوئی۔

ہندوستان میں فنِ تعمیر خاص کر شاہجہاں کے زمانہ میں ہر اعتبار سے اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گیا تھا اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ خود بادشاہ مذکور کو بچپنے سے تعمیر کا بڑا شوق تھا، فنِ تعمیر اس کے لئے طبیعت ثانیہ بن گیا تھا۔ جہانگیر نے خود اپنی اکثر عمارات شہزادہ خرم (بعد میں شاہ جہاں)، کے زیر اہتمام تعمیر کرائیں جیسا کہ باغ شالامار کشمیر وغیرہ۔ مورخین نے جہاں

شاہ جہاں کے اوقات کاروبار روزمرہ کی تقسیم کا ذکر کیا ہے وہاں اس کے عمارات کے نقشے طیار کرانے اور ان میں اس کی گہری دلچسپی کا بھی خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے ان میں ترمیم اور اصلاح کرتا یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بعض عمارات کو اپنی مرضی یا نقشہ کے خلاف تعمیر ہوتا دیکھ کر گروا دیا اور از سر نو نقشہ اور ہدایت کے مطابق تعمیر کرایا جس سے ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ وہ خود بڑا ماہر عمارات تھا۔

قدسی شاعر دربار شاہجہاں لکھتا ہے ؎

عمارات را جملہ برداشتند ۔ منازل در آنجا برافراشتند

ہمہ طرحہا زادۂ طبع شاہ ۔ پژوہ بآں ہوشش راہ

حکیم مہندس شہنشاہ دہر ۔ دقیقہ رس دور سرش بہر

بادشاہ نامہ میں شاہجہانی عمارات کی تعمیر کا ذکر بالتفصیل ملتا ہے مگر تاج محل کے تعلق میں یہ بیان کہیں نہیں ملتا کہ اس کا معمار کون تھا، ہاں یہ درست ہے کہ ۱۰۵۳ھ کے بیان میں مورخین نے اس روضہ کی مستقل تفصیل دی ہے جو آج بھی درست تحقیق ہے اس بیان میں دو نام میر عبدالکریم اور مکرمت خاں ملتے ہیں جن کے زیر اہتمام یہ روضہ تعمیر ہوا ادھر تاج کے گنبد کے اندر امانت خاں شیرازی کا نام ملتا ہے جس نے خط نسخ میں کتبات، جو آیات قرآنی پر مشتمل ہیں اسی نے لکھے ہیں جیسا کہ الفاظ عبارت سے بھی واضح ہے، بادشاہ نامہ میں مذکور ہے کہ جب ۱۰۴۸ھ میں دہلی میں شاہ جہاں نے لال قلعہ اور نئے شہر شاہجہاں آباد کی بنا رکھی ان کی تعمیر کا کام احمد اور حامد دو معماروں کے حوالے غیرت خاں کی زیر نگرانی کیا جو اس زمانہ میں اپنے فن میں یکتا تھے اور ان عمارات کا بھی میر عمارت مکرمت خاں شیرازی تھا اس لئے ہمیں اس موقع پر واضح کر دینا چاہیے کہ اگر ان دو معماروں احمد و حامد کا تعلق تاج کی تعمیر سے بھی تھا تو بادشاہ نامہ میں بالضرور تاج کے بیان میں ان کا بھی ذکر ملتا ہر دو بادشاہ نامہ اور عمل صالح شاہ جہاں کے عہد کی مستند تاریخوں میں ان کا ذکر

نہیں ملتا اگرچہ احمد معمار کے فرزند لطف اللہ مہندس نے اپنے اشعار میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ روضہ ممتاز محل میرے باپ نے تعمیر کیا تھا مگر اس کی تصدیق کسی اور شہادت سے نہیں ہوتی

ایک مغربی سیاح پادری منیرق ہندوستان میں تاج کی تعمیر کے وقت سیاحت کر رہا تھا اس نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ مجھ سے پادری ڈی کاسٹرو نے قیام لاہور کے زمانہ میں بیان کیا کہ روضہ ممتاز محل کا معمار ایک اطالوی وینس کا باشندہ جیرونیمو ویرونیو تھا مگر اس کی تصدیق کسی دیگر تاریخی شہادت وغیرہ سے نہیں ہوتی یہ ضرور ملتا ہے کہ یہی جیرونیمو ویرونیو ہگلی کلکتہ کی لڑائی میں شاہ جہاں کے خلاف پرتگالیوں کا مددگار تھا بعض اسے جوہری بھی کہتے ہیں مگر اس کے معمار ہونے کے متعلق کہیں کوئی روایت نہیں ملتی، بے شک اس کی قبر آگرہ میں موجود ہے۔ اسی طرح ایک اور فرانسیسی موسیو آسٹن ڈی بورڈو کے متعلق بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اسی نے تاج تعمیر کیا اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ شخص ہندوستان میں جہانگیر کے زمانہ میں شاہی ملازمت میں تھا اور تزک جہانگیری میں موجود ہے کہ اس کو اپنی کارکردگی کی وجہ سے ہنرمند کا لقب بھی دیا گیا تھا جب شاہ جہاں کا زمانہ آیا تو دربار سے اس کے تعلقات بدستور قائم رہے بلکہ بادشاہ نے ایک مرتبہ سفارت پر پرتگالیوں کے پاس بھی بھیجا تھا مگر انھوں نے اسے ہلاک کر ڈالا اور یہ واقعہ ممتاز محل کی وفات سے قبل وقوع میں آتا ہے اس لئے محال ہے کہ تاج کی تعمیر سے اس کا تعلق رہا ہو جب تاج زیر تعمیر تھا اتفاق سے بہت سے یورپین سیاح ہندوستان میں موجود تھے جن میں دو سیاح برنیر اور ٹیورنیر فرانسیسی قابل ذکر ہیں ان کے سفرنامے بھی طبع ہو چکے ہیں اور دونوں اس کی تعمیر کا ذکر کرتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ یہ کامل طور پر مشرقی عمارت ہے جس کی نظیر یورپ میں بھی نہیں اگر کوئی یوروپین ماہر تاج کی تعمیر پر مقرر ہوتا تو یہ لوگ ضرور ذکر کرتے۔

گذشتہ صدی سے ہمارے سامنے ایک استاذ عیسیٰ کا نام پیش کیا جاتا ہے کہ اس

نے تاج تعمیر کیا اور نقشہ بنایا، اس کا نام دراصل ایک گائڈ میں ملتا ہے جو آگرہ کالج کے طلبا نے ۲۶-۱۸۲۵ء میں تیار کی تھی اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے ایک شخص مانک چند نامی اس کا مصنف ہے جو آگرہ کالج کا ایک طالب علم تھا اور اس کے بے شمار قلمی نسخے قریب قریب ہر لائبریری میں موجود ہیں، راقم کے پاس بھی چھ سات ہیں، برٹش میوزیم کے نسخہ سے صاف ظاہر ہے کہ یہ رسالہ آگرہ کے مجسٹریٹ مسٹر لسننگٹن

کے ایک اشتہار کے جواب میں تالیف ہوا تھا جس کے مخاطب طلبار آگرہ کالج تھے مگر اس کو عہد شاہ جہانی سے کوئی تعلق نہیں اس میں کاریگروں کی فہرست میں ایک استاد عیسیٰ کا نام بھی ملتا ہے، نہ معلوم اس کی ابتدا کیسے ہوئی یہ نسخہ جس قدر مشہور ہے اسی قدر ناقابل اعتبار ہے یورپین مصنفین نے اس استاد عیسیٰ نام کا اس رسالہ کو ترجمہ کرتے وقت ایک "کرسچین" لکھا ہے ۔ مجھے ایک نسخہ متعلقہ تاج پیرس کے کتب خانہ ملی میں ملا جس میں روضہ کی پیمائش اور مصارف درج ہیں یہ نسخہ قدیم اور صحیح معلوم ہوتا ہے اس لئے میں نے اسے الگ شائع کر دیا ہے اس کی تاریخ کتابت اخیر میں "ماہ ربیع الاول ۱۰۸۰ھ" کا لکھا ہوا ہے اور یہ دراصل تمام روضہ ممتاز محل کی تفصیلی یادداشت ہے جو بعد تیاری روضہ کے تیار کی گئی ہے اور یہی اس سے واضح بھی ہے۔

ان تمام حالات کے بیان کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر تاج محل کس نے تعمیر کیا اور اس کا نقشہ کس نے بنایا، میں اپنی تحقیقات کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس کا معمار شاہ جہاں بذات خود ہے جو اپنی بیوی کا روضہ اپنی مرضی کے مطابق تیار کرا سکتا تھا۔ جب کہ وہ خود بہت بڑا ماہر تعمیر تھا جیسا کہ تاریخ عہد میں ملتا ہے۔

تاج کے نقش و نگار کی طرز پر جیں کاری پر بھی حملہ کیا جاتا ہے کہ یہ اطالوی الاصل ہے جو سراسر غلط ہے، واضح رہے کہ مسلمانوں نے اپنی عمارات کو ابتدا سے ہی نقش و نگار سے مزین کیا ہے بالخصوص اس قسم کے نقش و نگار جو پتھر کی سطح پر کھود کر رنگین پتھر کاٹ کر

بھر دیے جاتے ہیں ہندوستان میں سب سے اول اس قسم کے نقش و نگار احمد آباد کی جامع مسجد مانک چوک کے محراب میں ملتے ہیں جو ۱۴۱۴ء میں تعمیر ہوئی تھی اور اس کے بعد ہیں سلطان ہوشنگ غوری کا روضہ (۱۴۳۵ء) مانڈو ہے جسے سرجان مارشل نے بھی تاج کی پرچیں کاری کو خالص مسلمانوں کا فن ثابت کرنے کے لئے پیش کیا ہے غرض کہ یورپ میں یہ طرز فن بنام پیتیرا ڈورا سولھویں صدی عیسوی یعنے بہت بعد کی رائج شدہ ہے۔

تاج محل میں جو چیز زیادہ دل کش ہے وہ اس کی ہمہ گیر موزونیت اور منظم پن ہے جو زیادہ اس کے امرودی گنبد نے پیدا کی ہے جس کی مثال دنیا بھر کے عمارات میں نہیں ہے پھر اندرون تعمیر میں یہ گنبد دُہرا ہے یعنی اس بیرونی گنبد کے اندر ایک اور گنبد ہے اسی عمارت تاج میں زیر زمیں سردانہ ہے جو قبر ممتاز الزمانی کا صحیح مقام ہے اگر ذرا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ ہر دو امور — دہرا ملیب نما گنبد اور زیر زمیں سردانہ برائے قبر جو مغلوں نے اپنی شہزادیوں کی قبور کے لئے مخصوص کر دیا تھا سمرقند سے روضۂ تیمور جسے گور امیر کہتے ہیں آئے ہیں) کے نقش قدم پر ہی یہ گور امیر دراصل تیمور نے خود اپنی زوجہ بی بی خانم کے لئے اول تعمیر کیا تھا جس میں وہ بعد میں خود دفن ہوا۔

غرض کہ تاج محل اپنی تمام تعمیری اور فنی خوبیوں کی وجہ سے دنیا بھر میں عجائباتِ روزگار میں شمار ہوتا ہے اور دنیا کی عمارات میں بالکل ایک الگ درجہ رکھتا ہے اور میرے نزدیک ثقافتِ اسلامی کا مظہر بھی ہے۔ اور جس طرح اسے دنیا بھر میں ایک خاص حیثیت حاصل ہے اسی طرح اس کے متعلق ان کی وجہ سے اس کے گرد کئی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں جن کا ازالہ ضرور ایک مشکل امر ہے تاہم راقم نے اپنی کتاب تاج محل میں جو عنقریب شائع ہو رہی ہے تمام امور کو بالصراحت بیان کرنے اور وضاحت کی کوشش کی ہے اور ساتھ ساتھ کتاب کو ضروری اور اہم تصاویر سے مصور بھی کیا ہے۔

غذا اور سائنس

از

(جناب محمد احسن جلیلی صاحب ایم - اے ایل ایل بی)

دنیا کی آبادی اوسطاً ۲ ۱/۲ کروڑ فی سال یا ساٹھ ہزار فی دن کی رفتار سے بڑھ رہی ہے اور یہ مسئلہ کہ دنیا کی غذائی پیداوار موجودہ آبادی کے لئے کافی ہے یا نہیں یا ہم ہیں بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے غذائی پیداوار کو بھی نسبتاً بڑھانے کی صلاحیت ہے یا نہیں آج کل بہت وسیع پیمانہ پر زیر بحث ہے - اس بحث میں حصہ لینے والوں میں سے ایک فرقہ (maltha s) کے پیروں کا ہے جن کا خیال ہے کہ دنیا غذائی پیداوار کی بہ نسبت سے زائد آباد ہے اور اگر اس بڑھتی ہوئی آبادی کا معقول انسداد نہ کیا گیا تو یقینی آبادی کا ایک حصہ بھوکوں مر جائے گا - اس قنوطی فرقے کا یہ بھی خیال ہے کہ دنیا کی غذائی پیداوار اس رفتار سے نہیں بڑھائی جا سکتی کہ وہ بڑھتی ہوئی آبادی کا ساتھ دے سکے لہذا ان کی یہ رائے ہے کہ غذائی بحران کا حل نہ صرف یہ ہے کہ آبادی کی تیز افزائش روک دی جائے بلکہ آبادی کا زائد حصہ ہی ختم کر دیا جائے تاکہ بقیہ لوگ آرام و سکون سے زندگی گذار سکیں - اس کے برعکس دوسرا فرقہ رجائیوں کا ہے جس میں سائنسداں بھی شامل ہیں - ماہرین اقتصادیات و زراعت (Economist + Agro - ...) کا خیال ہے کہ موجودہ سائنس کی مدد سے انسان میں نیچر پر قابو پانے کی صلاحیت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ دنیا نہ صرف موجودہ آبادی کا پیٹ بھر سکتی ہے بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے غذا کی بہتات کا یقین بھی دلا سکتی ہے۔ پروفیسر ڈڈلے اسٹیمپ (Prof. Dudley Stamp) اپنے ایک مضمون میں جو (Rural India) میں شائع ہوا لکھتے ہیں "سائنس کی مدد سے اب ہم جہاں

گھاس کی ایک پتی اگتی تھی وہاں دو اگانا۔ فی ایکڑ زیادہ پیداوار حاصل کرنا۔ مختلف کیڑے مکوڑوں اور نباتاتی امراض پر قابو پایا۔ فصل پکنے سے قبل اس کو مختلف چڑیوں۔ چوہوں اور چوہیوں سے بچانا اور زراعت کے جانوروں کو مختلف امراض سے محفوظ رکھنا سیکھ رہے ہیں مگر ہنوز سائنس نسلِ انسانی کی افزائش کا ساتھ نہیں دے رہی ہے"۔ یہ ہے سائنس کے کرشموں کا اعتراف جو کہ ایک عظیم ہستی نے اس چیز کے متعلق کیا جس کے لئے ہمارے آباء واجداد اس طرح فخریہ نہیں کہہ سکتے تھے۔ مگر اس حوالہ کے آخری جملہ سے ایک قسم کی قنوطیت اور مستقبل کے متعلق ایک خوف کا اظہار ہوتا ہے۔ ہمیں یہی دیکھنا ہے کہ یہ خوف کہاں تک درست ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم زراعت کے میدان میں سائنس کے اصولوں کی جانچ کریں اور نہ صرف اتنا ہی بلکہ سائنس آئندہ کیا کر سکتی ہے اس کا بھی اندازہ لگائیں۔ ہمیں مختلف ترقی یافتہ ممالک کی اسکیموں کی جانچ کرنی ہوگی اور یہ دیکھنا ہوگا کہ ان سے مستقبل کے متعلق کیا کیا پیشین گوئیاں ہو سکتی ہیں۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں کہ مختلف ممالک میں زراعت کے میدان میں سائنس نے جو کچھ کیا ہم اس کی مکمل فہرست بنائیں بلکہ چند اصولوں پر اور مستقبل کے امکانات پر ہی ہمارا غور کر لینا کافی ہے۔

چنانچہ مملکت روس میں نظریہ مالتھوز (Mathusian Theory) کو پہلی مرتبہ غلط ثابت کیا گیا ہے اور وہاں اس کو عرصہ ہوا لوگ بھول چکے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ملک میں جہاں شرح پیدائش تمام دیگر ممالک سے زیادہ ہے غذا کی پیداوار اس سے بھی کہیں زائد ہے۔ اس ملک میں لوگ مستقبل سے خوفزدہ نہیں ہیں لہذا وہاں بجائے بڑھتی ہوئی پیدائش کی رفتار کو روکنے کے ماؤں کی ہمت افزائی کی جاتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کریں۔ چنانچہ ایک مقررہ تعداد تک کسی ماں کے اگر بچے پیدا ہو جائیں تو اسے مدر ہیروئن (Mother Heroine) کا خطاب ملتا ہے۔ علاوہ

ازیں حکومت کی طرف سے بچوں کی تعداد کے مطابق ان کی امداد بھی کی جاتی ہے۔

روس میں اناج کی پیداوار ۱۹۱۸ء میں چھ کروڑ پچاس لاکھ ٹن تھی اور آج وہی پیداوار تقریباً گیارہ کروڑ پچاس لاکھ ٹن ہے۔ اور یہ حقیقت سب پر عیاں ہے کہ روس نہ صرف اپنی کل آبادی کا پیٹ بھرتا ہے بلکہ دیگر ممالک کو بھی اناج فروخت کرتا ہے مگر یہ سب کیسے حاصل ہوا؟ یقینی محض سائنس کی مدد سے۔ نئی نباتاتی سائنس کا موجد (I.V. Michurin) جو روس کا ہی سائنس داں ہے کہتا ہے کہ "ہم نیچر کی طرفداری کا انتظار نہیں کر سکتے ہمارا کام اس کو اپنی ضرورت کے مطابق موڑ لینا ہے۔" یہی وہ ذہنی کیفیت تھی جس نے نیچر کو روسی لوگوں کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیا N. Plavilschikov نے اپنے مضمون out standing Discoveries in Agricultural science in U.S.S.R. جو کہ بمبئی کے ایک رسالے "Agricultural Economist" میں شایع ہوا تھا لکھا ہے روس کی زراعتی سائنس جس نے پیداوار کے بڑھانے میں وہ مدد کی جو کبھی نہ سنی گئی تھی دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ سائنس ہے...... روس کے کسان اور سائنسداں نیچر کی طرفداری کا انتظار نہیں کرتے اور نہ وہ ان کی خیرات پر بسر کرتے ہیں بلکہ وہ جو کچھ چاہتے ہیں نیچر سے لے لیتے ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ نیچر سے مانگتے ہیں اور اسے اپنا سب کچھ دے دینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ سرزمین روس میں نیچر پر قابو رکھا جاتا ہے اور ضرورت کے مطابق اس میں تبدیلیاں بھی کی جاتی ہیں" بے شبہ وہاں نیچر میں اس قدر تبدیلیاں کی گئی ہیں کہ نئے نئے قسم کے پودے اور نئے نئے قسم کے جانور جو نہ کبھی دیکھے نہ سنے گئے تھے وہاں پیدا کئے جاتے ہیں یہ سب اسی وقت ممکن ہوا جب روسیوں نے میچورین اور لائسنکو (Michurin & Lysenko) کے نظریات کو عملی جامہ پہنایا۔ انھوں نے سکھایا تھا کہ "انسان نئے پودے اور نئے جانور پیدا

کرسکتا ہے اور اسے پیدا کرنے بھی چاہئیں بلکہ ان سے بھی بہتر جو قدرت نے پیدا کئے ہیں"
آج کل سائنس دانوں کی ایک بڑی تعداد پچاس سے زائد پلانٹ فیکٹریوں Plant
(factories) میں انہی نامورانِ سائنس کے نظریات پر تحقیقات کرنے میں مشغول ہے
اور انھیں عملی جامہ پہنا رہی ہے۔ ان کی تحقیقات کی مدد سے آج روسی لوگ سو سنٹرس
(Centners) فی ہیکٹر (Hectare) گندم پیدا کر رہے ہیں اس سے قبل گندم کی
اتنی اچھی فصل کہیں نہیں سنی گئی تھی۔ پہلے اکثر فصلیں کہرے اور تمازتِ آفتاب سے خراب
ہوجایا کرتی تھیں اور قدرت کے ان ہتھیاروں کا مقابلہ نہ کرپاتی تھیں مگر اب کچھ ایسی
بھی فصلیں وہاں ہوتی ہیں جو ان چیزوں کا مقابلہ کرتی ہیں مثلاً روسیوں نے ایک قسم
کا گیہوں پیدا کیا ہے (جو گندم اور ایک گھاس کی ملاوٹ سے پیدا کیا جاتا ہے) جس
کی فصلیں پہلی مرتبہ بونے کے بعد مسلسل تین سال تک ہوتی رہتی ہیں یا وہاں سٹیب
کی ایک بیل ہوتی ہے جس کی شاخیں اوپر نہیں چڑھتیں بلکہ زمین پر ہی پھیلتی ہیں اور ان
کو برف کی ایک موٹی تہہ ڈھانک لیتی ہے اور اس طرح وہ موسم سرما کے کہرے سے
محفوظ رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی نئی ایجادات ہیں مثلاً نئی نئی اقسام کے گلاب
اور دیگر پھولوں کے پودے۔ نئی نئی اقسام کے ربر کے درخت اور رنگین روئی
(Coloured Cotton) علاوہ ازیں کچھ نئی اقسام کے جانور بھی پیدا کئے ہیں جو مختلف
مقامات اور مختلف آب وہوا میں کار آمد ہیں۔ گایوں سے وہ لوگ ۶۲۶۲ لیٹرس
(metres) دودھ نکال لیتے ہیں۔

باایں ہمہ جو کچھ اہل روس نے اب تک کیا وہ ان کے شاندار مستقبل کے مقابلہ میں
کچھ بھی نہیں۔ حال ہی میں حکومت روس نے ایک نئی اسکیم نیچر پر مزید قابو حاصل
کرنے کے لئے پیش کی ہے۔ اس اسکیم میں قطع نظر کئی دیگر چیزوں کے پانچ آبپاشی کے
ذرائع کی تعمیر ہے۔ ان پر برابر کام ہورہا ہے اور ان سے بہت کچھ فائدہ بھی اٹھایا جاچکا ہے

ان عظیم تعمیرات کا ذکر ڈاکٹر ایس۔ایم مینٹن (S.M. Menton)
(برطانیہ کے بین الاقوامی شہرت یافتہ سائنسداں) نے روس کی سیاحت کے بعد
کیا ہے۔آیئے ہم بھی ان پر ایک نظر دوڑالیں۔

۱۔ان میں سے ایک والگا ڈان کینال ہے (Volga Don Canal) جس کی
تکمیل جولائی ۱۹۵۲ء میں ہوئی ہے اور جس نے ماسکو کو "پانچ سمندروں کا ساحل" بنا
دیا ہے۔یہ تریسٹھ ۶۳ میل لمبی نہر جس میں کہ ۱۳ جہاز رانی کے باندھ۔کئی زبردست ڈام
(Dam) گھاٹ اور Tsimlyanskaya بجلی کا اسٹیشن (جو کہ ۱۲۵ میل لمبی اور
۲۵ میل چوڑی ایک مصنوعی جھیل پر واقع ہے) کل تین سال کے قلیل عرصہ میں مکمل
ہوئی تھی۔اگرچہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں مساوری (Missouri) پر واقع فورٹ
پیکس ڈام (Fort Peck Dam) کو دنیا کا سب سے بڑا ڈام تصور کیا جاتا
تھا مگر Tsimlyanskaya پر واقع ڈام اس سے دگنا بڑا ہے

۲۔مین ترکمانین کینال (Main Turkmenian) جو کہ ۶۳۰ میل لمبی ہوگی
زیر تعمیر ہے اور یہ ۱۹۵۷ء تک مکمل ہو جائے گی۔وسط ایشیا میں جمہوریت ترکمانی ۸۰
فی صدی صحرائے کاراکم (جو کہ دنیا کے سب سے بڑے ریگستانوں میں سے ہے) سے
گھرا ہوا ہے۔اس خطے کی آب وہوا گرم ہے اور وہاں پانی کی بہت قلت ہے لہذا
بہت غیر آباد بھی ہے۔صحرائے کاراکم کے درمیان سے نہر نکالنے میں وہاں کاشت کرنے
کی صورت پیدا ہو سکے گی۔اس نہر میں دریائے امو (Amu) کا پانی آئے گا۔یہ نہر دنیا
کی سب سے بڑی نہر ہوگی اور امید کی جاتی ہے کہ وہ اس ریگستانی علاقہ کو زرخیز بنا
دے گی صحرائے کاراکم کے تقریباً ۷۰ لاکھ ہکٹر (Hectares) حصہ کی آبیاشی چراگاہ بنانے
کے لئے کی جائے گی اور تیرہ لاکھ ہکٹر روئی کی پیداوار کے لئے۔اس اسکیم کے ماتحت
مستقبل قریب میں چھوٹی چھوٹی دیگر نہروں ڈام اور بجلی کے اسٹیشنوں کا ایک جال

ہو جائے گا جو کہ اس عظیم ریگستان کو کاشتکاری کے لایق اور ایک اچھی چراگاہ بنا دے گا۔

(۳ و ۴) ان دو اسکیموں کے ذریعہ روسی دو زبردست بجلی کے اسٹیشن (جن کے نام Stalingrad اور Kuibyshev اسٹیشن ہوں گے) تعمیر کئے جائیں گے یہ دونوں اسٹیشن امریکہ کے گرانڈ کاؤلی (Grand Coulee) (جو کہ موجودہ زمانے کا سب سے بڑا بجلی کا اسٹیشن ہے) سے کہیں بڑے ہوں گے۔ ان میں سے ایک ۱۹۵۵ء اور دوسرا ۱۹۵۶ء تک تیار ہو جائے گا۔ یہ دو کروڑ K.W.H بجلی پیدا کریں گے اور ۴۰ لاکھ ہکٹر زمین کی آبپاشی کریں گے۔

(۵) پانچویں اسکیم کریمیا کی نہروں کا ایک جال ہے جو تقریباً ۵۰ میل کی ہیں اور یہ نہریں ۳۰ لاکھ ہکٹر زمین کی آبپاشی کریں گی۔

یہ تمام بجلی کے اسٹیشن اندازاً بائیس ہزار K.W.H سالانہ بجلی پیدا کریں گے اتنی بجلی ڈنمارک۔ فن لینڈ۔ ہالینڈ۔ بلجیم اور اسپین کے تمام اسٹیشن مل کر پیدا کرتے ہیں۔ ان نئی تعمیرات سے جتنی آبپاشی ہو سکے گی اس کے متعلق ڈاکٹر منیٹن Manton بیان کہتے ہیں "روس میں ۷۰۰ لاکھ ایکڑ زمین کی آبپاشی کی جائے گی جو کہ وادی نیل کی آبپاشی شدہ خطہ سے نو گنا زائد ہے۔ یہ خطہ ۱۰ کروڑ انسانوں کے لئے کافی غذا پیدا کرے گا۔ کناڈا سے زیادہ گیہوں اور مصر و پاکستان سے زیادہ روئی یہاں پیدا ہو گی" اس خطہ کے کچھ حصوں میں گیہوں کی دو دو فصلیں ہر سال ہوا کریں گی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک اور اسکیم زیر غور ہے جس کے ذریعہ دریائے اوب (Ob) اور دریائے ینیسی (Yenisei) کے پانی کا رخ جنوب کی طرف موڑ دیا جائے گا۔ یہ پانی ۲۵۰۰ میل تک سفر کر کے وسط ایشیا کے ریگستان کو زرخیز خطوں میں تبدیل کر دے گا ڈاکٹر منیٹن کہتے ہیں "یہ ۶۲۰ لاکھ ایکڑ زمین کو کاشت کے لائق بنا سکے گا اور ۸۷۰ لاکھ زمین چراگاہوں کے لئے ۔ ۔ ۔ وسط ایشیا کے ممالک بجائے دو کروڑ کے اب بارہ

کروڑ انسانوں کے لئے غذا پیدا کریں گے"۔

ان تمام حالات سے ہم کیا نتیجہ نکال سکتے ہیں؟ یہی کہ مملکت روس پانچ دس سال کے اندر زائد بیس کروڑ انسانوں کے لئے غذا پیدا کرنے کا انتظام کر رہا ہے اور یہی کہ روس کل دنیا کی ایک رقبہ میں بڑھنے والی آبادی یعنی بیس کروڑ انسانوں کو غذا مہیا کر سکے گا ان امید افزا حالات کے ہوتے ہوتے ایک قنوطی ہی مستقبل سے خوف زدہ ہو سکتا ہے۔

ایک وہ بھی زمانہ تھا جب پچاس میل لمبی نہر پناما ۲۵ سال میں تیار ہوئی تھی اور روس میں اب ۶۳ میل لمبی والگا ڈان نہر مع ۱۲۵ میل لمبی اور ۲۵ میل چوڑی مصنوعی جھیل کے، صرف تین سال کے اندر تیار ہو گئی اور ۶۳۰ میل لمبی ترکمانین نہر سات سال کے اندر تیار ہو جائے گی۔ یہ ہیں موجودہ سائنس کے کرشمے۔ بغیر موجودہ سائنس کی امداد کے اتنے قلیل عرصہ میں اتنی بڑی تعمیرات کی تکمیل سوچی بھی نہیں جا سکتی تھی۔ سائنس کی مدد سے روسیوں نے اتنی زبردست زمین کھودنے والی مشین بنائی ہے جو سات ہزار سے دس ہزار مزدوروں کا کام دیتی ہے اور suction drudge اتنا کام کرتا ہے جتنا ۲۵ ہزار آدمی یا ۱۵ ہزار گھوڑے کر سکتے ہیں۔ انہی مشینوں کے ذریعہ روسیوں نے نیچر پر قابو پایا ہے تاکہ انسان کی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔

روس کے موجودہ پنج سالہ پلان (۱۹۵۵ - ۱۹۵۰) کے مطابق ۱۹۵۵ء میں ۱۹۵۰ء کے مقابلہ پر کل غلہ کی پیداوار ۴۰ سے ۵۰ فی صدی۔ گوشت کی ۸۰ سے ۹۰ فی صدی۔ دودھ کی ۴۵ سے ۵۰ فی صدی مچھلی کی ۵۸ فی صدی مکھن کی ۷۲ فی صدی اور انڈے کی ۵۰۰ فی صدی بڑھ جائے گی اور اس پانچ سال کے عرصہ میں قومی آمدنی ۶۰ فی صدی بڑھ جائے گی۔ سوچئے کہ اس رفتار سے موجودہ زمانے میں پیداوار بڑھائی جا سکتی ہے ان حالات کو دیکھتے ہوئے مالتھوز کا نظریہ اب بے کار معلوم ہوتا ہے۔ یہ حالات اس نظریہ کو جھٹلانے اور غلط ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ اس کو بالکل بھلا دیا جائے

سائنس نے دکھا دیا ہے کہ انسان نیچر کا غلام نہیں بلکہ آقا ہے۔

چین چند سال قبل قحط سالی کے لئے مشہور تھا اور ہزاروں انسان ہر سال بھوک کا شکار ہو جاتے تھے۔ اس ملک کو بہت سا غلّہ درآمد کرنا پڑتا تھا۔ ہر سال سیلاب اور قحط اس پابندی سے آتے تھے کہ انھیں چین کے لئے ایک فطری اور عام چیز سمجھا جانے لگا تھا۔ مگر ۱۹۴۹ء میں نئی حکومت کے قیام کے تین سال کے اندر ہی اندر وہاں کے حالات بالکل بدل گئے اور نئے چین میں غذا کی کمی کا کوئی سوال نہیں رہا۔ آج چین نہ صرف اپنی کافی بڑی آبادی کو غذا مہیا کر رہا ہے بلکہ دیگر ممالک کو بھی بھیجتا ہے۔ بالفرض ہم ۱۹۴۹ء کی پیداوار کو ۱۰۰ مان لیں تو اس مناسبت سے ۱۹۵۱ء میں پیداوار ۱۲۸ ہوگئی تھی اور ۱۹۵۲ء میں ۱۴۰۔ اس طرح تین سال میں پیداوار ۴۰ فی صدی بڑھی ۱۸۷۷ء کے بعد ۱۹۵۱ء میں یہ پہلا موقع تھا کہ چین کا توازن تجارت ملک کے حق میں رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چین میں غلہ کی درآمد کی بجائے برآمد ہونے لگی۔ وہاں کی اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۴۹ء میں ایک ہزار لاکھ مُو (مُو ۱/۶ ایکڑ کی برابر ہوتا ہے) زمین سیلاب کے ہاتھوں تباہ ہوگئی تھی مگر ۱۹۵۲ء میں کل ۸۰ لاکھ مُو ہی زمین تباہ ہوسکی اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۵۰ء و ۱۹۵۱ء تقریباً ۴۲۰۰۰ کیلومیٹر لمبے ڈام تعمیر کئے گئے۔ چین کے قونصل جنرل یاؤ چنگ کیانگ نے پچھلے سال کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ہوائی اور چنگ کیانگ دریاؤں کے پروجیکٹس (projects) کی تکمیل نہایت شاندار کارنامہ ہے۔" انھوں نے بتایا کہ اب تک کل ارضی کام ۱۷ لاکھ کیوبک میٹرس ہوا ہے اور یہ کام دس نہر پناما اور ۲۰ نہر سویز بنانے کے سلسلے میں جس قدر ارضی کام کی ضرورت ہے اس کے برابر ہے۔ قابل غور ہے یہ رفتار جس سے پرانے غیر ترقی یافتہ چین میں تعمیری کام ہو سکتے ہیں اور غذا کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ امریکہ میں پچھلے ۲۰ برس کے اندر غلہ کی پیداوار ۳۷ فی صدی فی ایکڑ

بڑھ گئی ہے اور ایک فارم کا مزدور ۴۰ فی صدی زائد پیداوار کر سکتا ہے۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ۱۹۵۲ء میں غلّہ کا ذخیرہ ۲۵۴۰۰ لاکھ بشلس (Bushels) تھا۔ ۱۹۵۳ء میں ۵۵۰۰ لاکھ تھا اور ۱۹۵۴ء میں ۶۴۰۰ لاکھ ہو جائے گا مگر ریاستہائے متحدہ کے محکمہ زراعت نے اعلان کیا ہے کہ امریکہ میں گیہوں کی پیداوار "مانگ" سے زائد ہو گئی ہے (over Productions) لہٰذا کاشتکاروں سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ ۱۹۵۳ء میں ۵۵ لاکھ ایکڑ گیہوں کی زمین کم کر دیں۔ ہمارے لئے ضرورت کے باوجود اس چیز میں (over Production) ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

ان حالات سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ریاستہائے متحدہ میں بھی پیداوار بہت بڑھ گئی ہے۔ دراصل اس میں نئی نئی مشینوں اور ترقی یافتہ سائنس کی مدد شامل حال ہے۔ مثلاً نئے نئے آلاتِ زراعت کا استعمال نئے نئے قسم کے پودوں کی کاشت (جیسے کہ مخلوط اناج) اچھے قسم کے کھاد کا استعمال وغیرہ وغیرہ۔ مخلوط اناج نے پیداوار بڑھانے میں کس طرح مدد کی اس کے بارے میں ٹی۔ جنکنس T. Jenkins نے کہا ہے کہ "پہلی جنگ عظیم کے تین سال کے اندر اندر ۸ بلین (Billion) بشلس غلّہ ۳۱۱۰ لاکھ ایکڑ زمین میں پیدا کیا تھا مگر دوسری جنگ عظیم میں تین سال کے اندر ہم نے ۱۰ بلین بشلس غلہ محض ۲۸۱۰ لاکھ ایکڑ زمین میں پیدا کیا۔"

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایٹمی قوت بھی زراعت میں استعمال کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ریاستہائے متحدہ اٹامک انرجی کمیشن کے صدر ڈیوڈ۔ ای لیلینتھل David E. Lilienthal نے ۱۹۴۹ میں کہا تھا "دو سال سے سائنس داں زراعت کے لئے بھی ایٹمی طاقت کے تحقیقاتی آلات استعمال کر رہے ہیں انھوں نے یہ بھی بتایا کہ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ زراعت کے میدان میں ایٹمی قوت کا استعمال کس طرح کیا جا سکتا ہے مختلف تحقیقاتی کام جاری ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں سائنسدانوں کی

ایک میٹنگ میں اس پر بحث کرتے ہوئے کہ ایٹمی قوت کا استعمال زرعی پیداوار کے لئے کس طرح کارآمد ہو سکتا ہے انھوں نے کہا "اب ہم اس قابل ہیں کہ دنیا کے سامنے مادہ نمو اور امراض کی کنجی کھول کر رکھ دیں۔ ایٹمی سائنس کا ایک شاندار کارنامہ یہ بھی ہے کہ وہ نسل انسانی کے سامنے ایک نہایت مشکل مسئلہ کا حل پیش کرتی ہے اور وہ یہ کہ غذائی پیداوار کو کس طرح دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ ساتھ چلایا جائے"۔ انھوں نے یہ سب ٹھیک کیا مگر جب تک over Production کا مسئلہ حل نہ ہو گا موجودہ سائنس سے صحیح اور پوری مدد نہ لی جا سکے گی۔

کہا جاتا ہے کہ برطانیہ نے پچھلی جنگ عظیم سے پہلے کی پیداوار کے مقابلہ میں ۸۰ فی صدی زائد پیداوار کر لی۔ ان کا دعوی کہ ملک میں اپنی پوری آبادی کے پیٹ بھرنے کے لئے کافی غذا ہے۔ حال ہی میں اگریکلچرل ریسرچ کاؤنسل نے زراعت پر تحقیقات شروع کر دی ہیں۔ بیج کو نامٹرنٹ (Nutriment) کے حل میں بھگو کر بونے سے بہت اچھی پیداوار ہوتی ہے۔ oats پر بھی Potassium Phosphate کے حل میں بھگو کر تجربہ کیا گیا ہے اور دیکھا گیا ہے کہ سادے بیج بوئے گئے تو فی ایکڑ ۱۷ بشل۔ پانی میں جذب کئے ہوئے فی ایکڑ ۲۰ بشل اور Phosphate میں جذب کئے ۲۵ بشل پیدا ہوئے۔

ہیری فرگوسن کا خیال ہے کہ کھیتی کے جانوروں کی بجائے اگر مشین استعمال ہوں تو ۵۰ لاکھ ایکڑ زمین میں جو جانوروں کے لئے کاشت ہوتی ہے وہاں انسانوں کے لئے ہونے لگے اور ان کے خیال میں زراعت کو مشینی بنا دینے سے برطانیہ غذا کے سلسلہ میں درآمد سے آزاد ہو سکتا ہے۔

برطانیہ کے ایٹمی سائنسداں ڈاکٹر جان ایچ فرملین (Dr. John H. Fremlin) نے Atomic Scientist News میں لکھا ہے کہ مشرقی ممالک میں

آبادی غذائی پیداوار سے زائد بڑھ رہی ہے لیکن روس اور مغربی ممالک میں غذائی پیداوار کی رفتار آبادی کی افزائش سے تیز ہے۔ انھوں نے اس پر زور دیا ہے کہ "غیر ترقی یافتہ ممالک مثلاً ہندوستان و پاکستان ایٹمی طاقت کا استعمال کریں"۔ انھوں نے کہا کہ "برطانیہ اور دوسرے مغربی ممالک میں معلومات کا اس قدر ذخیرہ ہے کہ یہ مسئلہ بہ آسانی حل ہو سکتا ہے تعلیم یافتہ اور صنعتی ہندوستان کو موجودہ آبادی سے دگنی آبادی کو بھی غذا مہیا کرنے میں کوئی مشکل نہیں پیش آئے گی۔

البانیہ اگرچہ بہت چھوٹا ملک ہے مگر وہاں بھی ایک پنج سالہ پلان (۵۵-۱۹۵۱) بنا ہے جس کے مطابق امید کی جاتی ہے کہ قومی دولت سو فیصدی بڑھ جائے گی۔ ۱۹۵۰ میں آبپاشی کی جو زمین ۳۹۰۰۰ ہکٹیرس تھی پانچ سال کے اختتام پر ۸۳۰۰۰ ہکٹیرس ہو جائے گی۔ اناج کی پیداوار ۵۰ فی صدی بڑھ جائے گی اور گنے کی پیداوار ۱۶ گنا زائد ہو جائے گی اس سے صاف ظاہر ہے کہ ایک چھوٹا ملک بھی غذا کا مسئلہ حل کر سکتا ہے۔

ہندوستان میں غذا کی کمی چالیس یا پچاس لاکھ ٹن ہے اور خیال ہے کہ اگر غذائی پیداوار دس فی صدی تک بڑھ جائے تو ہندوستان اپنی کل آبادی کو غذا مہیا کر سکتا ہے عام خیال ہے کہ یہ آسانی سے حل ہو سکتا ہے اور اس کے حصول کی کوششیں جاری ہیں۔ حال ہی میں صوبہ کی فصلوں کا ایک مقابلہ اتر پردیش میں ہوا تھا۔ اس میں گیہوں کی پیداوار ۵۴ من فی ایکڑ۔ چاول کی پیداوار ۸۳ من فی ایکڑ اور آلو کی پیداوار ۷۳۶ من فی ایکڑ ہوئی۔ حالانکہ گیہوں کی پیداوار یہاں اوسطاً ۸ من فی ایکڑ ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ موجودہ حالت میں بھی ۷ گنا پیداوار زیادہ ہونی ممکن ہے۔ یو۔ پی میں آبپاشی کے ذرائع بڑھائے جا رہے ہیں اور زیادہ سے زیادہ زمین میں کاشت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یو۔ پی میں تو اس کی بھی کوشش کی جا رہی ہے کہ چند الیف۔ اے۔ او (F.A.O) کے ماہرین کی مدد سے اوسر زمین بھی زیر کاشت کر لی جائے۔ تحقیقات

سے پتہ چلا ہے کہ بہتر بیج استعمال کرنے سے پیداوار ۱۲ فی صدی بڑھ سکتی ہے اور اگر عمدہ کھاد بھی استعمال کی جائے تو ۲۵ فی صدی بڑھ سکتی ہے۔ زراعت کے ماہرین کا خیال ہے کہ اگر ہندوستان کے آدھے کھیتوں پر بھی نئے آلات کا استعمال کیا جائے تو ۱۰ فی صدی غذا کی جو کمی ہے وہ بہ آسانی پوری ہو جائے۔

غلہ کے علاوہ انسان نے غذا کے دوسرے ذریعوں میں بھی کافی ترقی کی ہے۔ سویڈن کی اطلاع ہے کہ وہاں دو سائنسداں عام خرگوشوں سے ڈھائی گنے بڑے پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ عام طور سے خرگوش وہاں ۵ پونڈ کے ہوتے ہیں مگر سائنس کی مدد سے پیدا کئے ہوئے یہ خرگوش ۱۲ پونڈ کے ہیں۔ اس تحقیق نے دیگر جانور مثلاً مچھلیاں، مرغیاں، بکریاں وغیرہ بھی عام سائز سے بڑے پیدا کرنے کے دروازے کھول دئے ہیں۔

ان تمام حقیقتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کافی غذا نہ صرف اپنے لئے پیدا کرنے کے قابل ہے بلکہ وہ ضرورت سے کہیں زیادہ پیدا کر سکتا ہے۔ اگر کسی ملک میں غذا کی کمی ہے تو اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ وہاں کی پیداوار اپنی حد کو پہنچ چکی ہے اور آگے کوئی گنجائش نہیں رہی بلکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں موجودہ ترقی یافتہ سائنس سے کام نہیں لیا جا رہا ہے۔ قرنوں سے انسان نیچر پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور جتنا وقت گزرتا گیا وہ نیچر پر زیادہ سے زیادہ حاوی ہوتا گیا۔ انتہائی قنوطیت پسند لوگ ہی یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان میں نیچر پر مزید قابو پانے کی صلاحیت نہیں۔ انسان دوسرے جانوروں سے اس معنی میں مختلف ہے کہ وہ بجائے دنیا کے مطابق ڈھل جانے کے دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ انسان میں نیچر کو اپنے آگے جھکا لینے کی طاقت ہے جس کے لئے اس کے پاس سب سے بڑا حربہ علم سائنس ہے۔ لہٰذا جب تک ہم ان حقیقتوں سے انکار ہی نہ کریں اس وقت تک ہم مالتھوز کے پیروؤں سے متفق نہیں ہو سکتے۔

حقیقتاً اصل مسئلہ صحیح پیداوار کا نہیں بلکہ [illegible] consumption کا ہے۔ ہم روز سنتے ہیں کہ امریکہ میں، کیوبا میں شکر اور ہندوستان میں چائے مانگ سے زائد پیدا ہو گئی حالانکہ دوسری طرف دنیا انہی چیزوں کی بھوکی ہے۔ اگر "آزاد دنیا" اس مسئلہ کو حل کرے تو پھر پیداوار بے حد و حساب ہوگی اور جب تک یہ نیت

[illegible] (مترجم)

ادبیات

نالۂ شب گیر

از

(جناب الم مظفرنگری)

ہیچ تاثیرے ندارد نالۂ شامم ہنوز
از مئے پالائے غم باشد تہی جامم ہنوز

طور خاکستر شد و موسیٰ عمران درگذشت
لن ترانی گوئے موجود است بر بامم ہنوز

رازدار من نمی گردد جہاں معذور دار
در رموزِ عشق پنہاں است پیغامم ہنوز

نیست آساں در بہارِ گل بہ پرواز آمدن
ہم نوا دام دگر باشد تہِ دامم ہنوز

بارشِ تیر حوادث بر دل و جان من است
می زند سنگِ جفا گردوں بر اندامم ہنوز

تفرقہ پردازیٔ گردوں قیامت آفرید
رستخیزش می برد ہر لحظہ آرامم ہنوز

نالۂ شب گیر من تا لب نمی آید الم
تا چہ خواہد شد نمی دانم سرانجامم ہنوز

غزل

از

(جناب الم مظفرنگری)

کئے خاکِ پرِ پروانہ نے پھر بال و پر پیدا
فضائے بزم کے ذروں میں ہے رقصِ شرر پیدا

نگاہِ ناز جب کرتی ہے کوئی نیشتر پیدا
ذرا سینہ بھی کر لیتا ہے اک تازہ جگر پیدا

جو خود ہی خالقِ صد جلوہ ہو ہنگام نظارہ
تو کر ہر اک نظر میں اپنی وہ تابِ نظر پیدا

تمہیں کس طرح سمجھا دوں شبِ عشرت کے دیوانو!
ہر اک لمحے سے شامِ غم کے ہوتی ہے سحر پیدا

یہ ثابت ہو رہا ہے جنبشِ پیہم سے ذروں کی
کرے گی خاکِ ویرانہ کسی دن بام و در پیدا

بھٹکتا ہی رہے گا اپنی منزل پر نہ پہنچے گا
نہیں ہیں رہروی سے جس کی آدابِ سفر پیدا

بہارِ عشق پرور ہے شگفتہ خاطری اس کی
گلوں کی طرح کر لیتا ہے جو چاکِ جگر پیدا

نئے سر سے نظامِ بزمِ وحشت پھر بدل جائے
اگر ہو جائے صحرا میں کوئی شوریدہ سر پیدا

نہیں بیکار رہتے انتظارِ موجِ طوفاں میں
شناور آپ کر لیتے ہیں ساحل سے بھنور پیدا

ڈبو دیتا ہوں ساحل کو کبھی امواجِ طوفاں میں
کبھی کرتا ہوں خود ساحل بھنور میں ڈوب کر پیدا

ہزاروں منزلیں کرتا ہے طے پانی کا اک قطرہ
صدف میں تب کہیں ہوتا ہے تابندہ گہر پیدا

وہ ناکام تمنا رہ نہیں سکتا محبت میں
نظر ہی سے جو کر لیتا ہے مقصودِ نظر پیدا

سرشتِ نرم کو کیا واسطہ جبر و تشدد سے
رگِ گل کر نہیں سکتی مزاجِ نیشتر پیدا

حقیقت شمع و پروانہ کی کھل جائے گی دم بھر میں
الم ہو نے تو دے محفل میں آثارِ سحر پیدا

تبصرے

نصرۃ القرآن

از مولانا عبد الحمید خاں صاحب ارشد - طباعت وکتابت بہتر۔ ضخامت ۳۳۶ صفحات قیمت مجلد صہ پانچ روپیہ

پتہ:- عبد المجید صاحب صدیقی - یونائیٹڈ مجید موٹر کمپنی - بندر روڈ کراچی ۲ پاکستان میں آج کل فتنۂ انکارِ حدیث کا بہت زور ہے۔ غالباً وہاں کی عام فضا جو اونچے طبقوں میں پائی جاتی ہے اسے محسوس کر کے اس فتنہ کے علمبرداروں نے اپنی کوششیں تیز سے تیز تر کر دی ہیں ادھر حجیتِ حدیث اور اس سے متعلقہ مباحث پر متعدد بلند پایہ کتابیں بیسیوں قابل قدر مقالات و مضامین ہندو پاک میں شایع ہو چکے ہیں اور جہاں تک اس مسئلہ پر علمی حیثیت سے گفتگو کا تعلق ہے غالباً اس کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر مذکورۂ بالا کتابوں اور مقالات میں سیر حاصل بحث نہ کی گئی ہو لیکن جن لوگوں نے بہر حال حجیتِ حدیث سے انکار کی قسم کھالی ہے انھیں ان سے کیا غرض! انھیں جو کام کرنا ہے وہ کرتے رہیں گے اس بنا پر ضرورت ہے کہ ادھر سے بھی خاموشی اختیار نہ کی جائے اور مختلف عنوانات کے ماتحت کتابیں اور مضامین برابر شایع ہوتے رہیں چنانچہ زیرِ تبصرہ کتاب بھی اس سلسلہ کی ایک مستحسن کوشش ہے اور فاضل مصنف نے حدیث کی اہمیت وضرورت، اس کی حجیت اور تشریعی حیثیت - وغیرہ مباحث پر کلام کرنے کے بعد منکرینِ حدیث کی طرف سے جو اعتراضات کیئے جاتے ہیں ان کے جواب دیئے ہیں اور انکارِ حدیث کی بنا پر ان لوگوں نے جو بعض نئے نئے مسئلے تراش لئے ہیں مثلاً قربانی کا انکار وغیرہ ان کی اصل حقیقت واضح کی ہے، غرض کہ کتاب اپنے مقصد میں کامیاب ہے جن حضرات کو فتنۂ انکار حدیث سے سابقہ پڑا ہو ان کو اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔!!

قصص النبیین از مولانا ابو الحسن علی الندوی جز اول صفحات ۶۳ قیمت ۱۰ / جزو دوم صفحات ۶۰ قیمت ۱۰ / تقطیع متوسط ٹائپ جلی اور روشن پتہ:- ندوۃ العلمار لکھنؤ۔

ندوۃ العلمار لکھنؤ کے چند مخلص علما، نے عربی تعلیم کو زیادہ سے زیادہ سہل اور مفید بنانے کے لئے ایک سلسلہ تصنیفات و تالیفات شروع کیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس میں جیساکہ نام سے ظاہر ہے فاضل مرتب نے بچوں کے استعدادِ ذہنی کے مطابق قرآن مجید کے قصص انبیار کو بیان کیا ہے قصص میں جگہ جگہ قرآن مجید کی متعلقہ آیتیں نقل کی گئی ہیں ان کے علاوہ جو عبارتیں مصنف نے خود لکھی ہیں چونکہ وہ عربی زبان کے نامور ادیب ہیں اس لئے اہل زبان کی سی حلاوت اور سلاست ان میں بھی پائی جاتی ہے اس میں شک نہیں کہ ادبی، اخلاقی اور لسانی حیثیت سے یہ دونوں حصے اس قابل ہیں کہ مدارس عربیہ اور اسکولوں کے عربی نصاب میں انھیں شامل کیا جائے۔

معلم الانشار حصہ اوّل از مولانا عبد الماجد ندوی تقطیع خورد ضخامت ۱۸۰ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ پتہ:- دار العلوم ندوۃ العلمار لکھنؤ۔

یہ کتاب بھی اسی اصلاحِ نصاب و تسہیلِ زبان عربی کے سلسلہ کی ایک کوشش ہے جس میں فاضل مرتب نے جو خود ندوۃ العلمار میں ادب کے استاذ ہیں اور بچوں کو عربی زبان پڑھانے کا کافی تجربہ رکھتے ہیں) پچیس اسباق میں صرف و نحو کے عام متداول اور کثیر الاستعمال قواعد بیان کئے اور پھر عربی سے اردو اور اردو سے عربی میں ترجمہ کے ذریعہ ان کی مشق و تمرین کرائی ہے۔ مصنف کا طریقہ تفہیم بالکل جدید اور بچوں کی نفسیات کے مطابق ہے یعنی وہ پہلے چند جملے بیان کر کے بچہ کے دماغ میں استفہام و استفسار پیدا کر دیتے

ہیں اور پھر اس کا جواب دینے کے سلسلے میں اصل قاعدہ بیان کر جاتے ہیں اور اس کے بعد اصل قاعدہ مستقلاً لکھتے ہیں پھر ترجمہ کے ذریعہ اس کی کافی تمرین کراتے ہیں زبان بہت صاف۔ واضح اور عام فہم وسلیس ہے البتہ اگر مصنف اس بات کا اور اہتمام کرتے کہ اردو کے جملوں میں جو نئے الفاظ آنے والے ہیں ان کے لئے عربی کے الفاظ عربی کے جملوں میں لائے جاتے تو یہ اور زیادہ مفید ہوتا تاہم یہ کتاب اس لائق ہے کہ عربی کی تعلیم کے لئے مدارس اور اسکول اس سے فائدہ حاصل کریں۔

تمرین النحو از مولوی محمد مصطفےٰ صاحب ندوی تقطیع خورد ضخامت ۱۳۶ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ پتہ: دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

اس میں عربی کی جدید مصری کتاب النحو الواضح کے طرز پر ہندوستانی بچوں کے لئے نحو کے ابتدائی قواعد بیان کئے گئے ہیں مگر مشقی اور تمرینی انداز میں ہم نے خود ایک بچہ پر اس کا تجربہ کرکے دیکھا ہے اور مفید پایا ہے امید ہے کہ مدارس عربیہ اور اسکول وغیرہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

القرأۃ الجدیدہ از مولانا ابو الاثر عبد السلام النعمانی تقطیع خورد ضخامت ۲۴ صفحات قیمت ۴ر مکتبہ ندوۃ المعارف بھی باغ بنارس

اس رسالہ میں ۳۴ اسباق ہیں شروع کے بارہ اسباق حروف تہجی اور الفاظ کی ترکیب سے متعلق ہیں اس کے بعد جو اسباق ہیں ان میں مختلف عنوانات کے ماتحت ان سے متعلقہ الفاظ مع ان کے معانی کے یک جا جمع کر دیئے ہیں عنوانات وہی ہیں جن کی ہر بچہ کو اپنے خاص ماحول میں زیادہ ضرورت پیش آتی ہے اس بنا پر جدید قاعدۂ تعلیم جس کو ڈائرکٹ میتھڈ کہتے ہیں اُس کے اعتبار سے عربی زبان کی ابتدائی تعلیم کے وقت یہ رسالہ بھی سامنے رہے تو مفید ہوگا!

سنہ ۱۹۵۱ء کا شعری ادب تقطیع خورد ضخامت ۱۱۲ صفحات کتابت وطباعت

عمدہ قیمت عہ ، پتہ :- قصر اردو - اردو بازار - دہلی -

۱۹۵۱ء میں اردو زبان میں جو نظمیں - غزلیں شائع ہوئی ہیں - فکر تونسوی - نریش کمار شاد اور ظفر ادیب صاحبان نے ان کا انتخاب اپنے ذوق کے مطابق کر کے شائع کیا ہے اختلافِ ذوق کے باعث جو چیز ایک کو پسند ہو ضروری نہیں کہ وہ دوسروں کو بھی پسند ہو، چنانچہ اس انتخاب میں بھی اس طرح کے اختلاف کی بڑی گنجائش ہے مگر بعض نظمیں تو ایسی ہیں جن کا انتخاب معلوم ہوتا ہے کسی ادبی معیار سے نہیں کیا گیا - بلکہ شاعر کی صرف شہرت یا اس کے ساتھ ذاتی تعلق کو ہی جوازِ انتخاب کی دلیل سمجھ لیا گیا ہے مثلاً جوش کی نظم "ماتم آزادی" ، سردار جعفری کی "اودھ کی خاک حسین" اردو ادب کا فخر نہیں بلکہ اس کے لئے ننگ و عار ہیں، ان کے علاوہ جو اور قومی - بین الاقوامی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں ان میں اکثر و بیشتر ایسی ہیں جو واقعی لائق انتخاب تھیں، اس حیثیت سے یہ مختصر سا مجموعہ حسین بھی ہے اور دل کش بھی !!!

سہ روزہ دعوت دہلی

مدیر اصغر علی صاحب عابدی ، سالانہ بدل اشتراک بارہ روپے
پتہ اخبار دعوت ، کشن گنج دہلی ع۶

"دعوت" پہلے " الانصاف" کے نام سے الہ آباد سے نکلتا تھا ، اب دہلی سے شائع ہو رہا ہے ، یوں تو جماعتِ اسلامی کے اخباروں اور رسالوں میں اخبار نویسی اور صحیفہ نگاری کا ایک خاص سلیقہ نمایاں ہوتا ہی ہے "دعوت" خاص طور پر اس جماعت کا متین اور باوقار ترجمان ہے اس میں اپنی جماعت کے خاص مقاصد کی تبلیغ و اشاعت کے علاوہ دوسری اخباری معلومات بھی کچھ کم نہیں ہوتیں ، ایڈیٹوریل ، شذرات ، مقالات وغیرہ دل پسند ، مدلل اور سنجیدہ ہوتے ہیں ، سہ روزہ اخبارات میں "دعوت" بہت سی عمدہ خصوصیتوں کا حامل ہے ، جماعتِ اسلامی کے مخصوص نظریوں سے قطع نظر یہ اخبار تمام مسلمانوں بلکہ عام اہل ملک کے پڑھنے کے لائق ہے ، ہم "دعوت" کی زندگی اور ترقی کے خواہاں ہیں کہ عریانی اور فحاشی کی ان اندھیریوں میں ایسے اجالے کی ضرورت قدرتی ہے - (ع)

تذکرہ - کراچی مدیر مولوی بشیر محمد صاحب، صفحات ۴۸، چندہ سالانہ للعہ، فی پرچہ ۶ر، پتہ دفتر رسالہ تذکرہ آرام باغ کراچی

دہلی مرحوم کے سابق مشہور و معروف تاجر کتب مولوی نور محمد صاحب مرحوم کے یہ لایق بھتیجے اور داماد نہ صرف کاروبار میں اپنے بزرگوں کے سچے جانشین ثابت ہوئے بلکہ انھوں نے دینی اور اصلاحی زندگی میں بھی قدم رکھا جس کا ثبوت "ماہنامہ تذکرہ" کراچی ہے۔

"تذکرہ" عام مسلمانوں کے لئے ایک اچھا دینی رسالہ ہے جو ظاہری اور معنوی دونوں خوبیوں سے آراستہ ہے، رسالے میں متعدد عنوانات مستقل ہوتے ہیں جن میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین کا ہلکا پھلکا اور نکھرا ہوا حصہ شایع کیا جاتا ہے "تفسیر قرآن" "جواہر حدیث" "تاریخی گوشے" "مشاہیر صحابہ" وغیرہ عنوانوں میں جو چھوٹے چھوٹے مضمون شایع کئے جاتے ہیں، وہ عورتوں، کم پڑھے لکھے مردوں اور بچوں کے پڑھنے کے لایق ہوتے ہیں، افسانے جو شریکِ اشاعت کئے جاتے ہیں ان میں دل چسپی کے ساتھ اصلاحی شان بھی ہوتی ہے، چنانچہ "سنجہ" جس کی چودھویں قسط فروری کے پرچے میں شائع ہوئی ہے ایک سبق آموز افسانہ ہے اور بچیوں کے پڑھنے کے لایق ہے۔(ع)

جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات

"بین الاقوامی سیاسی معلومات" میں سیاسیات میں استعمال ہونے والی تمام اصطلاحوں، قوموں کے درمیان سیاسی معاہدوں، بین الاقوامی شخصیتوں اور تمام قوموں اور ملکوں کے سیاسی اور جغرافیائی حالات کو نہایت سہل اور دلچسپ انداز میں ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے، یہ کتاب اسکولوں، لائبریریوں اور اخباروں کے دفتروں میں رہنے کے لایق ہے، جدید ایڈیشن جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد للعہ، آٹھ روپے علاوہ محصول ڈاک۔